۷۸۶

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما
(حافظؒ)

امیر مینائیؒ

موسوم بہ اسم تاریخی

سیرت امیر احمد امیر مینائی
۱۳۴۶ھ

یعنی

خاتم الشعرا حضرت امیر مینائیؒ کے حالات زندگی وغیرہ اور اُن کے کمالات شاعری پر تبصرہ

مؤلفہ

جناب منشی شاہ محمد ممتاز علی صاحب آہؔ مرحوم

از شد تلامذۂ حضرت امیر مینائیؒ

حسب فرمائش شاہ محمد عبد الباری صاحب عشقؔ

باہتمام محمد اسمٰعیل صدیقی

ادبی پریس لکھنؤ میں چھپی

بار اول ایک ہزار جلد — قیمت ..... ۶ عہ مجلد ۶ عہ غیر مجلد — جملہ حقوق محفوظ

سنہ ۱۹۲۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعارف

حضرت امیر مینائیؒ ہمارے ملک کے اکابر شعرا میں تھے اور اپنی خاندانی اور علمی حیثیت سے بھی ممتاز تھے اس لئے ان کے سوانح حیات شعر و ادب کے ساتھ شرفائے اودھ کی تاریخ کا بھی ایک جزو ہے۔

مؤلف کتاب شاہ محمد ممتاز علی آہ مرحوم اودھ کے مشہور قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ کے ایک قدیم اور تاریخی خانوادۂ تصوف سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ حضرت مخدوم بہار الحق امیٹھویؒ المتوفی ۹۲۲ھ کی اولاد امجاد میں تھے۔ یہ خاندان فقر و تصوف کے ساتھ علم و عمل کی دولت سے بھی سرفراز رہا۔ اورنگ زیب کے استاد ملا احمد المعروف بہ ملا جیون صاحبِ نورالانوار اور مشہور مجاہد مولوی امیر علی صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ اسی خاندان کے ہمر وماہ تھے۔

امیر مرحوم کی گو ایک سے زیادہ سوانح عمریاں لکھی جا چکی ہیں لیکن اس سوانح عمری کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مؤلف تلمذ کے ساتھ امیر مینائی کے عزیز بھی تھے اور ایک عرصے تک ان کے ساتھ رہ چکے تھے اور اس کی تالیف میں انھوں نے امیر مرحوم کے صاحبزادوں منشی محمد احمد صاحب صریر اور منشی ممتاز احمد صاحب آرزو سے بھی مدد لی ہے اس لئے یہ حالات گویا چشم دید ہیں اور دوسری سوانح عمریوں کے مقابلے میں زیادہ قابل وثوق اور لائق اعتماد ہیں۔

یہ کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصے میں حالات و سوانح ہیں اور دوسرے میں کلام پر تبصرہ اور اس کا انتخاب ہے۔

لکھنؤ امیرؒ کا وطن تھا یہیں ان کی نشو و نما ہوئی اور غدر سے پہلے وہ سرکار اودھ سے

اور اس کے بعد دربار رام پور سے متوسل رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مشرقی تہذیب اپنی آخری جھلک دکھا رہی تھی اس لئے سوانح کے ضمن میں سلطان عالم کے لکھنؤ، اس کی بزم آرائیوں، ادبی محفلوں، شعراء، داد بار، آداب و معاشرت، دربار رام پور کی علم نوازیوں، وہاں کی بزم ادب اور علمی صحبتوں کے حالات بھی آ گئے ہیں جس سے ہماری اجڑی ہوئی محفل اور ہماری بزم دوشین کا مٹا ہوا نقشہ نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے، ان حالات کے ساتھ شعر و ادب سے متعلق بہت سے فوائد و نکات بھی ملتے ہیں۔

دوسرے حصے میں امیرؒ کی شاعری پر تبصرہ، اس پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں اس کے جوابات، معاصر شعراء کے کلام سے موازنہ، مختلف دواوین کا انتخاب، مختلف اصناف سخن کے نمونے ہیں جس سے شاعری میں امیرؒ کی جامعیت اور ان کے کمال کا اندازہ ہوتا ہے۔ آخر میں ان کی نثر پر مختصر تبصرہ اور مؤلف کے نام ان کے چند خطوط ہیں۔

مؤلف اساتذہ کے دور کی یادگار اور امیرؒ کے فیض یافتہ اور ان کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے، اس لئے شعراء کے کلام اور نکات شاعری پر ان کی نظر وسیع تھی جس کا تبصرے سے اندازہ ہوتا ہے۔ یہ تبصرہ بڑی حد تک استاد پرستی کے غلو سے خالی ہے، ادب اردو میں اس سوانح عمری کی اشاعت سے ایک مفید اور قابل قدر کتاب کا اضافہ ہوا۔ امید ہے کہ صاحب ذوق حلقہ میں اس کی پوری قدر دانی ہوگی۔

(مولانا) سید سلیمان ندوی

دار المصنفین اعظم گڑھ
۲۰ ربیع الثانی سنہ ۱۳۶۰ھ

پیش نامہ

از پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم ۔ اے
صدر شعبۂ فارسی و اُردو لکھنؤ یونیورسٹی

منشی امیر احمد صاحب آمیر مینائی اپنے زمانے میں لکھنؤ کے شاعروں میں سب سے زیادہ مشہور تھے۔ اُن کے علم و فضل، ان کے اخلاق و زہد، ان کے کثیر تصنیفات نے ان کی عزت اور شہرت میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ اودھ کے آخری تاجدار حضرت واجد علی شاہ ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ جب اودھ کی سلطنت ختم ہوگئی تو نواب یوسف علی خاں صاحب فرمانروائے رام پور نے ان کو اپنے پاس بلایا اور بڑی عزت کے ساتھ رکھا۔ رام پور کا تعلق اس ریاست کے چار فرمانرواؤں کے عہد میں مسلسل قائم رہا اور حضرت آمیرؒ کی عزت برابر بڑھتی گئی۔ علیا مرتبت بیگم صاحبہ بھوپال اور اعلیٰ حضرت نظام دکن نے بھی بڑی خواہش سے ان کو طلب کیا اور شاہانہ عنایتوں سے سرفراز فرمایا۔

حضرت آمیر مینائیؒ کی تین سوانح عمریاں اب تک لکھی جا چکی ہیں۔ سب سے پہلے ایک مختصر سوانح عمری ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کے چھبیس ۲۶ برس بعد ۱۹۲۹ء میں دوسری سوانح عمری شائع ہوئی جس کے مؤلف آمیر مینائیؒ کے مشہور شاگرد اور اعلیٰ حضرت نظام دکن کے استاد حضرت جلیل ہیں۔ آمیرؒ کی تیسری سوانح عمری وہ ہے جس کا اس وقت آپ سے تعارف کیا جا رہا ہے۔ اس کو آمیرؒ کے ایک دوسرے عزیز اور باکمال شاگرد شاہ محمد ممتاز علی صاحب آہ مرحوم نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب حضرت جلیل کی کتاب سے کچھ دن پہلے تیار ہو چکی تھی مگر اس کی اشاعت کی نوبت اب آئی ہے یہ آمیر مینائیؒ کی سب سے زیادہ مفصل اور مکمل سوانح عمری ہے۔

سوانح عمری ادب کی ایک دلچسپ صنف ہے۔ اس کی دلچسپی اور بڑھ جاتی ہے جب سوانح نگار صاحب سوانح سے ذاتی طور پر کامل واقفیت رکھتا ہو اور جو واقعات وہ لکھ رہا ہے ان میں خود شریک رہا ہو یا وہ اس کی آنکھوں کے سامنے پیش آئے ہوں ایسے عینی شاہد کے چشم دید بیانات میں ایک عجیب دلکشی ہوتی ہے۔ یہی دلکشی پیش نظر کتاب کی خاص خصوصیت ہے۔

مصنف نے امیرؔ کے حالات زندگی کی تلاش اور ترتیب میں کافی محنت کی ہے اس کے ساتھ ہی اس ماحول کی تصویر بھی پیش کر دی ہے جس میں امیرؔ کی شاعری پیدا ہوئی اور چمکی۔ اس کتاب کے مطالعے سے اس زمانے کی ادبی اور شعری دلچسپیوں کا نقشہ سامنے آجاتا ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس وقت شاعری کا مفہوم کیا تھا، اچھا شعر کسے کہتے تھے، اور بڑا شاعر کون سمجھا جاتا تھا۔

ایک محقق ادب جو شاعری کی ارتقائی منزلوں پر غور کرنا چاہتا ہے وہ شاعری کے کسی دور کو نظر انداز نہیں کر سکتا اور کسی دور کے ممتاز ترین شعرا کو تحقیر کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ اسی اصول کی بنا پر اردو شعر و ادب کا مورخ اُس دور کو بھی کافی اہمیت دے گا جس میں امیرؔ، داغؔ، جلالؔ، بحرؔ، تسلیمؔ وغیرہ کا طوطی بول رہا تھا اور ایک زمانہ ان کے شاعرانہ کمال کا قائل نظر آتا تھا۔ اسی دور کی سچی اور دلکش تصویر زیر نظر کتاب میں پیش کی گئی ہے۔

ان شاعروں نے جس چیز کو شاعری سمجھا تھا اُس کو فروغ دینے کے لئے وہ بڑی بڑی محنتیں برداشت کرتے تھے۔ ایک ایک قافیے کو خوبصورتی کے ساتھ نظم کرنے میں اور ایک ایک مناسب لفظ کی تلاش میں بہت غور و فکر سے کام لیتے تھے۔ اُن کے نزدیک شاعری ایک مقدس فریضہ تھا جس کو انجام دینے میں وہ اپنی جان و روح لگا دیتے تھے اُن کی شاعری جیسی بھی تھی اپنے ماحول سے اتنی مطابقت رکھتی تھی کہ اُس زمانے کے خوش مذاق اُن کے کلام پر سر دھنتے تھے اور اُن کو بزم ادب میں بلند سے بلند مقام کا مستحق سمجھتے تھے۔ ان شاعروں کا اردو پر احسان ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے کے

مذاق کے موافق شعر کہہ کہکر اردو شاعری کو ہر دل عزیز اور عام پسند بنا دیا تھا۔ انہیں کی بدولت ایک مدت تک اردو شاعری کا چراغ روشن رہا۔ اب حالات وخیالات کی تبدیلی کے بعد ہم ان کے کلام کو پسند کریں یا نکریں، اردو شاعری کی تاریخ ان کو نظر انداز نہیں کرسکتی۔

اس زمانے میں شاعری کا مذاق اس قدر بدل گیا ہے کہ متعدد شاعر، جو اپنے اپنے زمانے میں کامل استاد مانے جاتے تھے اور اپنے کمال شاعری کی بدولت انتہائی عزت اور عظمت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، آج نہ صرف اُس عزت سے محروم ہیں بلکہ ان کا شمار ہی شاعروں میں نہیں کیا جاتا۔ ایسی حالت میں یہ کتاب اور بھی زیادہ مفید ہے کہ وہ اردو شاعری کے ایک گزشتہ دور کو سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ اس کے مطالعے سے وہ لوگ بھی مستفید اور محظوظ ہوسکتے ہیں جن کا مذاق امیری رنگ کی شاعری سے مانوس نہیں ہے۔

مصنف کتاب کے صاحبزادے شاہ محمد عبدالباری صاحب عشق ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس مفید اور قابل قدر کتاب کی اشاعت کا بار اٹھایا اور اس کو خوش سلیقگی سے چھپوا کر اردو کے سوانحی ذخیرے میں ایک گرانقدر اضافہ کیا۔

سید مسعود حسن رضوی
۲؍ جون ۱۹۴۱ء



مقدمہ

از

جناب مولانا مولوی عبداللہ عمادی صاحب۔ سابق رکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (دکن)

۱

شاعری حقیقت میں، خاصۂ عرب تھی، جہاں گئے اس دولت کو بھی ساتھ لے گئے، ایران قدیم میں اگر شعراء تھے بھی تو "کبت" اور "دوہرے" (دوراہہ) اور "پنج راہہ" (پنجرہ) کے طریقے پر تھے، عربوں نے یہ راہ بھی بے سپر کی، بنی امیہ کے ابتدائی عہد میں "ابن مفرغ" نے عباد ابن زیاد کے جور و ستم سے تنگ آ کے فارسی زبان میں جو ہجو کی تھی وہ اسی طریق کی تھی، طبری نے واقعہ بھی لکھا ہے اور پرانے طرز کی یہ فارسی نظم بھی ثبت کر دی ہے، "گاتھا" کی قدامت پر خواہ کتنا ہی زور دیا جائے مگر تاریخ کو کیا کیجیے جو فیصلہ کر چکی ہے کہ نویں صدی عیسوی سے پہلے کوئی اس کو جانتا بھی نہ تھا۔ یہ ہندوستان کے تارک الوطن فارسیوں کی تدوین ہے جو دسویں گیارھویں صدی میں "دساتیر" کی طرح، عجب نہیں، اسلوب عرب کے نقش و نگار پر مرتب ہوئی ہو، ایران اس سے آگاہ تک نہ تھا۔

بطور جملۂ معترضہ اسی ذیل میں "گیتا" پر بھی غور کر لیجیے جسے ہندوستان اپنی شاعری کا قدیم ترین نمونہ قرار دیتا ہے اور کرشن مہاراج سے اس کو منسوب کرتا ہے، شانِ نزول یہ ہے کہ کورو پانڈو کے لشکر حصول غلبہ کے لیے ایک دوسرے سے لڑا چاہتے ہیں، ارجن کو ان جاں بازوں کی سرفروشی پر تاسف ہوتا ہے کہ جنگ میں کتنی جانیں جائیں گی اور ہندوستان کا کتنا بڑا نقصان ہوگا، کرشن مہاراج ان کو فلسفۂ حرب و قتال کے دقائق سمجھاتے ہیں اور ان حکیمانہ حقائق کو بجائے نثر کے ایک بلند پایہ نظم میں ادا کرتے ہیں، موقع اتنا نازک محل اس قدر پرخطر، کہ اتنے ہی میں فریقین گتھ گئے اور

ایک جنگ عظیم کا جاں گداز سانحہ پیش آگیا، اس وقفۂ کوتاہ میں اور ایسی مکمل نظم، اسطرح کی فیلسوفانہ مثنوی، کہاں تک عقل میں آنے کی بات ہے ۔


۲

آداب عرب کی حکومت جب ایران میں راسخ ہو چکی ہے تو خلیفہ ہارون رشید عباسی کے عہد خلافت میں" ابن بعیث "نے، کہ خلافت کا حریف مقابل ایک مشہور عرب سردار تھا، فارسی میں شاعری کی، طبری اس کے تذکرے سے بھی خاموش نہیں یہ فارسی شاعری کا غالباً ابتدائی نمونہ ہو گا جس کو عباس مروزی اور یعقوب لیث صفار پر بہر حال تقدم حاصل ہے، سامانی اور غزنوی دور کے بیشتر سخنوران فارس بھی اصل میں عربی النسل تھے کہ انھیں کی سعی سے فارسی شاعری حد صفا تک پہنچی، ما بعد اسی ماقبل کی پیداوار ہے ۔

مادہ کی یہی صورت ہندوستان میں بھی تشکل پذیر ہوئی، یہاں آکے عربوں کی وہی نسل پہلے فارسی میں اور پھر ہندی و اُردو میں سخن سنج ہوئی، سلسلۂ حاضرہ اسی حلقے (اسکول) کی ایک کڑی ہے ۔

سابقین اولین کی اس داستان کا خاتمہ جناب امیرؒ پر ہوا علیہ التحیۃ والثناء جن کی سخنوری و سخن گستری پر حضرت محسنؔ[۱] نہایت جامع و روشن تبصرہ کر چکے ہیں:-

حقا کہ در مدینۂ علم امیرؔ
مداح پیمبرؐ و خدائے سخن است

یہ سچ ہے کہ "حماسہ" جو کلام عرب کا اصل جوہر تھا، کسی دوسری زبان میں منتقل ہو کے فارسی اور اس کے زیر اثر اردو کا انداز سخن بھی کچھ کا کچھ ہو گیا، وہی کلام جس کو ادعا تھا کہ

سارے عالم پر میں ہوں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

"مسدس" میں وہی "شعر و قصائد کا ناپاک دفتر" نظر آنے لگا جو "عفونت میں

---

[۱] مولانا محمد محسنؔ کاکوروی

سند اس سے بھی ہے بدتر" لیکن "ہر سخن جائے و ہر نکتہ مقامے دارد" یہاں اس بحث کی گنجائش نہیں، یہاں صرف جناب امیرؔ کا کلام اور کمال پیش نظر ہے اور چشم حقیقت نے اتنے ہی نظارہ پر قناعت کر لی ہے۔

ما بجائے کہ زجم ماند قناعت کردیم
بسکندر بد ہید انچہ زدارا ماند

۳

جناب امیرؔ ایک اردو ہی کے شاعر نہ تھے، عربی میں بھی دسترس رکھتے تھے، اور فارسی میں تو میں نے ان کا بہت سا کلام دیکھا ہے، نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اپنے تذکرے میں ممتاز شعراے فارسی کے صف بصف ان کو بٹھایا ہے اور کلام بھی نقل کیا ہے، ہندی کے ماہر اور سنسکرت سے آگاہ تھے، علوم و فنون میں کافی دستگاہ تھی، غرض کہ قدرۃ کاملہ نے وہ سب کچھ اُن میں ودیعت فرمایا تھا جن سے ایک شاعر اور اس کی شاعری کی کائنات وابستہ ہے اور جس سے اس کا کلام سحر و اعجاز کے پہلو بہ پہلو نظر آتا ہے، وہ اسی لکھنؤ کے پروردۂ تمدن تھے جسے میرزا غالبؔ دہلوی "ہندوستان کا بغداد" تسلیم کرتے ہیں، دربار شاہی اُن کا منزلت شناس تھا جس کے یہ معنی ہیں کہ آٹھ صدیوں کے عجمی تمدن کی شمع بازپسیں جو "درِ دولت" پر جھلملا رہی تھی اس کی روشنی میں اسلامی تہذیب کے تمام خط و خال پر اُن کی نظر تھی اور ہندو تہذیب بھی اُسی کے دوش بدوش چلتی دکھائی دے رہی تھی، مغرب اور مغربیت کی ہوا ان کو نہیں لگی تھی، اسی لیے اُن کی زبان پر مطلع سحر اور بیان پر مشرق انوار کا دھوکا ہوتا ہے۔

"نہج بلاغت" کے ایسے امیر القارضین[۱] کی سیرۃ مقدور عام سے برتر تھی، یہ برتری خاص مولوی شاہ محمد ممتاز علی صاحب آہؔ کے لیے دیوان ازل میں مقسوم ہو چکی تھی کہ ۱۳۴۶ھ میں اُنھوں نے اپنے نامور اُستاد کی سیرۃ مرتب فرمائی جس کا تاریخی نام

---

[۱] تریض: شاعری۔ قارض: شاعر۔ امیر القارضین: امیر الشعراء

"سیرت امیر احمد امیر مینائی" ہے، مولوی شاہ محمد عبد الباری صاحب نے کہ حضرت موّلف مرحوم کے خلف رشید ہیں اس ضخیم و بسیر حاصل مرغزار سخن کی طباعت و اشاعت سے اردو ادب پر احسان فرمایا ہے اور مجھے اس پر کچھ لکھنے کا حکم ملا ہے، بندۂ فرمان سے سرتابی کہاں ممکن، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جناب امیرؔ کا کلام اور کمال میرے تبصرہ سے کہیں بالاتر ہے، امتثال امر میں صرف ایک نکتہ پر میں کچھ عرض کروں گا۔

آج کل لکھنؤ کی شاعری اور زبان کو ہدف ملامت بنایا جارہا ہے، بے سبب اس پر منہ آتے ہیں اور بے ادب منہ کی کھاتے ہیں، شاعری کی نسبت میں کچھ نہیں کہتا کہ "صنم خانہ" اس کا شاہد صدق اور "مرآۃ الغیب" آئینہ دار ہے، مجھے اہل نظر کو صرف اس حقیقت سے روشناس کرانا ہے کہ اردو زبان کی خدمت میں لکھنؤ کا کیا اور کتنا حصہ ہے، نہ اس لئے کہ دہلی و لکھنؤ میں مقابلہ کی نوبت آئے، فتنۂ خفتہ بیدار ہوجائے یہ تو "اشدّ من القتل" ہے، جہاں اردو ہی کو پامال کررہے ہوں وہاں دہلی و لکھنؤ کی برتری کیا سود مند ہوسکتی ہے، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے عہد مبارک سے دلّی ہماری تہذیب کا گہوارۂ فضیلت ہے، ہم نے جو کچھ پایا ہے اسی خاک پاک سے پایا ہے، لیکن یہ مقدس احترام بھی عرض حقیقت سے مانع نہیں، امام شافعیؒ اپنے شیخ امام مالکؒ سے جہاں اختلاف کرتے فرماتے کہ "مجھ پر امام مالکؒ کا بڑا حق ہے لیکن امرِ حق کا جو حق ہے وہ اس سے بھی بڑا ہے (حقُّ مالكٍ علَیّ اکبرُ ولکن حقُّ الحقِ اکبرُ منہ)

۲

کچھ اوپر نصف صدی ہونے کو آتی ہے کہ لکھنؤ میں دلّی کی ایک غزل کے جابجا چرچے تھے جس کا مطلع یہ تھا:-

دلّی کے لوگ لکھنؤ والوں کے سامنے
چلتے ہیں جیسے شیر غزالوں کے سامنے

امیرؒ نے اس کے جواب میں دو غزلیں کہی تھیں جو مرآۃ الغیب (طبع نولکشور،

لکھنؤ ۱۳۱۱ھ ص ۴۸ و ۲۹۵) میں رونمائے عبرت ہیں، چند بیتیں ملاحظہ ہوں۔

دعویٰ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے ۔۔۔ اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے
پردہ انھیں سے ہے جنھیں تاب نظر نہیں ۔۔۔ آتے ہیں خود وہ دیکھنے والوں کے سامنے
کرتے ہیں عجز جن کو خدا نے دیا ہے ظرف ۔۔۔ شیشوں کے سر جھکے ہیں پیالوں کے سامنے
رکھتے ہیں جو ہنر انھیں آفت ہے کیا خطر ۔۔۔ ساحل ہے بحر پیرنے والوں کے سامنے
عاشق نے لاکھ جمع کیا دفتر حواس ۔۔۔ شیرازہ کھل گیا ترے بالوں کے سامنے
حال کلیم طور سنا ہوگا آپ نے ۔۔۔ کیسا حجاب دیکھنے والوں کے سامنے
تیروں کے پر کٹے ترے غمزوں کے روبرو ۔۔۔ تیغیں نہ چل سکیں تری چالوں کے سامنے

دلی اور لکھنؤ کی شاعری کا فرق انھیں دونوں مطلعوں سے ظاہر ہے، لیکن میرے پیش نظر یہ بحث نہیں ہے، میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ دلی کے مقابلے میں لکھنؤ نے زبان کی کیا خدمت کی، شاعری سخن شناسوں کے طبقہ تک محدود رہتی ہے، مگر زبان ایسی حدبندیوں سے بالاتر ہے، جو سخن شناس نہیں وہ بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

آج کل طبیعتیں اختصار پسند واقع ہوئی ہیں، صدیاں گزریں ایران کی مصلحت اندیشی نے صلاح دی تھی کہ:۔

حافظ اندیشہ کن از نازکی خاطر یار ۔۔۔ برواز درگہش ایں نالۂ و فریاد ببر

"نالہ و فریاد" سے تو مجھے سروکار نہیں، لیکن "خاطر نازک" پر بار ہونا میں بھی پسند نہیں کرتا، کہ:۔

انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

بے ادبی معاف، ادب کی چند کھلی کھلی باتیں سن لیجئے، پھر جی میں جو آئے فیصلہ کیجئے:۔

اک نہ اک بات نکل آئے گی سو باتوں میں

۵

"زمانے" میں عظمت کا جو مفہوم ہے دلی اس کو خاطر میں نہیں لاتی، میرزا غالب کی

مشہور غزل ہے:۔

بساط عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

اسی میں فرماتے ہیں:۔

نہ اتنا بُرشِ تیغ جفا پر ناز "فرماؤ"
مرے دریائے بے تابی میں ہے اک موج خوں وہ بھی

لکھنؤ کو "فرمانے" میں "فرمان" کی حکمرانی دکھائی دی، اس لیے دستور نافذ ہے کہ "کہنے" سے "کہو" پر "فرمانے" کو قیاس نہ کریں گے جب کہیں گے "فرمائیے" کہیں گے "فرماؤ" کبھی نہ کہیں گے۔

اسی ذیل میں "انداز چکیدن" کی ترکیب بھی نظری ہو گئی، کہ اضافت کے ساتھ بجائے حاصل مصدر کے خود مصدر کو لانا درست نہیں، اس کو دلّی نے بھی قبول کر لیا کہ میرزا غالب پر فارسیت غالب تھی ورنہ دلّی کی یہ زبان نہیں۔

ممکن ہے غالب کی زبان دلّی کی زبان نہ ہو، لیکن میر کی زبان کو آپ کیا کہیں گے جس پر انشا جابجا "دریائے لطافت" میں اعتراض کرتے ہیں، قلعۂ معلّی کی زبان پر کیا حرف لائیں گے جس کے تاجدار بہادر شاہ ظفر ارشاد فرماتے ہیں

ہم نے ہے اُس کی ادائے ناز پہچانی ہوئی
چال پہچانی ہوئی آواز پہچانی ہوئی

لکھنؤ اگر اس کا مصلح نہیں تو کون ہے؟

"آپ" اور "تم" کے فرق سے بھی دلّی بے پروا تھی۔

ایک صحبت میں حکیم مومن خاں کے روبرو مولانا اسماعیل شہید پر نکتہ چینی ہو رہی تھی کہ اتنے میں مولانا خود آ گئے۔ مومن نے فی البدیہہ مطلع سنایا۔

اے ناصحو آ ہی گیا وہ فتنۂ ایام لو
ہم کو تو کہتے تھے بہت اب خود کلیجا تھام لو

غزل بعد کو پوری ہوئی جس کا مقطع ہے ۔

مومن "تم" اور عشق بتاں اے بندہ پرور خیر ہے
یہ ذکر اور منہ "آپ کا" صاحب خدا کا نام لو

لکھنؤ نے بتایا کہ "آپ میں" یک گونہ تعظیم مضمر ہے، "تم" کے ساتھ اس کا اجتماع زیبا نہیں، یہ اصلاح دلی نے بھی تسلیم کر لی ۔

دلی میں تشدد پسندوں کو "کراہ" اور "کراہنے" میں لطف آتا تھا، تشدید رائے مہملہ ضروری سمجھتے تھے، لکھنؤ کا ترک تشدد پر عمل تھا، اس نے تشدید کی تخفیف کر دی اور دلی بھی اسی کی تابع ہو گئی، میرزا داغ فرماتے ہیں ۔

چپکے چپکے ترے بیمار کراہیں کیوں کر

با ایں ہمہ اب تک ایسے اہل دہلی موجود ہیں جو نہایت تشدد کے ساتھ "کرّاہنے" پر اصرار رکھتے ہیں ۔

درختوں کے "تھالے" دلی میں "تھانولے" تھے، لکھنؤ نے تھالے بنائے، اور اب یہی متداول ہیں ۔

"سانس" دلی میں مذکر تھی، لکھنؤ نے تانیث کا تصفیہ کیا تو اس وقت کی دلی نے بھی تسلیم کر لیا، ذوق دہلوی فرماتے ہیں ۔

کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد
سینے میں ہو گی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد

لیکن زبان کی اصلاح طبقۂ اہل سخن تک ہے، گھر کی دوائیں، انائیں، اور مامائیں کب یہاں تک رسائی پاتی ہیں، ذوق کے شاگرد داغ نے اپنے گھر میں سانس کو مذکر آتے جاتے دیکھا، اس لیے خود بھی تذکیر ہی پر آ گئے فرماتے ہیں ۔

دیکھ لینے کو ترے سانس لگا رکھا ہے
ورنہ بیمار غم عشق میں کیا رکھا ہے

دلی میں لفظ مذکر ہو تو علامت مصدر کو مذکر لاتے ہیں، مونث ہو تو مونث ۔ مثلاً : مجھے

پڑھنا ہے، انھیں چاہئے بینی ہے، لکھنؤ نے بتایا کہ فارسی میں جس طرح علامت مصدر "دن" اور "تن" ہے اسی طرح اردو میں "نا" ہے، مثلاً آنا، جانا، پڑھنا، پڑھانا یہ علامت ہر حال میں برقرار رہے گی، لفظ کی تذکیر و تانیث کی تابع نہ ہوگی، جناب امیر اپنی مشہور آفاق غزل میں فرماتے ہیں:۔

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنا ہیں ایک کمسن کے لیے

"چاہیئے" (صیغۂ واحد غائب) "باید" کا ترجمہ ہے جس کا صیغۂ جمع غائب (بایند) نہیں آتا، لکھنؤ نے واحد اور جمع دونوں صورتوں میں "چاہیئے" پر قناعت کی۔ دلی میں بحالت جمع "چاہئیں" کہتے ہیں۔

"الف و نون" جمع کے ساتھ لکھنؤ میں جب کسی لفظ کا استعمال ہوگا عطف و اضافت کے ساتھ ہوگا۔ مثلاً: صاحبان ذوق، پیر مغاں محض "صاحبان" یا "مغاں" لکھنؤ کی زبان نہیں، مگر دلی میں متداول ہے، میرزا داغ کی مشہور غزل ہے:۔

پکارتی ہے خموشی مری فغاں کی طرح
نگاہیں کہتی ہیں سب راز دل زباں کی طرح

اسی میں فرماتے ہیں:۔

الٰہی رند بھی مے خوار ہو مغاں کی طرح

دلی میں کہتے ہیں:۔ چند لوگ آئے، چند لوگ گئے، یہ دو کلمے سے مرکب ہے "چند" اور "لوگ" "چند" یا "اند" عربی لفظ "بضع" کے ہم معنے ہے جس کا اطلاق ایک سے نو تک محدود ہے، بخلاف اس کے "لوگ" جمع کثرت کے لیے ہے جس کا اطلاق ایک دو آدمیوں پر ممکن نہیں، محاورہ میں "پانچ آدمی آئے" تو ہے "پانچ لوگ آئے" نہیں ہے، اس لیے کہ "لوگ" اصل میں "قوم" کے مترادف ہے جو مردوں کی ایک بڑی جماعت کے لیے ہے کہ دس یا زیادہ کی ہو، عورتیں اس میں شامل نہیں، لکھنؤ نے "چند لوگ" کی تشریح یہ واضح کردی کہ "چند" تو دس سے کم کے لیے ہے اور "لوگ" دس سے اوپر کے لیے

یہ نقیض مجتمع کیونکر ہوں گے۔

عربی فارسی کے بہت سے لفظ کسی قدر تغیر کے ساتھ اُردو میں متداول ہیں، مثلاً "حضور" کے معنے میں "حضوری"۔

حضوری میں حاضر ہے یہ شعلہ خو

"غَلَط" کی جگہ "غلطی"۔

غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

لیکن عطف و اضافت کے ساتھ ایسے الفاظ زبان سے خارج ہیں، اس بنا پر

غلطیہائے مضامین مت پوچھ

کی اگر کچھ توجیہ بھی ہو سکتی ہو تو "صفا" سے "صفائی" کو مضاف الیہ بنانا کیونکر درست ہوگا مگر ذوق فرماتے ہیں:۔

کون گھر آئینے کے جاتا اگر وہ مہوش
خاکساری سے نہ جا ردب صفائی دیتا

فارسی میں "مہ" حرف نفی ہے جس کی عربی شکل "ما" تھی، اردو میں یہی لفظ "مت" ہو گیا لیکن "مَت" کے دوسرے معنے بھی ہیں:۔

زاہد اگر حیران ہے تو کیا ہوا انسان ہے
وہ مست آنکھیں دیکھ کر آہو کی مت اکثر گئی

لکھنؤ نے ازالۂ التباس کے لیے نفی کو "نہ" تک محدود رکھا "مَت" کو خارج کر دیا، لیکن دلّی کی زبان میں اب تک یہ داخل ہے۔

ایسا طریق ادا جس کا کوئی پہلو سنگ راہ تہذیب ہو، لکھنؤ کی زبان میں متروک ہے، لیکن دلّی کہتی ہے:۔

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

ایک اور مثال بھی ملاحظہ ہو:۔

آگے ڈالی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں گانٹھ
پیچھے ٹھونکی ہے سرِ رشتۂ تقدیر میں کیل

یہ دونوں بیتیں حضرت میرزا غالب دہلوی کی ہیں، اردو میں "گرہ" کے لیے "گانٹھ" بھی ہے مگر ثقیل ہے، لکھنؤ کسی بھونڈی ثقالت کا متحمل نہیں۔

فصیح الملک جہاں اُستاد میرزا داغ مرحوم ایک مرتبہ لکھنؤ تشریف لائے، ان کے اعزاز میں ایک خاص مشاعرہ امین الدولہ کی بارہ دری میں منعقد ہوا، مرحوم کی یہ غزل اسی مشاعرہ کی ہے:-

گھر سے اُن کے نکلے ہم خلقت تماشائی ہوئی
آگے آگے داغ پیچھے پیچھے رسوائی ہوئی

مطلع کا ہنوز اعادہ بھی نہ ہونے پایا تھا کہ مشاعرہ میں شور مچ گیا، بے قید نوجوان چلانے لگے کہ:-

آگے آگے داغ پیچھے پیچھے رسوائی ہوئی

مرحوم نے غزل بھی نہیں پڑھی اور اٹھ کھڑے ہوئے، جاتے جاتے ہر گلی کوچہ میں اسی مصرع کا آوازہ بلند تھا، بچتے بچاتے بڑی مشکلوں سے فرودگاہ تک پہونچے، صبح سویرے ہی واپس گئے، اور مصرع میں بھی پیچھے کو آگے کر دیا:-

پیچھے پیچھے داغ آگے آگے رسوائی ہوئی

لکھنؤ رعایت لفظ کا جانبدار ہے مگر رعایت معنے کو اس پر مُقدّم رکھتا ہے، جن شعراے لکھنؤ نے اس کا التزام نہ رکھا لکھنؤ کی زبان اُن سے بیزار ہو گئی، لیکن دلّی جب رعایت لفظ پر آتی ہے تو اور ہی شان دکھاتی ہے، میرزا غالب فرماتے ہیں:-

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے سر کی کہ میں کھا ہی نہ سکوں

"قسم" کے لیے "سم" نہ لا سکے تو زہر کھانے کی آمادگی دکھانے لگے۔

لکھنؤ میں بچے دودھ پیتے ہیں اور جوان کھاتے ہیں، دلّی کے بوڑھے جوان سب ہی

دودھ پیتے ہیں۔

گہنے اور برتن لکھنؤ میں گڑھے جاتے ہیں، دلّی میں گھڑے جاتے ہیں۔

لکھنؤ میں شیر ڈکارتے ہیں، دلّی میں ڈرو کتے ہیں۔

لکھنؤ پانی میں شرابور ہے، دلّی شوربور ہے۔

صحیح نتیجہ نکالنے کے لیے صحیح مقدمات کی ترتیب ناگزیر ہے جس کو نصف صدی قبل کلّیت کبری و ایجاب صغری کہتے تھے، دلی میں یہ التزام ضروری نہیں، کچھ کہتے ہیں، کچھ جی میں رکھتے ہیں، مگر نتیجہ میں دونوں ملحوظ رہتے ہیں، مثلاً کہنا یہ ہے کہ تم جس کے پہلو میں ہو اس کا نصیب سب سے اچھا ہے، لیکن کہتے یہ ہیں:۔

جس کے پہلو میں ہو تم اس کا نصیب اچھا ہے

اور اس سے نتیجہ نکالتے ہیں:۔

میری دانست میں تم سے بھی رقیب اچھا ہے

اس نتیجہ کے لیے مصرع اوّل میں "سب سے" محذوف ماننا پڑے گا یعنی:۔
جس کے پہلو میں تم ہو اُس کا نصیب سب سے اچھا ہے، اس لیے رقیب تم سے بھی اچھا رہا کہ تمھارے ہم پہلو رہتا ہے۔

اسی غزل میں فرماتے ہیں:۔

بیٹھے نادک کی طرح اٹھے قیامت کی طرح

یہ ادب جس نے سکھایا ہے ادیب اچھا ہے

لکھنؤ میں قاعدہ ہے کہ جو معنے مراد ہوں لفظ ایسا آئے کہ مفہوم پر حاوی ہو۔ "ادیب" ادب شناس کو کہتے ہیں، ادب آموز کے لیے "مُوَدِّب" ہے۔

دلّی میں "ٹھیرنے" کا رواج تھا، میرزا رفیع سودا نے جب عاقل عطار کی ہجو کی اور اُسی کی دکان میں بیٹھ کے سنائی تو اس نے کہا:۔

ٹھیر تو گھول کے دوں میں تجھے ایسا جلّاب

کہ تری ...... کے رستے ترا سودا نکلے

لکھنؤ میں "ٹھیرتے" نہیں ٹھہرتے ہیں، دتی نے بھی یہ اصلاح تسلیم کرلی، میرزا داغ کی غزل ہے :-

طبیعت کوئی دن میں بھر جائے گی
چڑھی ہے یہ ندی اُتر جائے گی

اس میں فرماتے ہیں :-

طبیعت کو ہوگا قلق چند روز
ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی

بعض ایسے الفاظ تھے جن کی تذکیر و تانیث دہلی و لکھنؤ میں یکساں متفق علیہ تھی، دتی تو بدل گئی مگر لکھنؤ اب تک برقرار ہے، مثلاً :- التماس لکھنؤ میں مذکر ہے اور دتی میں مونث، لیکن پہلے اہل دہلی بھی مذکر ہی کے قائل تھے، میر سوز دہلوی فرماتے ہیں :-

کیا پتنگے نے التماس کیا

سونگھنے کے معنے میں دتی والے "باس کرنا" بولتے تھے، میر سوز مرحوم کی اسی غزل میں "باس کیا" وارد ہے، لکھنؤ میں "باس" کو "بو" کے تابع رکھتے ہیں، مثلاً :- پھولوں کی بو باس، باس کرنا متروک ہے۔

آجکل "بعد میں" دلی کی عام بول چال ہے، پہلے نہ تھی، اور زبان شعر میں اب بھی نہیں ہے، لکھنؤ میں "بعد کو" لاتے ہیں۔

"چوپٹ" کے معنی دتی میں چار کواڑ کھلے ہونے کے ہیں اور لکھنؤ میں دو کے، اس لیے کہ ہر کواڑ میں دو پٹ ہوتے تھے، چار کواڑ کے آٹھ پٹ ہوئے، چوپٹ کیونکر کہیں گے۔

جس گھر کے کواڑ شب کو کھلے رہ جائیں گے چوروں کو دستبرد کا موقع ملے گا جس کا نتیجہ گھر کی ویرانی و تباہی ہے، اس لئے چوپٹ ہونے سے غارت جانا مراد لیتے تھے، لکھنؤ میں مجاز کی صورت بھی حقیقت سے زیادہ دور نہیں جانے پاتی، در چوپٹ ہیں (بصیغۂ جمع) کہیں گے، در چوپٹ ہے (بصیغۂ واحد) محاورہ نہیں، کیوں کہ ایک در میں

چار پٹ کہاں، دلی میں اس کا التزام نہیں، نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی فرماتے ہیں :۔

درِ مے خانہ چوپٹ ہے تہجد کو ہوئی چوری — کہیں ٹوٹے ہوئے شیشے کہیں چھوٹے پیالے ہیں
گماں کس پر کریں مے کش اِدھر واعظ اُدھر صوفی — خدا رکھے محلے میں سبھی اللہ والے ہیں

یہ بحث بہت دراز ہے، اس مختصر میں مُطول کی گنجایش کہاں، عمر کوتاہ و قصہ طولانی[ا] توفیق رفیق ہو تو ایک مستقل تالیف ہو سکتی ہے، بہر حال : اس مُبتدا کی دیکھیے نکلے خبر کہاں۔

۶

عہد زوال میں ایسے شاعر کہاں کہ زمانہ پر حکومت کریں اور اس کی رفتار بدل دیں، جس ملک میں قوم کی آزادی معرض خطر میں ہو وہاں سفلی جذبات زور باندھتے ہیں پست خیالی کو عروج ہوتا ہے، اور شاعری بھی سفلگی کی ترجمان بن جاتی ہے شعراے اردو اسی عہد کی پیداوار ہیں، اس لیے ناچار اسی اُسلوب کے علمبردار ہیں، بایں ہمہ امیر ایک سچے مسلمان فقیر تھے، دربار داری کا ابتلا نہ ہوتا اور اپنی افتاد طبیعت کے مطابق کہہ سکتے تو معاصرین کے طاق عشرت میں آپ ان کو نہ پاتے حکیم سنائی، خواجۂ عطار اور مولوی معنوی کی صف میں نظر آتے، خود فرماتے ہیں :۔

گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا سا نشانِ سرِ مزار ہوں میں

کرم، کہ تیرے کرم کا امیدوار ہوں میں — گناہ گار ہوں یارب گناہ گار ہوں میں
امیر جاتی جوانی یہ مجھ سے کہتی ہے — خزاں نہ سمجھو مجھے آخری بہار ہوں میں

امیر اس باغ میں رہ کر کریں کیا دام الجھتا ہے — نہ نخوت چھوڑتے ہیں گل نہ کانٹے خو بدلتے ہیں

[ا] ایرانیوں کی غلط تقلید میں ہندوستان بھی طولانی پسند ہو گیا لیکن "طولان" کوئی لفظ نہیں جس سے "طولانی" بن سکے، تاہم اس غلط العام کو فصیح ہی ماننا پڑے گا کیونکہ یہ غلط العوام نہیں ہے۔

کیا دیر ہے امیرؔ کے عفو گناہ میں
اللہ، کیا کمی ہے تری بارگاہ میں
پست و بلند دائرۂ عشق میں نہیں
پائین و صدر ایک ہے اس بارگاہ میں
ہے راستؔ رو وہی جو ہے دینِ رسولؐ پر
ہوتی ہے کوئی راہ غلط شاہراہ میں
ہے نقش دل پہ صورتِ توحید اے امیرؔ
ہوں محو ذکرِ اَشہَدُ اَن لا اِلٰہ میں

ارباب کمال چل بسے سب
سو میں کہیں ایک دو رہے ہیں
محفل برخاست ہے پتنگے
رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں
ہے کوچ کا وقت آسماں پر
تارے کہیں نام کو رہے ہیں
ان کی بھی نمود ہے کوئی دم
وہ بھی نہ رہیں گے جو رہے ہیں
دنیا کا یہ رنگ اور ہم کو
کچھ ہوش نہیں ہے سو رہے ہیں

ہائے وہ دن کہ گزر جاتی تھی شب باتوں میں
اب نہ باتوں میں مزہ ہے نہ ملاقاتوں میں
بت نہ بولیں جو نہیں بولتے ہیں ہم سے امیرؔ
اپنے اللہ سے باتیں ہیں مناجاتوں میں

قوم کو آزادی کی تمنا ہے تو سامان آزادی فراہم کرنا چاہیئے، کس شان سے اس کی تمہید باندھتے ہیں :۔

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر
سرفروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر
رنگ چاہے اگر اس باغ میں آزادی کا
نکہتِ گل کی طرح شوقِ سفر پیدا کر
کون سی جا ہے جہاں جلوۂ معشوق نہیں
شوقِ دیدار اگر ہے تو نظر پیدا کر
آخرت میں عمل نیک ہی کام آئیں گے
پیش ہے تجھ کو سفر زادِ سفر پیدا کر
عشق حسنِ نمکیں کا جو اٹھانا ہے مزہ
پہلے کچھ ذائقۂ زخمِ جگر پیدا کر

پیاس اُس کی جو بجھے گی تو ہے کوثر[1] سے
ظرف عالی ہے امیر احمدِ مینائی کا



یہ سیرۃ ایک اُستادِ سخن امامِ فن کی سیرۃ ہے جو ایک ماہرِ فنِ سخنوری کی بدیع المثال تالیف ہے، جنابِ امیرؔ کے کلام پر فاضلانہ تبصرہ کا اتنا سرمایہ فراہم کیا ہے اور اس خوبی سے دادِ سخن دی ہے جس کا کم سے کم صلہ تحسینِ سخن سنج ہے، ادبی سیرۃ نگاری کا یہ عزیز الوجود نمونہ خدا کرے اقلیم ادب میں خضرِ راہ ثابت ہو۔ وآخر دعوانا اَنِ الحمدُ لِلّٰہِ ربّ العالمین۔

عمادی

حیدرآباد۔ ۵۔ جمادی الاولیٰ۔ ۶۰ ۱۳ھ

---

[1] کوثر کو بھی اسی مینائی معرفت سے فیض پہونچا تھا جس کی روانی تسنیم میں ہے:۔
نہیں کوثر نہ سہی بادۂ تسنیم تو ہے
بزم میں دور چلے ساغرِ مینائی کا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضروری گزارش

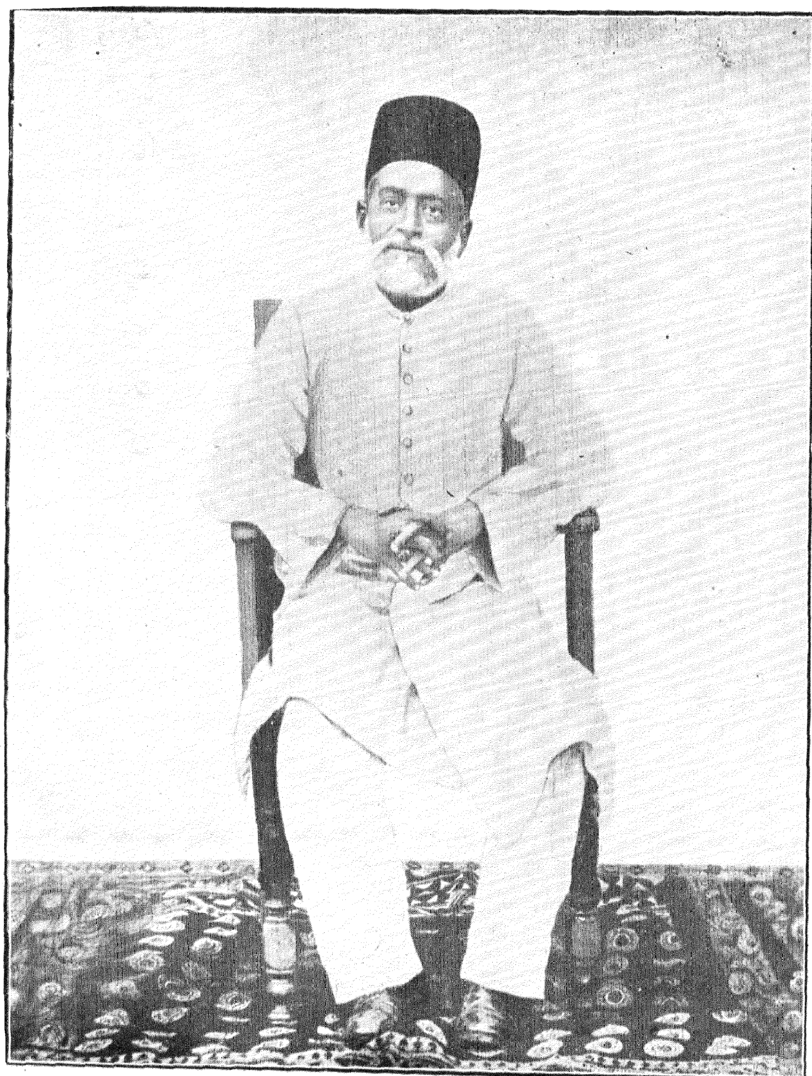
مجھے نہایت افسوس اور صدمہ ہے کہ یہ سوانح عمری میرے والد مرحوم کے انتقال فرمانے کے بعد شائع ہو رہی ہے حالانکہ انھوں نے اپنی اس تالیف کا مسودہ ۱۳۴۶ھ میں مرتب کر لیا تھا جس کی تاریخ "سیرت امیر احمد امیر مینائی" ہے۔ چونکہ بطور خود اس کے چھپوانے اور اشاعت کرنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے اس لیے دو چار جگہ اسکی تحریک اور خواہش کی کہ یا تو کوئی قدردان رئیس اپنے نام سے انتساب کرنے کی اجازت دے کر ہمت افزائی اور قدردانی فرمائے یا کوئی مطبع حق اشاعت خرید لے لیکن ناکامی ہوئی اس لیے کہ اس زمانے میں کمال کی تو بہت کم قدر ہوتی ہے البتہ نام بکتا ہے یا سفارش کارگر ہوتی ہے اور والد مرحوم ایک عرصے سے گوشۂ گمنامی میں تھے۔

انھوں نے جس ولولے اور شوق سے اس کام کو انجام دیا تھا اس کے بعد اس کی اشاعت سے ایک حد تک مایوسی کا اُن پر جو کچھ اثر ہونا چاہیئے تھا اور ہوا وہ ظاہر ہے۔ اس پر طرّہ یہ ہوا کہ اسی عرصے میں حضرت جلیل نے ایک سوانح عمری خود مرتب کر کے شائع کرا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ والد مرحوم کچھ ایسے برخاستہ خاطر ہوئے کہ ان کو مسودے پر نظر ثانی کرنے اور اس میں کسی قسم کی ترمیم یا اضافے کی نوبت نہ آئی یہاں تک کہ وہ ۱۵ رمضان المبارک ۱۳۵۴ھ کو اس تالیف کی اشاعت کی حسرت لئے ہوئے اس دار فانی سے سدھار گئے اور یہ بار میرے کمزور کاندھوں پر پڑا۔ ممکن تھا کہ ان کی زندگی میں کوئی صورت اس کے چھپنے کی نکل آتی تو وہ کچھ اصلاح و اضافہ فرماتے کیونکہ بعض حالات بھی تبدیل ہو چکے ہیں۔ مثلاً نواب سید محمد حامد علی خاں بہادر مسند آرائے جناں ہوئے اور منشی صاحبؒ کے دو صاحبزادے

جناب منشی محمد احمد صاحب ضریر اور جناب منشی ممتاز احمد صاحب آرزو دہلی (والد مرحوم کی زندگی میں) راہی جنت ہو گئے لیکن وہ اس کی اشاعت سے کچھ ایسے مایوس ہو رہے تھے کہ انھوں نے پھر اس طرف کوئی توجہ نہ کی۔ بہرحال میں اس مسودے کو بغیر کسی ترمیم کے بجنسہٖ شائع کرا رہا ہوں کیونکہ میں بالکل اس کا اہل نہیں البتہ ایسی ضروری باتوں کو حاشیے پر نوٹ کر دیا ہے۔

ایک اور بات قابل گزارش یہ ہے کہ لئے، گئے، آئے، جائے، وغیرہ ایسے الفاظ کہیں ہمزہ کے ساتھ طبع ہوئے ہیں کہیں "ی" کے ساتھ (لیے، گیے، آیے، جایے) اور کہیں ہمزہ بھی ہے اور "ی" کے نقطے بھی رہ گئے ہیں۔ یہ بات کچھ تو رسم خط کے اختلاف کے باعث ہو گئی ہے اور کچھ پروف وغیرہ کی درستی میں رہ گئی ہے۔

محمد عبدالباری (خلف مؤلف)



مولف

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

سیرت امیر احمد امیرؔ مینائیؒ

سنہ ۱۳۴۶ھ

سنہ ۱۸۹۵ء میں جب میں اس ملک میں آیا تو میرے معزز کرم فرما مسٹر سراج احمد صاحب ایم۔اے نے مجھ سے فرمایا کہ تم منشی امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی کی سوانح عمری لکھو میں اپنے خیال ناقص میں اس کو ایک فال بد سمجھا اور اُن سے کہا کہ ابھی تو منشی صاحب زندہ ہیں۔ انھوں نے مسکرا کر کہا "کیا ہوا کیا کسی کی زندگی میں اس کے سوانح عمری نہیں لکھے جاتے ہیں"، مگر میرے نادان دل نے اس کو گوارا نہ کیا۔ اس وقت اس بیش بہا تحریک کی قدر نہ کی (کیونکہ اس زمانے میں حالات و واقعات خود منشی صاحبؒ سے معلوم ہو سکتے تھے) اور آج پچھتا رہا ہے۔

منشی صاحبؒ کے انتقال کے بعد میں نے اس کام کا ارادہ کیا مگر مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ حیدر آباد میں منشی صاحبؒ کی سوانحعمری لکھی جا رہی ہے تو میں نے اس خیال سے کہ مجھ سے کہیں بہتر وہاں لکھی جائیگی اپنا ارادہ ملتوی کر دیا میں نے بے صبری کے ساتھ برسوں انتظار کیا مگر اُس خبر کا جو میں نے بار بار سنی تھی حیدر آباد سے کچھ ظہور نہ ہوا۔ البتہ ایک مختصر سوانح عمری مولفہٗ حضرت بیکسؔ شائع ہوئی جس کو میں نے بھی دیکھا۔

مارچ سنہ ۱۹۲۴ء میں پندرہ دن کے اندر میں دوبار "انجائنا پکٹورس" کے مہلک مرض میں مبتلا ہوا جس سے میرا دل و دماغ اور بھی کمزور ہو گیا۔ میرے معالج کی یہ رائے ہوئی کہ مجھے ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر کے آرام کرنا چاہیے۔ میں نے اس مشورے پر عمل کر کے مئی سنہ ۱۹۲۵ء میں نپشن لے لی۔ آخر سنہ ۱۹۲۶ء میں مجھے پھر اپنی دیرینہ تمنا پوری کرنے کا حوصلہ ہوا اور میں نے متوکلاً علی اللہ کام شروع کر دیا مگر اپنی بے بضاعتی، دل و دماغ کی خلقی کمزوری، بڑھاپے کی کاہلی اور افکار و آلام کے باعث تالیف میں تعویق ہوتی رہی اور خدا خدا کر کے اس سال کے شروع میں یہ کتاب پوری ہوئی۔ کتاب کو میں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں منشی صاحبؒ کے حالات و واقعات زندگی ہیں اور جہاں کوئی واقعہ ان کی شاعری سے متعلق

آگیا ہے وہاں ان کی وہ نظم بھی لکھدی ہے ۔ دوسرے حصے میں ان کی شاعری سے بحث کی گئی ہے ۔
اس حصے میں منشی صاحب رح کا کلام ضرورت سے زیادہ معلوم ہوگا اور یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اس طریق سے کتاب کا حجم بڑھایا گیا ہے مگر میری رائے میں اصناف سخن میں سے دو دو چار چار شعر یا کسی خاص رنگ کے دس پانچ شعر بھی لکھدینا شاعر کی قادر الکلامی کی کافی دلیل نہیں ہو سکتا۔ علاوہ بریں یہ بھی فائدہ نظر آیا کہ منشی صاحب رح کے منتخب کلام کا ایک حصہ اس کتاب کے ذریعے شائع ہو جائے گا جس سے ناظرین کی دلچسپی ہو گی ۔
میں منشی صاحب رح کا قریب قریب ایک گمنام اور ادنئے شاگرد ہوں تاہم جناب مغفور کے جن تلامذہ کی خدمت میں مجھے نیاز حاصل ہے ان سے میں نے استدعا کی کہ جو واقعات منشی صاحب رح کی سوانح عمری سے متعلق ان کو معلوم ہوں ان سے مجھے مطلع کر کے اس کام میں میری مدد فرمائیں مگر اور حضرات نے تو مجھے سوکھا جواب دیا البتہ حضرت رح کے بڑے صاحبزادے جناب منشی محمد احمد صاحب تمر پرا ستاد عالیجناب نواب صاحب بہادر رام پور بالقابہ نے ابتدائی حالات و واقعات لکھ کر مجھے عنایت فرمائے اور جناب مرحوم کے چوتھے صاحبزادے منشی ممتاز احمد صاحب آرزو اور عزیزی مولوی صدیق الزماں صاحب ذکا سلمہ اللہ تعالےٰ (نبیرہ حضرت امیر مینائی) نے کچھ غیر مطبوعہ کلام بہم پہنچا کر میری مدد کی۔ اس بہت بڑی امداد کے لئے میں اپنے ان معزز و محترم عزیزوں کا تہ دل سے شکر گزار ہوں اس کے سوا کتاب "خطوط منشی امیر احمد" (مولفہ حضرت ثاقب) اور سوانح عمری مولفہ حضرت سکینش سے میں نے مدد لی ہے ۔ اصلاحوں کے چند نمونے "مشاطۂ سخن" مولفہ حضرت صفدر میرزا پوری سے میں نے لئے ہیں۔ باقی جو کچھ منشی صاحب رح کی زبان مبارک سے یا فدا مرحوم وغیرہ سے میں نے سنا اور وہ میرے سینے میں محفوظ تھا اس سے کام لیا ہے ۔

آخر میں مجھے یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ اپنی بے بضاعتی کا حال میں خود جانتا ہوں یہاں تک کہ اس دیس میں جہاں کوئی یہ بھی نہیں جانتا (صوبہ متحدہ کے باشندوں کو چھوڑ کر) کہ اردو کسے کہتے ہیں اور شاعری کیا چیز ہے بتیس تینتیس سال سے پڑا ہوا ہوں ۔ اپنی زبان قریب قریب بھول گیا شعر و سخن سے دلچسپی جاتی رہی اور طبیعت کو بہت کم لگاؤ رہ گیا۔ اس لئے جا بجا غلطیوں اور خامیوں کا نظر آنا ممکن ہے امید ہے کہ ناظرین میری مجبوریوں کا لحاظ فرما کر انھیں نظر انداز فرمائیں گے ۔

۱۱ رمئی ۱۹۲۸ء (شاہ) محمد ممتاز علی آہ

ڈونگر گڑھ ضلع رائے پور (ملک متوسط)



امیر مینائی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امیر احمد نام۔ امیر تخلص۔ ۱۶/ شعبان المعظم سنہ ۱۲۴۴ھ میں دوشنبہ کے دن ساڑھے دس بجے لکھنؤ میں پیدا ہوئے (وہ شاہ نصیر الدین حیدر کا عہد تھا)۔ آپ مولوی شاہ کرم محمد مینائی مرحوم (مرید و یار مجاز حضرت مولانا شاہ عبدالرحمن لکھنوی) کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ آپ کے نسب کا سلسلہ[1] حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب عم حضرت محمدؐ رسول اللہ تک پہونچتا ہے۔ اور یہ جو بعض لوگوں نے حضرت مخدوم شاہ میناؒ کو صدیقی لکھا ہے بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ کے والد شیخ قطبؒ اور چھوٹے بھائی شیخ نصیر الدین احمد عرف شیخ احمد اور ان کے بڑے بیٹے شیخ قطب الدینؒ (جانشین حضرت مخدومؒ) سب کی شادیاں قبیلہ تیم میں ہوئی تھیں جس قبیلے سے حضرت صدیق اکبرؓ تھے۔

منشی صاحبؒ کے مورث اعلےٰ شیخ عثمان عرب سے ہندوستان تشریف لائے تھے۔

---

[1] افسوس ہے کہ باوجود درخواست کرنے کے پورا نسب نامہ نہ ملا۔ ایک دوسرے ذریعے سے شیخ عثمان تک مل سکا جو حسب ذیل ہے۔

امیر احمد ابن مولوی کرم محمد ابن شیخ محمد معظم ابن شیخ محمد عظیم ابن شیخ خواجہ احمد ابن شیخ صالح محمد ابن شیخ خواجہ ابن شیخ مبارک ابن شیخ حسین ابن شیخ گدائی ابن شیخ نظام ابن شیخ الہداد ابن شیخ ابراہیم ابن شیخ قطب الدین (جانشین و برادر زادہ مخدوم شیخ محمد عرف شاہ میناؒ) ابن شیخ نصیر الدین احمد ابن شیخ قطب ابن شیخ عثمان مورث اعلےٰ۔

چونکہ اس زمانے میں اسلامی سلطنت کا پایۂ تخت دہلی تھا وہ بھی پہلے وہیں گئے اور فوج شاہی میں کسی عہدے پر مامور ہوئے مگر چند سال کے بعد جونپور چلے گئے اور وہیں اقامت اختیار کی اس کے بعد لکھنؤ میں۔ شیخ صاحب کے بڑے صاجزادے شیخ قطب اپنے دوست اور عزیز شیخ قیام الدین عباسی المعروف بہ حاجی الحرمین کی محبت میں ان کے اصرار سے نویں صدی ہجری میں لکھنؤ چلے آئے جو اُس زمانے میں ایک قصبہ تھا اور وہیں قیام پذیر ہو گئے۔ اسوقت سے اب تک اس خاندان کے افراد کی بود و باش لکھنؤ میں ہے۔ شیخ قطبؒ کے بڑے صاجزادے شیخ محمد ملقب بہ مخدوم شاہ میناؒ آپ کا وصال ۸۸۴ھ میں ہوا معروف و مشہور اولیائے کرام میں سے لکھنؤ کے قطب تھے[لہ] اور منشی صاحبؒ انھیں مخدوم صاحبؒ کے انتساب سے مینائی ہوئے۔ مخدوم صاحبؒ نے خود تو شادی کی نہیں لیکن آپ کے بھتیجے شیخ قطب الدین آپ کے جانشین ہوئے اور انھیں کی اولاد مینائی کہلائی۔ مخدوم صاحبؒ کے بعد منشی صاحبؒ کے بعض بزرگ صاحب تسبیح و سجادہ اور بعض صاحب نوبت و نقارہ ہوئے۔ لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے مشہور و معروف زمانہ امام باڑے کے قریب جہاں اب

لہ مخدوم شاہ میناؒ کے مرشد حضرت مخدوم شیخ سارنگ مجگوئیؒ تھے۔ مخدوم شیخ سارنگؒ کے صاجزادے کا لقب بھی مینا تھا۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ مخدوم شیخ سارنگؒ نے اپنے وصال کے وقت پکارا "مینا" چونکہ صاجزادے اسوقت موجود نہ تھے مخدوم شیخ محمدؒ نے جواب دیا کہ "میاں مینا تو تشریف نہیں رکھتے ہیں غلام مینا حاضر ہے"۔ پھر دوبارہ اور سہ بارہ پکارنے پر یہی جواب پایا تو بلایا اور فرمایا کہ "لو یہ دولت تمھارے ہی نصیب میں ہے"۔ یہ کہہ کر دولت سینہ عطا فرمائی اور حکم دیا کہ "میری تجہیز و تکفین کے بعد لکھنؤ چلے جاؤ تم وہاں کے بلکہ کل ملک اودھ کے قطب مقرر کئے گئے اور میاں مینا آئیں تو ان سے کہنا کہ اسی مزار پر بیٹھ رہیں جو کچھ ان کے حصے کا ہے ان کو بھی مل جائے گا"۔

ڈیکل کالج بنا ہے مخدوم صاحبؒ کا مزار اور اسی کے پاس مسجد خانقاہ اور خاندان مخدوم صاحبؒ کے کئی سو مکانات یکجا تھے۔ پورا ایک محلہ بسا ہوا تھا جس کو لوگ مینا بازار کہتے تھے۔

علم و فضل کے ساتھ درویشانہ طریقہ ہونے سے یہ خاندان معزز و محترم تھا۔ اعیان دولت وارکان مملکت بھی احترام کرتے اور اس خاندان کی خدمت اپنی سعادت سمجھتے۔ جاگیر وغیرہ نے حصول معاش کی فکر سے مستغنی کر رکھا تھا اس لیے تحصیل و تعلیم علوم ظاہر یا مجاہدہ و مشاہدہ خاندانی مشاغل تھے۔ افسوس کہ وہ جاگیر عہد نواب صفدر جنگ میں ضبط ہوگئی۔

برادر معظم منشی عبدالرحمٰن صاحب بسمل[1] نے جو منشی صاحبؒ کے عزیز قریب ہیں اور سات برس کی عمر سے منشی صاحبؒ کے سفر حیدرآباد تک آپ کے پاس رہکر فیضیاب رہے، اپنے بزرگوں سے سنا اور ان کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ شاہ کرم محمد صاحبؒ نے جو اقسام قابلیت کے اعتبار سے اپنے وقت میں بے عدیل بزرگ تھے، اپنے صاحبزادوں کے حق میں یہ دعا کی تھی کہ یا اللہ میرا ایک لڑکا مولوی فاضل اور منشی ہو دوسرا عالم و حافظ ہو اور آستانۂ حضرت مخدومؒ پر بیٹھ کر درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھے اور تیسرا لڑکا شاعر باکمال ہو۔ شاہ صاحبؒ کی یہ دعا مستجاب ہوئی۔ چنانچہ بڑے صاحبزادے (مفتی) مولوی طالب حسن صاحب مرحوم شاہ صاحبؒ کی حیات ہی میں علم و فضل حاصل کر چکے تھے۔ شاہ صاحبؒ کا جب وصال ہوا تو اس وقت منشی امیر احمد صاحبؒ کی عمر کچھ مہینے اوپر نو برس کی تھی۔ منجھلے صاحبزادے مولوی حافظ عنایت حسین صاحب مرحوم اور منشی صاحبؒ تحصیل علم کی طرف پوری توجہ نہ کرتے تھے۔ ایک دن بڑے بھائی نے دونوں بھائیوں کو بلا کر اظہار ناخوشی کیا اور فرمایا کہ یا تو تحصیل علم میں محنت و مستعدی سے کام لو یا انکار کردو۔ اس پر منجھلے نے تو سکوت کیا چھوٹے نے کہا

---

[1] اب آپ کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔

انکار نہ کریں گے۔ دوسرے ہی دن سے دونوں بھائیوں نے مستعدی کے ساتھ طالب علمی شروع کی اور نہایت محنت و شوق سے تمام درسیات ختم کئے۔ بعد فراغ منجھلے مخدوم صاحب رح کے آستانے پر بیٹھ کر درس و تدریس میں مشغول رہے اور ایک مہینے میں قرآن بھی حفظ کر لیا جسے کرامت تصور کرنا چاہیئے۔ اور چھوٹے نے شاعری میں کمال پایا۔

حضرت منشی صاحب رح نے ابتدا میں قرآن شریف اور چھوٹی چھوٹی درسی کتابیں مولوی مظفر علی مبرور رہونوی سے پڑھیں جب آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا تو آپ کے بڑے بھائی مفتی طالب حسن صاحب مرحوم نے جو اُسوقت میں نظامت کے میر منشی اور بر سر عروج تھے اپنے بیٹے کی مثل آپ کی پرورش اور تربیت کی کبھی ذکر آجاتا تھا تو منشی صاحب فرماتے تھے کہ "بھائی جان کی زندگی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ جانے کا مجھے کبھی خیال بھی نہیں آیا"۔ منجھلے بھائی حافظ عنایت حسین صاحب مغفور نے جو تعلیم و تعلم کی مسند آبائی پر بیٹھ چکے تھے آپ کو عربی پڑھانا شروع کیا۔ سولہویں برس مفتی محمد سعد اللہ صاحب مراد آبادی سے منطق و فلسفہ اور مولوی تراب علی لکھنوی سے علم ادب پڑھنے لگے۔ اٹھارویں انیسویں برس مفتی محمد یوسف اور مولوی عبد الحکیم فرنگی محلی سے فقہ اور اصول پڑھکر فارغ التحصیل ہوئے اور فضیلت کی پگڑی باندھی گئی۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں علم ادب میں آپ کی شہرت ہو چلی تھی اور استاد اس بات کو مانتے تھے کہ امیر احمد ادیب کامل ہیں۔ اس تکملے کے بعد نواب محمد حسن خاں بریلوی (تلمیذ رشید حکیم میرزا احمد علی) سے طب پڑھکر اسکی بھی سند پائی مطب بھی کیا اچھے اچھے علاج کیے مگر پھر بنظر غایت احتیاط اس سے کنارہ کیا۔ بہت دنوں تک علم جفر میں بھی خود ہی محنت کر کے اچھی دستگاہ حاصل کی تھی مگر تیس سال ریاضت کرنے کے بعد یہ کہکر چھوڑ دیا "افسوس استاد نہ ملا بہت سی الجھنیں رہ گئیں"۔

چھوٹے صاحبزادے منشی مسعود احمد صاحب ضمیرؔ بی۔اے مجھ سے بیان کرتے تھے کہ اُبا جان فرماتے تھے جفر میں کوئی کلیہ قاعدہ ایسا نہ معلوم ہو سکا جس سے مستحصلہ مرتب نکل سکے! غیر مرتب حروف نکل آتے تھے۔ تاہم ان کو ترتیب دینے میں طبیعت ایسی راہ دیتی تھی کہ حکم بالکل صحیح ہوتا تھا۔ لکھنؤ میں وبا پھیلی ہوئی تھی اور اُس زمانے میں آسیرؔ مرحوم (امیرؔ کے استاد) رام پور میں تشریف رکھتے تھے۔ ان کے گھر سے کئی روز سے خط نہیں آیا تھا اس فکر و پریشانی میں ابا جان سے فرمایا جفر سے معلوم تو کرو وہاں کیا حال ہے اور خط کب آئیگا۔ ابا جان نے تعمیل ارشاد کی۔ جواب یہ نکلا " دوشنبہ خط خیریت آید مع قدرے از آہن "۔ اسیر سب کو بہت تعجب ہوا کہ خط میں لوہے کا کیا کام۔ دوشنبہ کی صبح کو آسیرؔ مرحوم ہمارے ہی گھر تشریف رکھتے تھے کہ ڈاکیے نے حکیم مرحوم (خلف اکبر آسیرؔ مرحوم) کا خط دیا۔ خیریت لکھی تھی اور خط میں ایک سوئی بھی نکلی۔ لوہا تو سب مان گئے لیکن یہ معمہ اسوقت سمجھ میں نہ آسکا کہ خط میں سوئی کیوں آئی۔ آسیرؔ مرحوم نے لکھ کر دریافت کیا تو جواب آیا کہ سوئی قصداً خط میں نہیں رکھی گئی غلطی سے ملفوف ہو گئی ہوگی "۔

" ایک بار گھر میں ایک قیمتی زیور چوری گیا۔ ابا جان نے جفر سے دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ یہ فعل گھر کی خادمہ کا ہے اور زیور اس کے پاندان سے برآمد بھی ہوا۔ اُسی دن شب کو آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو خواب میں دیکھا اور یہ ارشاد ہوا کہ " ہمارا علم اس لئے نہیں ہے کہ لوگوں کا پردہ فاش کیا جائے "۔

جفر سے متعلق اپنی معلومات تمام و کمال کتاب رموز غیبیہ میں لکھی ہیں۔

نجوم سے بھی طبیعت کو شغف تھا لیکن پوری کامیابی نہ ہو سکنے کے علاوہ شرعی ممانعت کے سبب سے طبیعت اس سے ہٹ گئی۔ تاہم اس فن میں بھی آپ کی معلومات بہت وسیع تھیں

جواہر الارقام کا ایک قدیم اور نادر الوجود نسخہ آپ کے پاس موجود تھا جو علامہ بیہقی کی طرف منسوب ہے اور فن نجوم میں بے مثل کتاب کہی جاتی ہے۔

آپ نے سنسکرت کا بھی مطالعہ فرمایا اور اس میں اس قدر دستگاہ حاصل کی کہ اس زبان کے بعض استادوں کے کلام کی شرح بھی اردو میں تالیف فرمائی۔

حضرتؒ نے ہوش سنبھالا تو سارے گھر کو درویشی کے رنگ میں ڈوبا دیکھا۔خود بھی عنفوان شباب ہی سے فقر کی طرف رجوع اور تصوف وسلوک کے دلدادہ تھے۔ دن کو تو مشاغل علمی رہتے تھے اور رات کو دو بجے سے اپنے جد امجد مخدوم صاحبؒ کے مزار پرانوار پر حاضر ہو کر بعد فاتحہ خوانی نماز تہجد پڑھتے اور پھر حجرہ شریف میں بیٹھ کر نماز صبح تک مشغولی کرتے اور بقا و فنا کے کیفیات طاری رہتے تھے ؎ نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم + بہر سو رقص بسمل بود شب جائے کہ من بودم۔ آخون صاحب ولایتی ایک بڑے فاضل اجل عالم باعمل اور درویش کامل، جناب حافظ محرم علی صاحبؒ خیرآبادی خلیفہ سوم جناب قطب الاقطاب حضرت شاہ سلیمان صاحب تونسویؒ وغیرہ اکثر اہل دل بزرگ مخدوم صاحبؒ کے مزار پر حاضر ہو کر مہینوں قیام کرتے تھے اور حضرتؒ کی صورت وسیرت اور مزاج ومتانت دیکھ کر سب کے دل آپ کی طرف کھنچتے اور سب بہت محبت کرتے تھے۔ اسی عالم میں کئی بزرگوں سے بیعت کر لینے کا ارادہ کیا۔ مگر پھر کوئی بات ایسی معلوم ہوئی کہ رک گئے۔ ایک دن اسی الجھن کو مٹانے کے لیے مخصوص اسی غرض سے مخدوم صاحبؒ کے مزار پر حاضر ہو کر مراقب ہوئے تو یہ معلوم ہوا کہ مخدوم صاحبؒ نے ایک بزرگ کے ہاتھ میں آپ کا ہاتھ دے دیا۔ صبح کو ایک بزرگ کو جو بالکل اسی شکل وشبیہ کے تھے جو مراقبے میں دیکھی تھی اپنی طرف آتے دیکھا۔ اُن بزرگ نے سلام کے بعد مصافحے کے لیئے ہاتھ بڑھایا اور فرمایا "اب

کیا دیر ہے۔ حضرتؒ نے فوراً اُن سے بیعت کرلی۔ وہ بزرگ جناب امیر شاہ صاحبؒ صابری[۱] رامپوری تھے۔ شاہ صاحبؒ نے کافی زمانے تک قیام فرماکر حضرتؒ کو سلوک خاندان صابریہ کی تعلیم دی اور صاحب اجازت کیا۔ اس کے بعد حسن اتفاق کہیئے یا مرشد کی کشش کہ حضرتؒ بھی تھوڑے عرصے کے بعد رام پور تشریف لے گئے اور وہیں قیام فرمایا۔ اس طرح تاحیات ظاہری دونوں میں یکجائی رہی حضرت نے جو جو کمالات ظاہری و باطنی بوجہ نسبت توریثی

[۱] امیر شاہ صاحبؒ بڑے مرتبے کے بزرگ تھے۔ شاعر بھی تھے۔ آپ کا شجرۂ طریقت سلسلہ چشتیہ صابریہ میں یوں ہے:۔ حضرت امیر شاہ صاحبؒ کے مرشد حضرت غلام شاہؒ ان کے مرشد حضرت شاہ عبدالکریمؒ ان کے مرشد حضرت شیخ عنایت جیؒ انکے مرشد حضرت شاہ بھیکؒ ان کے مرشد حضرت شاہ ابوالمعالیؒ ان کے مرشد حضرت شیخ داؤدؒ انکے مرشد شیخ محمد صادقؒ ان کے مرشد حضرت شاہ ابوسعیدؒ انکے مرشد حضرت شیخ نظام الدین بلخیؒ انکے مرشد شیخ جلال الدین تھانیسریؒ ان کے مرشد شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ ان کے مرشد شیخ محمد جیؒ ان کے مرشد شیخ عارف جیؒ ان کے مرشد حضرت مخدوم شیخ احمد عبدالحق ردولویؒ ان کے مرشد شیخ جلال الدینؒ ان کے مرشد حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتیؒ اُن کے مرشد حضرت مخدوم شیخ علاؤالدین علی احمد صابرؒ انکے مرشد حضرت بابا فرید گنج شکرؒ ان کے مرشد حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور ان کے مرشد حضرت غریب نواز خواجہ معین الدین چشتی سجزی اجمیریؒ۔

منشی مسعود احمد ضمیر نے حضرتؒ کی زبانی سنا ہوا ایک واقعہ مجھ سے بیان کیا کہ "ایک بار بچپن میں بھائی جان (منشی محمد احمد صاحب صریر بینائی حضرت کے بڑے صاحبزادے) بہت زیادہ علیل ہوئے یہاں تک کہ سب کو ان کی زندگی سے مایوسی ہوگئی۔ ابا جان (حضرتؒ) یہ حالت دیکھ کر امیر شاہ صاحبؒ کے حضور میں تشریف لے گئے اور اپنی پریشانی عرض کی۔ شاہ صاحبؒ نے تھوڑی دیر سکوت کرنے کے بعد فرمایا کہ "میاں امیر تم خدا جانے کیا کہتے ہو۔ تم اس کی حالت نازک بتاتے ہو اور میں اُسے جوان تنومند اور گھوڑے پر سوار دیکھتا ہوں جاؤ اطمینان رکھو اور سب کو مطمئن کردو۔" ابا جان فرماتے تھے کہ اس ارشاد سے میں واقعی مطمئن ہوگیا۔ گھر واپس آیا تو محمد احمد کی حالت سنبھلی ہوئی پائی اور پھر انھیں صحت ہی ہوتی ہوگئی اور شاہ صاحبؒ کا ارشاد حرف بحرف پورا ہوا۔"

مخدوم شاہ مینا صاحبؒ پائے وہ انھیں کے لیے مخصوص تھے مگر کتمان کمال بھی اس درجہ تھا کہ کہیں سے کچھ کھلنے نہ پاتا تھا۔ سچ ہے ؎

مردان رہش میل بہ ہستی نہ کنند | خود بینی و خویشتن پرستی نکنند
آنگہ کہ شراب وصل گیرند بدست | خم خانہ تہی کنند و مستی نکنند

ایک بار کا واقعہ بیان فرماتے تھے کہ ایک راجہ سے اور حضرتؒ کے والد مرحوم سے بہت مراسم تھے۔ اتفاق سے راجا اور رانی میں کچھ شکر رنجی ہوگئی اور رانی روٹھکر اپنے میکے چلی گئیں۔ چونکہ راجا کو رانی سے بہت محبت تھی چند ہی روز میں جدائی شاق گزرنے لگی۔ رانی کو منانے کی بہت کوشش کی مگر وہ کسی طرح نہ آئیں۔ ایک دن راجا حضرتؒ کے مکان پر آئے۔ باتوں باتوں میں سب حال بیان کر کے کہنے لگے کہ ایسی زندگی سے تو مرجانا بہتر ہے۔ حضرتؒ بھی اسوقت موجود تھے ان کے دل پر اسکا بہت اثر ہوا۔ رات کو بعد نماز اپنے وظائف وغیرہ سے فراغت کر کے یہ تصور کر کے بیٹھے کہ رانی الٹی لٹکی ہوئی ہیں اور اسکے نیچے آگ سلگ رہی ہے۔ صبح کو سنا کہ رانی آگئیں۔ جب سبب دریافت کیا گیا تو یہ کھلا کہ رانی صاحبہ کا بیان ہے "رات سے جب تک یہاں نہیں پہنچ لی مجھے معلوم ہوتا تھا آگ میں جل رہی ہوں"۔

اسی طرح رام پور میں امساک باراں سے ایک سال قحط کے آثار تھے تو حضرتؒ نے دو غزلیں کہیں اور ایک دن اپنے دوست شیر زماں صاحب سے لحن کے ساتھ باواز بلند بطور دعا پڑھوائیں۔ گرمیوں کا زمانہ تھا چاندنی رات تھی۔ اسوقت ایک عجیب سماں بندھ گیا اور بارگاہ ایزدی میں غزلیں ایسی مقبول ہوئیں کہ چند گھنٹے بعد بارش ہوئی اور خلق خدا نہال ہوگئی۔ وہ غزلیں یہ تھیں۔

اب تو برسا دے خدا انکی دعا سے پانی | دیر سے مانگ رہے ہیں ترے پیاسے پانی
آب دتا اپنی دکھا دیں ہیں ساون بھادو | موتی برساتا ہوا آئے گھٹا سے پانی
لے چل اب جلد مجھے ہند کے پیاسوں کی طرف | چپکے چپکے یہی کہتا ہے ہوا سے پانی
اشک آنکھوں سے رواں ہوں تو یہ رحمت کا طہور | چاہیے پہلے کہ نہ چھلکائیں یہ کاسے پانی
جوش پر آئے نہ دریائے کرم کیا ممکن | بندے رو رو کے اگر مانگیں خدا سے پانی
خشک سالی کا یہ عالم ہے کہ اطفال نبات | صبح کو مانگتے ہیں روز صبا سے پانی
گرمیاں شاہد رحمت جو دکھا دے اپنی | آگ دوزخ کی بھی ہو جائے حیا سے پانی
لاکھ جانیں ہوں تری شان کرم کے صدقے | ایک چلو ہمیں دریائے عطا سے پانی
کتنے بندے ہیں ترے دھوپ میں جلتے بھنتے | اب برس جائے کسی کی تو دعا سے پانی
کربلا میں جو رہے پیاسے انھیں کا صدقہ | اب چھڑا دے ہمیں اس کرب بلا سے پانی
شوق کی آگ سے جلتے ہوئے دل ہوں ٹھنڈے | آئے محبوب کے انداز و ادا سے پانی
سن لیا جب سے کہ پانی سے ہے ہر شے کی حیات | ناز کرتا ہے ہر اک شاہ و گدا سے پانی

ہم نے پانی سی جو نعمت کی نہ کی قدر امیر
چھپ رہا ابر کے پردے میں حیا سے پانی

یا خدا خلق کو جینے کا سہارا ہو جائے | ابر رحمت کو برسنے کا اشارا ہو جائے
بجلیاں چمکیں فلک پر ہو گھٹاؤں کا ہجوم | بوند جو آئے وہ قسمت کا ستارا ہو جائے
جوش میں ابر کرم آئے تو جل تھل بھر جائیں | کب سے ناکام ہیں اب کام ہمارا ہو جائے
باغ شاداب ہو کھیتی ہو ہری دل ہوں نہال | عیش و آرام سے خلقت کا گزارا ہو جائے
اپنے مخلوق کو تو کال کے پھندے سے نکال | یہ مصیبت نہیں ایسی کہ گوارا ہو جائے

اس تباہی میں ہے تھوڑی سی عنایت ہی بہت ڈوبتے کے لیے تنکے کا سہارا ہو جائے

التجا کرتے ہیں تجھ سے ترے عاجز بندے رحم کو بندہ نوازی کا اشارا ہو جائے

ایک چھینٹا جو پڑے ابر کرم کا تیرے درد دکھ دور ہمارا ابھی سارا ہو جائے

یا نبیؐ تجھ پہ تصدق ترا مداح امیر

اک نظر لطف کی امت پہ خدارا ہو جائے

روشن ضمیری کا یہ عالم تھا کہ ایک دن ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ دوران نماز میں چہرہ سرخ ہو گیا اور کرب و بےچینی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کوئی جاندار کہیں بند ہو گیا ہے۔ تلاش کی گئی تو دیکھا گیا کہ ایک کبوتر نالی میں بند ہو گیا تھا۔

ان واقعات میں بھی اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنے کی امکانی کوشش کی گئی ہے۔

حضرتؒ کی زیارت پہلے پہل غالباً ۱۸۷۸ء میں مجھے نصیب ہوئی جب میں کسی تقریب میں رامپور گیا تھا۔ دوبارہ ۱۸۸۱ء میں قدمبوسی حاصل ہوئی۔ تیسری بار غالباً ۱۸۸۳ء تھا کاکوری (لکھنؤ سے قریب) میں حاضر ہوا تھا۔ اس کے بعد ۱۸۸۹ء میں مجھے بہ اصرار طلب فرمایا اور دفتر امیر اللغات میں پانچ چھ برس تک میں سکرٹیری رہا اور دن رات فیض صحبت سے سعادت کونین حاصل رہی۔

حضرتؒ کشیدہ قامت تھے۔ ہڈی چوڑی۔ رنگ گورا چٹا۔ جسم بھرا بھرا۔ ہنستی پیشانی۔ آنکھیں بڑی نہ تھیں مگر ؎ آفت کی سپیدی تھی قیامت کی سیاہی + نیرنگ دو عالم مجھے دکھلا گئیں آنکھیں۔ نگاہ میں شوخی کے ساتھ تیزی دل میں گھر کر لینے والی تھی۔ سر کے بال کان کی لو تک رہتے تھے۔ داڑھی نہ زیادہ لمبی نہ بہت چھوٹی۔ ایک عجیب نورانی صورت تھی

جو اب دنیا میں نہیں ہے مگر اب بھی آنکھوں میں پھرا کرتی ہے اور سینے میں دل قدمبوسی کیلئے مچل مچل کر رو دیا کرتا ہے۔

لطیفہ:۔ قدیم خیر اندیش وہم نشیں مہدی علی خاں تحویل دار کتب خانہ سرکاری نے جو لمبے تڑنگے موٹے تازے آدمی تھے ایک دن ہنسی ہنسی میں کہا "اب تو آپ میں وہ طاقت نہیں ہے"۔ حضرتؒ نے فوراً ان کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔

نہایت نرم بولی اور بات چیت میں متانت کے ساتھ ایک عجیب شگفتگی اور حلاوت تھی جس سے مخاطب کا دل محظوظ رہتا تھا۔ واقعی منھ سے پھول جھڑتے تھے۔ بس۔ ع۔
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔

سنا ہے کہ جوانی میں حضرتؒ کو خوش لباسی کا بہت شوق رہا اور اس زمانے کی روش کے موافق جوتا بھی گھتیلا پہنتے تھے مگر ان کے بڑھاپے میں جب مجھے زیارت نصیب ہوئی تو میں نے لباس میں سادگی ہی پائی۔ گرمیوں میں قالب پر چڑھی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی، ململ یا باریک تنزیب کا کرتا جس کی آستینیں گرمیوں میں پسینے کے باعث اکثر کہنیوں تک الٹی رہتی تھیں، چھالٹین کا پاجامہ جس کے پائنچے عرض کے ہوتے تھے تنزیب یا اور کسی باریک کپڑے کی اچکن پہنتے تھے۔ سرکار میں جاتے تو عبا اور گرنٹ وغیرہ کی سادی مندیل پہن لیتے تھے۔ تنزیب یا باریک نین سکھ کا رومال کبھی کرتے کی جیب میں اور کبھی ہاتھ میں رہتا تھا۔ منھ پر پسینا نکلتا تو رومال میں اسے جذب کر لیتے۔ جاڑوں میں دوپلی ٹوپی پر ہلکا اونی گلو بند لپیٹے رہتے تھے۔ ۶ر دسمبر ۱۸۹۰ء کو ایک خط مجھے لکھا تھا۔ اس میں تحریر فرماتے ہیں "سر میں باندھنے کے قابل گلو بند متین اور ثقہ رنگ کا میرے لئے اور عمدہ پان چلتے وقت لکھنؤ سے اپنے ساتھ لانا"۔ کرتے پر روئی دار شلوکا اور مشروع پائنگی کا

پاجامہ عرض کا اور زیادہ سردی کے وقت لبادہ بھی پہنتے تھے۔ پانوہیں اکثر سیاہ گرگابی ہوتی تھی۔

لطیفہ:۔ ایک بار جاڑوں میں مجھے اُورکوٹ پہنے دیکھا فرمایا "بیٹا اسکے پہننے سے تو بالکل سردی نہ معلوم ہوتی ہوگی؟" میں نے عرض کیا "جی ہاں۔ کیا حضرت کیلئے بھی بنوایا جائے؟" ارشاد ہوا "ضرور بنواؤ"۔ بہت دبیز عمدہ کشمیرے کا اُورکوٹ تیار کرایا گیا۔ پہنکر بتام لگانے لگے نئے کاج بہت دبیز کپڑا، دقت ہوئی فرمانے لگے۔ "بیٹا! یہ تو ٹھیک نہیں میری تو چٹکیاں دکھیں" خیر بتام لگادیئے گئے۔ پہنکر بیٹھے تو کپڑے پر ہاتھ پھیرا۔ کہا "بیٹا! یہ تو بہت خشن ہے" تھوڑی دیر کے بعد چوکی پر گئے۔ واپس آئے تو فرمایا "ممتاز! یہ کوٹ تو میری جان کیلئے عذاب ہے۔ وہاں پیشاب کا تقاضا یہاں بتام کھولنا اور اس کے دامنوں کا سمیٹنا ایک دشوار کام ہوجاتا ہے۔ میں باز آیا ایسے کپڑے سے۔ کوئی اور پہن ڈالے" منشی لیاقت حسین صاحب (بھتیجے اور داماد بھی) بیٹھے تھے بول اٹھے "عموجان مجھے دیدیجئے" "ہاں بیٹا۔ لے لو" کہہ کر فوراً اُتار دیا۔

دن کو بچوں کے سوا دسترخوان پر گھر کے سب چھوٹے بڑے ہوتے تھے۔ آپکے لئے روے کے باریک چھوٹے چھوٹے پھلکے گرم گرم آتے تھے۔ آپ صرف دو تین پھلکے شوربے میں خوب ڈبو ڈبو کر یا کبابوں کے ساتھ کھاتے اور ایک پیالے میں خوب دٹا ہوا تھوڑا سا دودھ ہوتا اُسے نوش فرمالیتے تھے۔ رات کو غذا اس سے بھی قلیل ہوتی تھی۔ کیونکہ اُسوقت دسترخوان پر دودھ نہیں ہوتا تھا۔ مگر سونے سے قبل روزانہ ایک پیالی میں مغز بادام خوب پسا ہوا جس میں مصری ملی ہوتی تھی اندر سے آتا تھا اُسے آپ کلمے کی اُنگلی سے نکال نکال کر کھالیتے تھے۔ اول بدل کر بھی چیزیں پکتی اور دسترخوان پر آتی تھیں

مگر کبھی یہ نہ معلوم ہوا کہ کس چیز سے شوق تھا یا کون سی شے نامرغوب تھی۔ البتہ ثقیل غذاؤں سے پرہیز کرتے تھے۔ چٹنی اچار مربے مٹھائیاں اس قسم کی ہر چیز برائے نام کھاتے بلکہ اُس کا مزہ چکھ لیتے تھے۔ پانی ٹھنڈا نہ ہوتا تو فرماتے "یہ تو زبان پر رینگتا بھی نہیں" گرمیوں اور برسات میں اگر برف نہ ملتی تو شورے سے پانی ٹھنڈا کیا جاتا تھا۔

لطیفہ:- ایک دن مجھے ہمراہ لیکر "امیر اللغات" کی بابت کچھ مشورہ کرنے جنرل اعظم الدین خاں مرحوم کے پاس گئے۔ بات چیت کر کے رخصت ہونے لگے تو جنرل صاحب نے کہا "منشی صاحب کھانا تیار ہے کچھ کھا لیجئے"۔ حضرتؒ نے عذر کیا۔ جنرل صاحب نے کہا۔ "اچھا تھوڑا دودھ ہی پی لیجئے"۔ حضرتؒ نے ذرا اعتراض کے تیوروں سے کہا "دودھ پینے کے تو اب میرے دن نہیں رہے"۔ وہ سمجھے نہیں اور ان کی طرف بنظر استفسار دیکھا۔ فرمایا "دودھ پینا تو شیرخواروں کے لیے بولا جاتا ہے"۔ جنرل صاحب کچھ کھوئے سے گئے اور پوچھا "پھر کیا کہنا چاہیئے؟" کہا "دودھ کھانا بولتے ہیں"۔ تو جنرل صاحب نے (اپنی لاعلمی کی) معذرت کی۔

ڈبیا میں عمدہ سفید پان کے ہلکے بیڑے اور بٹوے میں چھالیا الائچی تمباکو وغیرہ رہتا تھا تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پان کھاتے تھے اسلئے گھر میں جہاں جا کر بیٹھتے ڈبیا بٹوا لئے جاتے کرتے کی جیب میں سینک کی خلالیں پڑی رہتی تھیں۔ پان کھانے کے بعد کبھی کبھی خلال کر لیتے تھے۔ حقے کا بھی شوق تھا۔ حکیم عابد علی کوثر اور مولوی اعجاز حسن خاں رئیس رسولپور (ضلع مظفر پور) وغیرہ سے فرمائش کر کے تاروں سے بنے ہوئے نیچے منگواتے تھے۔

کوثر سے پہلے فرمائش کی تھی اب ان کو لکھتے ہیں "سٹک اور نیچے تیار ہو کر آپ کے پاس آ گئے۔ اگرچہ میری فرمائش کے موافق نہیں مگر آپ لکھتے ہیں کہ باعتبار بندش اور

کام کی صفائی کے بہت اچھے ہیں۔ خیر جیسے ہیں غنیمت ہیں۔ آپ وقت قصد وطن اپنے ساتھ لائیے اور درب گیج سنگھ کی کوٹھی میں منشی ظہور احمد کے سپرد کر دیجئے۔" اعجاز حسن خاں سے فرمائش کرتے ہیں" تاروں سے بنے ہوئے نیچے جو خاص اُسی ملک میں بنتے ہیں مجھے درکار ہیں اگر آپ مہربانی کر کے بھیجدیں تو باعث منت پذیری ہوگا۔" (خطوط منشی امیر احمد)

گرمیوں میں سٹک فتح پیچ اور لمبی نے کے نیچے۔ تاکہ چلم کی آگ دور رہے اور جاڑوں میں ڈیڑھ خمے عظیم اللہ خانی نیچے کہ چلم کی آگ نزدیک رہے استعمال میں رہتے تھے

اس زمانے میں جامع مسجد کے سامنے چھوٹے نواب والے سرکاری مکانات میں قیام تھا ان میں دیوانخانے اور محلسرا کے علاوہ اوپر بہت بڑے بڑے کمرے تھے جن میں دفتر امیر اللغات تھا۔ کمروں کے بعد بہت لمبا چوڑا صحن تھا اور نیچے بازار کی دکانیں تھیں۔ عسر بول کے باعث بار بار چوکی پر جانے کی حاجت ہوتی تھی۔ اس ضرورت سے دفتر کے قریب ایک کمرے میں، کوٹھے کے صحن میں محلسرا اور دفتر کے بیچ والے کمرے کے پاس (جہاں دن کو آرام فرماتے تھے) اور دو ایک جگہ محلسرا میں چوکی لگی رہتی تھی اور جاڑوں بھر چوکی سے قریب کونڈے میں کوئلے دہکتے رہتے تھے۔

ظہر کے اول وقت میں نماز پڑھکر آرام فرماتے اور اخبار وغیرہ پڑھتے پڑھتے سو جاتے تھے۔ جب میں نے دفتر امیر اللغات میں قیام کیا برسات اور گرمیوں میں خود بھی شب کو باہر ہی آرام فرماتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ نیند آنے کے لیئے قصے کہانی کا سننا ضرور تھا۔ جہاں پلنگ پر آرام کرنے لیٹے بوڑھی ماماؤں میں سے کوئی ایک حاضر ہو کر کہانی کہنے لگی۔ کہانی بھی بڑی ہی مزیدار ہوتی تھی۔ مثلاً "فتح گنج میں شیخ احمد بہت ہی اچھا آدمی رہتا تھا۔ صبح سویرے اٹھ کر مسجد جاتا۔ نمازیوں کے لیے پانی بھرتا۔ نماز کیواسطے

چٹائیاں بچھاتا۔ وضو کر کے اذان دیتا۔ جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا۔ اتنے ہی میں یا اور دو ایک جلوں کے بعد حضرتؒ کو نیند آجاتی تھی اور لطف یہ کہ اسی طرح کی دو ایک کہانیاں تھیں جو روز کہی جاتیں۔ کبھی کبھی جب یہ مامائیں بیمار ہو جاتیں یا رخصت پر ہوتیں تو کسی سے کوئی قصہ پڑھوا کر سنتے اور سو جاتے۔ پھر تہجد کی نماز پڑھکر درود وظائف وغیرہ میں مشغول رہتے۔ کبھی صحت و قوت کمی کرتی تو تہجد پڑھکر سو رہتے اور نماز فجر کے لیے پھر اٹھ بیٹھتے۔

صبح کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھتے ہوئے تشریف لاتے اور ہم لوگوں میں سے جو اسوقت تک سوتا ہوتا اس کی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھتے۔ اللہ اللہ کس شفقت سے نماز پڑھنے کو جگاتے تھے۔

حضرتؒ مجسم اخلاق تھے۔ خدمتگاروں کے بھی نام سے پہلے میاں کا لفظ بڑھا کر بلاتے "میاں واجد علی ذرا یہاں آؤ" گھر میں جو مامائیں نوکر تھیں اُن کے نام کے ساتھ بوا کا لفظ ملا کر بات کہتے "مختار بوا کھانے میں کیا دیر ہے" ملازمین کو آپ کے لفظ سے مخاطب فرماتے "میاں چھٹن پہلے آپ ڈاک لے آیئے" "حسینی بوا کیا آپ نے چوکی پر پانی رکھدیا؟" حتیٰ کہ سلام تک میں سبقت فرماتے۔ عبدالرحمٰن خاں رات کو پہرہ دینے پر ملازم تھے۔ انکی چارپائی دروازے پر پڑی رہتی تھی۔ حضرتؒ جب صبح کو باہر تشریف لاتے تو عبدالرحمٰن خاں مرحوم کا سامنا ہوتا تھا۔ ان کا بیان تھا کہ "میری آرزو رہی اور میں نے بہت کوشش کی کہ منشی صاحبؒ کو پہلے میں سلام کروں لیکن ہمیشہ انھیں کا ہاتھ پہلے اٹھتا تھا" رفتار میں میانہ روی ہوتی تھی سرکار میں یا اور عزیزوں کے مکان پر جاتے۔ راہ میں لوگ صاحب سلامت کرتے۔ حضرتؒ رُک رُک جاتے جواب میں ان سے اچھا سلام کرتے اور مزاج پرسی فرماتے۔ دکاندار اپنی اپنی دکان پر کھڑے ہو کر سلام کرتے آپ سلام کے جواب کے ساتھ ہاتھ کے اشارے سے

ان کی خیریت دریافت فرماتے جاتے۔ غرض رفتار و گفتار میں عادات و اطوار میں نہایت متانت تہذیب اور ایک عجب میرزا منشی تھی کبھی کسی کی برائی ان کی زبان سے نہیں سنی بلکہ کسی سے سننا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ دوسری بات چھیڑ کر ٹال دیتے تھے۔ اخلاق اتنا وسیع تھا کہ مخاطب سمجھتا تھا مجھی پر سب سے زیادہ مہربان ہیں۔

اسکے ساتھ ساتھ خودداری بھی بدرجۂ اتم تھی۔ نواب خلد آشیاں (کلب علی خاں) کے دسترخوان پر منیر۔ عروج جلال وغیرہ کھانے میں شریک ہوتے تھے حضرتؒ سے بارہا خلد آشیاں نے اصرار کیا مگر یہ ہمیشہ خوبصورتی کے ساتھ عذر کر دیتے اور ٹال جاتے تھے۔ ایک دن نواب نے اصرار کے ساتھ یہ بھی کہا کہ "آپ میرے دسترخوان پر کھانا کھانے میں شاید اپنی کسر شان سمجھتے ہیں"۔ سکوت کر کے عرض کیا" یہ چبھتا ہوا فقرہ حضور نے اس لئے کہا کہ میں ڈر کر حضور کے ساتھ کھانا کھا ہی لوں۔ بہت بہتر حضور کی خوشی پوری ہو جائے" غرض کھانا کھا کر باہر نکلے اپنے خدمتگار سے ڈبیا لی اور پان کھا کر پھر اندر گئے۔ خلد آشیاں نے پوچھا۔ "منشی صاحب آپ نے پان کہاں پایا"؟ عرض کیا " پانوں کی ڈبیا میرے ساتھ رہتی ہے"۔ فرمایا "ذرا منگوائیے تو"۔ اتفاق دیکھئے ڈبیا میں وہی ایک پان باقی رہ گیا تھا جو حضرتؒ نے کھا لیا تھا۔ خلد آشیاں نے ڈبیا کھولی تو خالی۔ فرمایا "اس میں تو پان نہیں ہیں"۔ یہاں یہ تفحص بہت ہی گراں گزرا۔ عرض کیا "حضور ایسی ہی باتوں سے تو میں کبھی کھانے میں شریک نہیں ہوا تھا۔ آج مجھے دیر تک حاضر رہنا پڑا اور سب پان کھا لیے وہی ایک باقی رہ گیا ہوگا جو کھانے کے بعد کھا لیا۔ معلوم نہیں آپ کو اسکا تفحص کیوں ہے"۔ خلد آشیاں جو بہت ہی عزیز رکھتے اور ہمیشہ نہایت عزت کرتے تھے، ہنس ہنس کر معذرت کرنے لگے اور یہ اسی تاؤ میں سلام کر کے چلے آئے۔

نواب یوسف علی خاں فردوس مکان ناس لیا کرتے تھے۔ جب شام کو ہوا کھانے جاتے تو بگھی پر اکثر حکیم محمد حسن صاحب مرحوم ہمرکاب ہوتے تھے۔ ناس سونگھ کر نواب صاحب جیسے ہی کھکارتے حکیم صاحب اگالدان اٹھا کر سامنے پیش کر دیتے۔ ایک دن کسی سبب سے حکیم صاحب موجود نہ تھے نواب صاحب نے منشی صاحبؒ سے کہا "چلیے ہوا کھا آئیں"۔ یہ ہمراہ ہو لیے حسب عادت نواب صاحب نے ناس لی اور چاہا کہ منشی صاحبؒ اگالدان اٹھا کر پیش کریں۔ یہ عمداً دوسری طرف دیکھنے لگے۔ نواب صاحب سمجھ گئے اور جھک کر خود اگالدان اٹھا لیا۔

اسی طرح ایک روز نواب کلب علی خاں خلد آشیاں کی خدمت میں حاضر تھے نواب صاحب نے کہا "منشی صاحب۔ ذرا خاصدان سے ایک گلوری تو نکال دیجئے"۔ یہ کچھ سوچ کر خاصدان سے گلوری نکالی تو مگر نواب صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے ہاتھ سے گرا دی۔ نواب صاحب نے فرمایا "یہ کیا؟" عرض کی "حضور مجھے تو اس خدمت کی کبھی عادت نہیں پڑی۔ اس کا سلیقہ نہیں ہے"۔ نواب صاحب سمجھ گئے۔ فرمایا "میاں امیر معاف کرنا بے تکلفی میں مجھے خیال نہیں رہا"۔

ایک بار اودھ کے ایک نامور اور ذی وقار رئیس جو شاعری کا بھی ذوق رکھتے تھے، خلد آشیاں کے مہمان تھے۔ جب وہ تشریف لاتے تو چاندی کی ایک کرسی ان کے لیئے نواب صاحب کے پلنگ کے قریب بچھا دی جاتی۔ اور لوگ فرش پر بیٹھا کرتے تھے۔ حضرتؒ کو یہ معلوم ہوا تو اس خیال سے کہ رئیس موصوف شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے ہیں، اسلئے ممکن ہے کہ ان کی موجودگی میں میری بھی طلبی ہو خلد آشیاں سے عرض کیا کہ "انکی موجودگی میں مجھے نہ طلب فرمایا جائے"۔ نواب صاحب نے پوچھا "کیوں"؟ عرض کیا۔

"حضور کا تو میں نمک خوار ہوں آپ کے سامنے فرش پر بیٹھنے میں مجھے تکلف نہیں ہو سکتا لیکن رئیس موصوف سے میرے عزیزانہ اور برادرانہ تعلقات ہیں ان کے سامنے مجھے فرش پر بیٹھنے میں تکلف ہوگا"۔ خلد آشیاں نے اسوقت تو فرما دیا "اچھا" لیکن دوسرے ہی دن رئیس موصوف کی موجودگی میں حضرتؒ کو طلب فرمایا۔ مجبور تھے، کیا کرتے، گئے۔ لیکن وہاں پہنچتے ہی دیکھا کہ رئیس موصوف کی کرسی کے برابر ایک اور گنگا جمنی کرسی خالی موجود ہے جس پر بیٹھنے کا اشارا فرمایا گیا۔

اعلیٰ حضرت نواب سید محمد حامد علی خاں بہادر بالقابہ مسند نشین ہوئے۔ ان کے حضور میں حضرتؒ نے دو ایک بار درخواست ملاقات بھیجی تاکہ اپنا کچھ حال عرض کریں۔ نواب صاحب کی نوجوانی کا زمانہ تھا۔ ع نوجوان لوگ کیا نہیں کرتے۔ کسی سبب سے التفات نہ فرمایا تو ایک دن مستعد ہو کر گئے اور تاک لگا کر بیٹھے۔ جیسے ہی نواب صاحب برآمد ہو کر چلے (رخ ان کی طرف نہ تھا) لپک کر نواب صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا۔ نواب صاحب دیکھ کر ہنس پڑے اور فرمایا "کہیئے کہیئے منشی صاحب کیا ہے"۔ عرض کیا "بچپن میں تو حضور کو میرا اتنا خیال تھا کہ نواب ناصر علی خاں (چھوٹے بھائی) سے کہتے تھے۔ چپ رہو چپ رہو شور نہ کرو بڑے ابا (خلد آشیاں) کے استاد بیٹھے ہیں اور آج میری درخواست ملاقات بھی قبول نہیں ہوتی"۔ نواب صاحب نے فرمایا "منشی صاحب کیا کروں بالکل فرصت نہیں ملتی"۔ پھر جو کچھ کہنا تھا کہکر چلے آئے۔ اُس دن سے نواب صاحب بہت التفات فرمانے لگے اور روز بروز الطاف بڑھتے ہی گئے۔

صلح کل ان کا مشرب تھا کبھی کسی جھگڑے بکھیڑے بحث مباحثے میں پڑنا پسند نہ کرتے تھے بلکہ عزیزوں شاگردوں کو بھی اس سے مانع رہتے اور ناخوش ہوتے تھے۔

ایک بار رامپور کے مشاعرے میں طرح تھی "تھوڑی سی راہ قرب الٰہی میں رہ گئی"۔ اس زمین کی غزل میں حضرت کا ایک شعر تھا ؎ ابلیس اُدھر جھکا تو مرا دل اِدھر جھکا + دو ہاتھ چلکے رہزن وراہی میں رہ گئی۔ امیرؔ کے شاگردوں تک یہ بات پہنچی کہ جناب داغؔ کو اس پر اعتراض ہے وہ کہتے ہیں "رہ گئے" (یائے مجہول) چاہیئے۔ یہاں اسکا جواب لکھا گیا اسکے ساتھ ہی جناب داغؔ کی اسی زمین کی غزل کے بعض شعروں پر اعتراض لکھے گئے۔ یہ مضمون مطبع میں پتھر پر پہنچ چکا تھا۔ اتفاق سے حضرتؒ سرکار سے واپس آتے ہوئے اُسی وقت مطبع میں پہنچ گئے۔ پوچھا "آج کیا ہے جو تم سب لوگ یہاں جمع ہو"۔ جب یہ کارگزاری معلوم ہوئی تو بہت ناخوش ہوئے اور اُسی وقت پتھر دھلوا ڈالا۔

امیر اللغات کا پہلا حصہ شائع ہوا تو اکمل الاخبار میں اس قسم کے مضمون چھپنے لگے کہ "ارمغان دہلی"، "فرہنگ آصفیہ" کی نقل ہے۔ انھیں دنوں کسی صاحب نے ایکبار اس اخبار میں یہ بھی لکھا کہ "ایک محفل میں طوائف امیرؔ کی یہ غزل گاتی تھی ؎ شمشیر ہے سناں ہے کسے دوں کسے نہ دوں + اک جانِ ناتواں ہے کسے دوں کسے نہ دوں۔ جب ردیف پر طوائف پہنچتی تھی تو ساری محفل بے اختیار ہنس پڑتی تھی"۔ اس کے جواب میں کسی نے فصیح الملک مرحوم کی یہ غزل لکھی ؎ آزمایا ہے مدام آپ کو بس بس اجی بس + دونوں ہاتھوں سے سلام آپ کو بس بس اجی بس۔ کہیں وہ پرچہ حضرتؒ کی نظر سے گزر گیا۔ اس پر بہت ہی ناراض ہوئے اور فرمایا "مجھے یہ تو تو میں میں کسی حال میں پسند نہیں۔ میری نسبت یا میرے کلام پر جس کا جو دل چاہے لکھے۔ جواب دینے کی ضرورت نہیں"۔

ایک خط میں حکیم عابد علی صاحب کوثر کو لکھتے ہیں "خانہ کعبہ کا ترجمہ کعبے کا گھر بالکل

مستعمل نہیں اور نہایت برا معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خانۂ کعبہ ترکیب اضافی نہیں ہے۔ ترکیب توصیفی یا بدل مبدل منہ ہے پھر کعبے کا گھر کیونکر درست ہوگا۔ آپ کسی سے تو لڑئیے نہیں اور سمجھیے کہ غلط ہے۔ ہاں معتبرین کے کلام میں نکلے تو خیر۔ اگر کوئی آپ سے پوچھتا ہے تو سمجھا دیجیے کہ میرا تو یہ خیال ہے۔ پھر وہ تاویلات کرے تو چپ ہو رہیے۔"

سید زاہد حسین صاحب زاہد کو لکھا ہے "اخباروں میں کبھی کبھی کسی مہربان کی مہربانی سے جو کچھ چھپتا ہے میں نہ خود کبھی اسکا جواب دیتا ہوں نہ کسی دوست نہ کسی شاگرد کو اجازت دیتا ہوں۔ میرا مشرب یہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے اگر وہ سچ اور صحیح ہے تو منفعل ہونا چاہیئے اور آئندہ احتراز کرنا چاہیئے اور اگر تعصب سے غلط بات لکھی ہے تو صبر کرنا چاہیئے رد و قدح میں طول عمل ہوگا۔"

نفسانیت اور سخن پروری جانتے ہی نہ تھے اگر کبھی کوئی شاگرد بھی آپکے شعر میں شبہ کرکے کچھ عرض کرتا تو محض بنظر احتیاط رد و بدل فرما دیتے۔ مولوی احسن اللہ خاں ثاقب کو لکھتے ہیں "شگفا بند بسکوں کاف فارسی کی سند تلاش کرنے کا خیال رہا مگر ہنوز نہ ملی تھی کہ "شحنۂ ہند" آیا اور بدلا ہوا مصرع پایا۔ آپ نے بہت ہی خوب کیا کہ مصرع بدل دیا۔ خدا جانے سند ملتی نہ ملتی تتبع کامل کی فرصت نہیں ہے۔ میں نے دیکھا ضرور ہے مگر یاد نہیں کہاں دیکھا ہے خیر اب وہ قصہ ہی مٹا۔ احتیاط اچھی ہوتی ہے۔ شبہے کی بات سے جہانتک ممکن ہو بچنا ہی چاہیئے۔" (خطوط منشی امیر احمدؒ)

طبیعت انصاف پسند تھی اور امر حق کے ہمیشہ طرفدار رہتے۔ نواب کلب علی خاں خلد آشیاں کی ولی عہدی کا زمانہ تھا اور حضرت حاکم عدالت دیوانی تھے۔ ولیعہد بہادر کے باورچی کا ایک مقدمہ ان کی عدالت میں پیش تھا۔ ولیعہد بہادر نے باورچی کی بار بار سفارش کی یہاں تک کہ مفتی محمد سعد اللہ صاحب کی زبانی جو حاکم مرافعہ اور حضرتؒ کے استاد تھے،

یہ کہلا بھیجا کہ میرا متوسل ہارنے نہ پائے ورنہ میں ناخوش ہوں گا آخر یہ دور بدلے گا۔ مگر اس پر بھی انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ مقدمے کا فیصلہ باورچی کے خلاف ہوا۔

۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۶ء تک میں نے دیکھا کہ اپنے شوق سے کچھ کہنے کا بہت ہی کم اتفاق ہوتا تھا۔ اکثر کسی عزیز یا شاگرد وغیرہ کے اصرار سے مجبور ہو کر یا بحکم ضرورت کچھ کہتے تھے۔ اُن دنوں میں غزل کہنے کا طریقہ میں نے یہ دیکھا کہ جب کچھ کہنا ہوتا تو پہلے اس زمین کو اپنے "دماغ میں پھراتے" (یہ الفاظ خاص زبان مبارک کے ہیں) جب طبیعت اس طرف متوجہ ہو جاتی تو دفتر ہی میں ہم لوگوں کے پاس فرش پر بیٹھ جاتے۔ فرماتے "ہاں بیٹا ممتاز"! یا "میاں وسیم"! یا "ہاں میاں جلیل"! (جس کو لغت کے کام میں اسوقت مصروف نہ دیکھتے) "غزل کہوالو" کوئی قافیہ بتایا جاتا آپ اس میں شعر لکھانا شروع کرتے۔ ایک کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ شعر کہے ہوئے یاد ہیں۔ جب تک یہ نہ کہا جاتا کہ حضرت اس قافیے میں اب تو بہت اچھے اچھے شعر ہو گئے تب تک اُسی قافیے میں کہتے چلے جاتے۔ یہ دیکھ کر ایک بار میں نے عرض کیا کہ حضرت کو شاعری سے نفرت سی ہو گئی ہے مگر مشق کتنی بڑھی ہوئی ہے۔ فرمایا میری مشق ہی کیا مشق تو منشی صاحب (آسیر) کی تھی پھر استاد کی مشق سخن کے دو چار واقعے بیان فرمائے۔

نثار حسین نثار مرحوم کے اصرار سے پیام یار کے لیے اس زمین میں "حال اچھا ہے خیال اچھا ہے" غزل کہنے لگے جب حسب معمول "حال" کے قافیے میں شعر کہنا شروع کیا اور کئی شعر کہہ لئے میں نے عرض کیا "حضرت اس قافیے میں تو اچھے اچھے شعر ہو گئے۔ اب دوسرے قافیے میں شعر کہئے" فرمایا "کیا کہتے ہو ممتاز ہائے وہ بات کہاں سے ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق + وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔ (غالب)

میرا دل تو یہی چاہا کرتا تھا کم سے کم ایک غزل روز حضرتؒ کہہ لیا کریں مگر امیر اللغات کی تالیف میں انہماک اور شاعری کی طرف سے بے توجہی ہونے سے کچھ عرض کرتے ہوئے جی ڈرا کرتا تھا۔ ایک دن یہ بات خیال میں آئی کہ کسی استاد کی عمدہ غزل کا ذکر کر کے حضرتؒ کے دل میں جوش اور لاگ پیدا کرنا چاہیئے تب تو غزل کہیں گے۔ اُسی روز جب حسب معمول دفتر میں تشریف لائے تو پہلے لغت میں اسناد و امثال کا ذکر چھیڑ کر رفتہ رفتہ میں مطلب پر آیا اور عرض کیا "کل اتفاق سے حضرت داغ کے دوسرے دیوان میں یہ غزل میں نے دیکھی ؎ بتانِ ماہ وش اجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں ٭ کہ جس کی جان جاتی ہے اُسی کے دل میں رہتے ہیں۔ کیسے اچھے اچھے شعر کہے ہیں آپ بھی اس زمین میں غزل کہیئے"۔ بولے "دیکھیں کیسی غزل ہے"۔ میں نے دیوان میں غزل نکالکر پیش کی۔ پوری غزل دیکھکر فرمایا "بیٹا غزل اس سے اچھی نہو تو اسکے لگ بھگ تو ہو ورنہ غزل کہنے سے کیا حاصل"۔

ایک بار "ریاض الاخبار" یا کسی اور پرچے میں نواب فصیح الملک مرحوم کی غزل چھپی جس کا یہ مقطع ہے ؎ نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدو ٭ کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے۔ نثار مرحوم تو اس تاک میں رہتے ہی تھے "پیام یار" میں یہی طرح کر دی اور حضرتؒ سے بہت اصرار کے ساتھ غزل مانگی۔ دو چار دن کے بعد میں نے یاد دلایا تو وہ پرچہ نکلوا کر غزل دیکھی۔ فرمایا "داغ نے زمین نکالی اور جتنا پیمانہ تھا غزل کہہ لی اب اس زمین میں غزل کہنا بیکار ہے"۔ غالباً "پیام یار" کے لیئے یہ غزل کہہ رہے تھے ؎ کہتے ہیں مجھ سے کہ مجھ پر ہے یہ تہمت کیسی ٭ دل میں تیرے ہے تو ظالم مری حسرت کیسی۔ فصیح الملک مرحوم کا یہ شعر پڑھا ؎ عکس بھی آئینے میں چار گھڑی بعد آیا ٭ بڑھ گئی حد سے سوا ان کی نزاکت کیسی۔ اور فرمایا "اس زمین میں نزاکت کا قافیہ داغ کا حصہ ہو گیا"۔ فرماتے ہیں ؎

اپنے مضمون تو پسند آتے ہیں عالم کو امیرؔ ÷ ہے وہ شاعر جو کرے معنیٔ بیگانہ پسند۔

سنہ ۱۸۹۴ء ختم پر تھا بعض عزیزوں کی دائمی جدائی سے میرا دل مٹی اور دماغ بیکار ہو رہا تھا اور میں مجبوری حسرت کے ساتھ حضرتؒ کے قدموں سے جدا ہونے والا تھا۔ انھیں دنوں میں صنم خانۂ عشق (دوسرا عاشقانہ دیوان) کی ترتیب ہو رہی تھی۔ گوہر انتخاب (مفردات کا عاشقانہ دیوان) میں یہ پانچ شعر میری نظر سے گزرے ؎

بالائے آسماں تھے ہم عرش آشیاں تھے ۔۔۔ کوئی نہ تھا وہاں تھے اب کیا کہیں کہاں تھے
خاموش ہیں لحد میں جو لوگ خوش بیاں تھے ۔۔۔ غنچوں کے وہ دہن ہیں بلبل کی جو زباں تھے
دیکھا خزاں میں ہم نے بلبل کے آشیاں کو ۔۔۔ دو چار پر شکستہ دو چار استخواں تھے
کمزور پا کے ہم کو کیا بل کی لے رہے ہو ۔۔۔ ہم بھی تو نوجوانو آخر کبھی جواں تھے
پہنچے جو ہم عدم کو اہل عدم یہ بولے ۔۔۔ مدت کے بعد آئے اتنے دنوں کہاں تھے

میں نے عرض کی "کچھ شعر اور کہہ کر غزل پوری کر دیجئے تو صنم خانے میں داخل ہو جائے"۔ فرمایا "جوانی میں تو پوری غزل کہی تھی مگر اور شعر یاد نہ آئے اب کیا کہوں گا۔ سحرؔ[1] کی غزل ایک خاص رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے" اور دو تین شعر اُن کے سنائے۔ کچھ شعر سحرؔ کی غزل کے یہ ہیں ؎

گو زار و ناتواں تھے لیکن انھیں گراں تھے ۔۔۔ اک مشت استخواں تھے اور لاکھ امتحاں تھے
جیتے جی مہرباں تھے دو قالب ایک جاں تھے ۔۔۔ جب مر گئے تو لاکھوں قرآن درمیاں تھے
آگے بھی ناتواں تھے شل کمر نہاں تھے ۔۔۔ اب کے حساب لیکن ان روزوں پہلواں تھے
قدسی سرشت ہیں ہم ظاہر میں زشت ہیں ہم ۔۔۔ اہل بہشت ہیں ہم اب کیا کہیں کہاں تھے

[1] شیخ امان علی سحرؔ مرحوم

صحبت پری وشوں کی مرغوب ہے ازل سے
خلد بریں میں جلسے حوروں کے درمیاں تھے

ہے یہ سرائے دوراں کیسے سفر کا ساماں
جانا وہیں ہے جاناں جو ہے وطن جہاں تھے

گھر دل میں کر کے دیکھا پھر اصل غیر نکلی
اللہ اکبر اے بت کیا کیا تمھیں گماں تھے

اہل عدم عدم میں پوچھیں سگے حال ہستی
دیکھا تھا خواب سا کچھ دو دن کے میہماں تھے

بوڑھے ہوئے تو کیا کیا یاد آتی ہے جوانی
پیری کی آرزو تھی جن روز دن میں جواں تھے

تیر دعائے مضطر تا عرش پہنچا کیونکر
یہ تو سحر برابر سات آٹھ آسماں تھے

مجھے خوب یاد ہے کہ سحر کا دوسرا مطلع اور مقطع دو دو تین تین بار مزے سے لے کر پڑھا تھا جس سے اُن کے اصلی مذاق سخن کا پتا چلتا ہے۔ دیکھئے "اب کیا کہیں کہاں تھے" دونوں استادوں کے یہاں ہے مگر امیرؔ نے تیسرا ٹکڑا ایسا بہم پہنچایا ہے کہ سحرؔ سے آگے نکل گئے ہیں۔

لیکن اس انصاف پسندی کے ساتھ یہ بھی تھا کہ جس زمین میں غزل کہتے (بشرط گنجایش) دوسرے کی غزل مٹا کے چھوڑتے۔ یہاں تک کہ شاگرد کی بھی غزل یا شعر اس سے نہ بچتا تھا۔ ۱۸۹۱ء کا وہ زمانہ تھا کہ رام پور میں منشی صاحبؒ۔ منشی امیر اللہ تسلیم مرحوم اور آغا میرزا شاغل مغفور (برادر نواب فصیح الملک مرحوم) کے سوا استادوں میں کوئی نہ تھا۔ داغ۔ جلال۔ شاغل اور تسلیم کے تلامذہ نے باہم مشورہ کر کے ایک ماہوار مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ ہم لوگوں سے بھی شرکت کے لیے اصرار کیا۔ "امیر اللغات" کے کام میں ہرج ہونے کے خیال سے کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ عرض کر کے غزل کہنے اور شریک مشاعرہ ہونے کی اجازت حاصل کیجائے۔ سب نے مجھی کو آگے کر دیا۔ غرض حضرتؒ نے جو ہمیشہ جائز درخواست کو امکان بھر منظور فرماتے تھے اجازت دی۔ باری باری سے طرح دیجانے لگی۔ مشاعرے ہونے لگے

جن میں تسلیم مرحوم اور شاغل مرحوم بھی غزل کہتے اور شرکت فرماکر مشاعرے کو رونق بخشتے تھے۔ایک مشاعرے کے لیے طرح دینے کی باری تلامذہ امیرؔ کی تھی۔باہم طرح میں اختلاف ہوا۔آخر کار حضرتؒ سے عرض کیا گیا۔فرمایا کہ میں طرح خود تو نہ تجویز کروں گا مگر فیصلہ کیے دیتا ہوں منشی صاحب (اسیر مرحوم) کا دیوان لاؤ۔دیوان آیا تو آپ نے اسکو کھولدیا۔اُس صفحے میں، ملال کے، کمال کے، اس زمین کی غزل نکلی اور یہی طرح ہوگئی۔میں نے دم نہ مارا۔زمین بہت پامال تھی، جی پھیکا ہوگیا اور ارادہ کرلیا کہ غزل نہ کہوں گا۔چند روز کے بعد آثر اور رازؔ وغیرہ نے جو دفتر میں محرر تھے ذکر کیا کہ احسانؔ (تلمیذ رشید فصیح الملک مرحوم) کہتے ہیں اب کے میں نے دو غزلیں کہی ہیں۔ایک لکھنؤ والوں کے رنگ میں اور دوسری دلّی والوں کے رنگ میں۔خیر یہ بھی سُن لیا۔اب مشاعرے کو شاید چار پانچ دن باقی رہگئے تھے۔اصلاح کے لیے میں نے غزل پیش نہیں کی یا قراین سے کچھ خیال ہوا۔میں دوسرے کمرے میں تھا حضرت جلیلؔ (نواب جلیل القدر فصاحت جنگ صاحب) سے پوچھا "کیا ممتاز ابھی غزل کہہ رہے ہیں"؟ انھوں نے کہا حضرت اب کے تو بھائی صاحب[۱] نے اب تک غزل نہیں کہی ہے"۔فرمایا "کیوں؟" کہا "وہ کہتے ہیں زمین بہت پامال ہے"۔یہ سنکر مجھے آواز دی "میاں آہ"۔سنتے ہی میں چونکا خدا خیر کرے آج میں اسطرح کیوں مخاطب کیا گیا اور حاضر ہوکر سامنے مودب بیٹھ گیا۔پوچھا "تم نے غزل کہی"؟ میں نے عرض کی "جی نہیں"۔"کیوں"؟ "زمین بہت پامال ہے"۔بس ایک بار تیوریاں چڑھ گئیں چہرے پر سرخی جھلکی اور ناخوشی کے لہجے میں فرمایا "یہ کیا فضول عذر ہے۔جب طرح ہوگئی تو یا غزل کہو یا آج سے شاعری سے استعفا دیدو"۔میں نے یہ رنگ اُسی دن دیکھا

[۱] میرے ماموں کے بچے مجھے بھائی صاحب کہتے تھے تو تمام دفتر بھائی صاحب کہنے لگا تھا بلکہ خوش طبعی سے خود حضرتؒ بھی کبھی کبھی دفتر والوں سے بھائی صاحب کہکے مجھے پوچھتے یا کوئی بات میرے متعلق کہتے تھے۔

اور ڈر گیا۔ کچھ عرض کرنے کی کیا مجال تھی۔ عرض کی "حضرت کا ارشاد ہے تو غزل کہوں گا"۔ فرمایا "کہوں گا نہیں۔ کہو اور محنت سے غزل کہو"۔ غرض دن کو تو فرصت ملتی نہ تھی دو تین راتوں کو محنت سے میں نے غزل کہی اور اصلاح کے لیے پیش کی۔ دیکھ کر خوش ہوئے اور مجھے ایک دولت مل گئی حاصل کلام اس غزل میں میرا ایک شعر تھا ۔ مجھ سے بگڑ گئی تو پھر اسکو بھی جانے دو + تم کون رکھنے والے ہو میرے ملال کے۔ اس شعر کا دفتر میں چرچا ہوا۔ دوسرے دن حضرتؒ نے اپنا یہ شعر پڑھا ۔ میرے تمھارے بیچ میں آتا ہے بار بار + کمبخت پانو بھی نہیں تھکتے ملال کے۔ میں نے عرض کیا "حضرت یہ کیا ستم ہے۔ آپ نے میرے شعر کو بھی مٹا دیا"۔ مسکرا کر فرمانے لگے "بیٹا اس میں رعایت اور مروت کیسی۔ تم میرے شعر کو مٹاؤ میں تمھارے شعر کو مٹاؤں"۔ پھر اپنا دوغزلہ انتخاب کے لیئے دیا تو میں نے دیکھا میری غزل پر پانی پھر گیا تھا۔ اس میں یہ نکتہ تھا اور یہ سب کچھ صرف اسلئے ہوا کہ پامال زمین دیکھ کر غزل کہنے سے باز نہ رہنا چاہیئے محنت کرنے سے اپنی بساط کے موافق بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ ع‌ہ

حضرت ریاضؔ قدرتًا شوخ طبیعت ہونے کے باعث حضرتؒ کی خدمت میں بھی گستاخ تھے اور یہ بھی اپنی شفقت و محبت سے اُن کو بہت چاہتے اور ان کا خیال کرتے تھے۔ ناسخؔ مرحوم کی یہ غزل ۔ یہ نور ہے روئے مہ جبیں کا کہ ہو خجل چاند چودھویں کا الخ۔ خصوصًا اسکا یہ شعر ۔ یہ ساعدوں کا ہے اسکی عالم کہ جس نے دیکھا ہوا وہ بے دم + نیام تیغ قضائے مبرم لقب ہے مرحوم

ع‌ہ لطیفہ: بعض شاعروں میں سے ایک مشاعرہ عید کے دن قرار پایا اور۔ ع۔ عید کا دن ہے مری جان سنورنے کیلئے۔ طرح تھی نصیح الملک کی غزل بھی حیدرآباد سے آئی تھی اور شاغل مرحوم نے مشاعرے میں سنائی تھی۔ پہلا مصرع بنیاد ہے۔ تیسرے چوتھے دیوان میں یہ غزل ملی۔ دوسرا مصرع تھا۔ع۔ برسوں گزرینگے ترے دل سے اترنے کیلئے۔ صبح کو جناب تسلیمؔ نے اپنے شاگردوں سے کہا۔ "کیلئے" کی جگہ "ہیں" چاہیئے کیوں! پرانے کھوسٹ دلپنے کو ہنے بلبل ہندوستان داغؔ کی سنگرڈی کیسی کھینچی!!

قاتل کی آستیں کا۔ دیکھ کر ریاضؔ نے حضرتؒ سے بھی اس زمین میں غزل کہنے کو عرض کیا۔ آپ نے غزل دیکھ کر فرمایا کہ اس زمین میں اب فکر کرنا بیکار ہے لیکن ریاضؔ کب ماننے والے تھے۔ بار بار موقع پاکر اصرار کرتے رہے۔ حضرتؒ ٹالتے رہے۔ ریاضؔ نے جب یہ دیکھا کہ یوں کام نہیں چلتا تو ایک دن شب کو جب حضرتؒ تنہا لیٹے ہوئے تھے، سر میں تیل دبایا جا رہا تھا، موقع پاکر پھر عرض کیا۔ آپ نے پھر عذر فرمایا اور سمجھایا تو انھوں نے ناز کر کے عرض کیا "سب ارشاد بجا ہے لیکن میری خوشی اور تمنا بھی تو کوئی چیز ہے۔ میں نے تو آج یہ عہد کر لیا ہے کہ آپ جب تک اس زمین میں غزل نہ کہدیں گے میں کھانا نہ کھاؤں گا"۔ ریاضؔ کا یہ فقرہ کارگر ہو گیا اور حضرتؒ اپنی نیک نفسی سے سمجھے کہ ریاضؔ واقعی ایسا ہی کریں گے۔ فرمایا "میاں ریاضؔ تم بہت پریشان کرتے ہو"۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا "اچھا کاغذ لاؤ اور غزل لکھو"۔ ریاضؔ خوش خوش غزل لکھنے بیٹھے۔ پوری غزل ختم ہو گئی لیکن آستیں کے قافیے کا کوئی شعر نہیں لکھوایا۔ مقطع لکھوانے کے بعد فرمایا "لو تمھاری خوشی ہو گئی۔ اب تو کھانا کھاؤ گے"۔ ریاضؔ بولے "ابھی کہاں آستیں کے قافیے کا تو کوئی شعر ہی نہیں ہوا جس کے لئے میں نے غزل کہوائی"۔ فرمایا "اب زیادہ پریشان نہ کرو۔ یہ قافیہ ناسخؔ کے حصے کا ہو گیا"۔ ریاضؔ نے کہا "میں تو کھانا اسی وقت کھاؤں گا جب آپ آستیں کا قافیہ بھی کہدیں گے"۔ حضرتؒ "تم بہت زیادہ پریشان کرتے ہو" کہکر پھر خاموش ہو گئے اور کچھ دیر کے بعد یہ شعر ے قریب ہے یار روز محشر چھپے گا کشتوں کا قتل کیونکر + جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا۔ لکھوایا۔ ریاضؔ مارے خوشی کے اچھل پڑے۔ اسی وقت کئی چٹوں پر یہ شعر لکھ کر اس وقت کے اساتذہ کے پاس بھیجا اور اُن سب نے جواب میں اسکا اعتراف فرمایا کہ ناسخؔ مرحوم کے اس شعر کے بعد ایسا شعر کہنا یہ حضرت امیرؔ ہی کا حصہ اور کام تھا۔

اُس وقت تو ریاض کی خوشی پوری ہو گئی لیکن پھر حضرتؒ کی طبیعت کو لاگ ہو گئی اور جوش آیا تو اس زمین میں دو غزلہ کہہ ڈالا جس میں ایک سے ایک بہتر شعر ہے اور آستیں کے قافیے میں بھی تین شعر اور کہے۔ ناسخ مرحوم کی پوری غزل اور امیرؒ کے دو غزلے کے چند اشعار[ع٥] بغرض دلچسپی ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔

ناسخ

یہ نور ہے روئے مہ جبیں کا کہ ہو خجل چاند چودھویں کا
جو حلقہ ہے زلف عنبریں کا وہ ایک نافہ ہے مشک چیں کا

زبسکہ وصف دہان شیریں ہے ورد زبان شیریں
بدن میں جب تک ہے جان شیریں مزا دہن میں ہے انگبیں کا

وہ چشم فتاں ہے غیرت مل وہ زلف پیچاں ہے رشک سنبل
عذار میں ہے شباہت گل بدن میں عالم ہے یاسمیں کا

یہ جوش پر یاں ہے اشک کا یم کہ ساتوں دریا ہیں قطرے سے کم
جسے کہ کہتے ہیں سب جہنم شرر ہے اک آہ آتشیں کا

اگر ہو پھاہا پر سمند یقیں ہے ہو خاک دم میں جل کر
سنا جو ہو آفتاب محشر کھرنڈ ہے داغ آتشیں کا

زبسکہ ہے جوش داغ ہجراں ہوا مرا سینہ باغ رضواں
برائے گلگشت جائے غلماں خیال پھرتا ہے اک حسیں کا

یہ ساعدوں کا ہے اسکے عالم کہ جس نے دیکھا ہوا وہ بیدم

امیرؒ

ہوا جو پیوند میں زمیں کا تو دل ہوا شاد مجھ حزیں کا
بس اب ارادہ نہیں کہیں کا کہ رہنے والا ہوں میں یہیں کا

کیا تھا کیوں ادعائے باطل ہوا تھا اس تل سے کیوں مقابل
سزا ملی ہو گیا سیہ دل جو مشک نافہ غزال چیں کا

غم محبت ہے جسکا مطلب کدورت اس کی ہو عیاں کب
کہ مئے سے جب تک ہے خم لبالب پتا کہاں درد تہ نشیں کا

بڑھے سلیماں کے جتنے رتبے تمھاری الفت کے تھے کرشمے
یہ نقش جب دلمیں جمکے بیٹھے بلند ہو نام اس نگیں کا

کہاں کا نالہ کہاں کا شیون سنائے قاتل ہے وقت مردن
قلم ہوئی ہے بدن سے گردن یہاں پہ نعرہ ہے آفریں کا

قریب ہے یار روز محشر چھپے گا کشتوں کا قتل کیونکر
جو چپ رہیگی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا۔

لکھا جو وصف ایک گلبدن کا تو رنگ پیدا ہوا چمن کا

ع٥ پورا دو غزلہ مراۃ الغیب میں موجود ہے۔

نیام تیغ قضائے مبرم لقب ہے قاتل کی آستیں کا
بُرا ہو بد بخت عاشقی کا نہ دیں ہو برباد یوں کسی کا
بنا ہے عشق بتاں کا ٹیکا نشان سجدہ مری جبیں کا
طمع ہے انصاف دوستاں سے کہ اتنا فرمائیں سب زباں سے
کیا ہے ناسخ نے آسماں سے بلند تر رتبہ اس زمیں کا

جو صفحہ ہے برگ یاسمن کا تو خامہ ہے شاخ یاسمیں کا
خدا سے جبتک نہو شناسا حریم دل کا ہے شوق بیجا
مکان کا تب پتا ملے گا کہ کچھ پتا یاد ہو مکیں کا
ملا ہے جنکو دل مصفےٰ برے کو بھی دیکھتے ہیں اچھا
پڑے گا عکس آئنے میں سیدھا ہزار الٹا ہو خط نگیں کا
کس آستانے پہ جا پڑا ہوں کہاں الٰہی میں جبہ سا ہوں
کہ سر نہ اٹھے ہزار چاہوں لیٔے لبط ہے سجدہ جبیں کا
کہاں کا کعبہ ہے دیر کیسا بتاؤ کوچے کا اسکے رستہ
میں پوچھتا ہوں پتا کہیں کا نشان دیتے ہو تم کہیں کا
سفر مبارک ہو آخرت کا بخیر انجام ہو خدا یا
جو گھر سے نکلے مرا جنازہ تو سامنا ہو کسی حسیں کا
جو شعلہ بالائے طور چمکا جھپک گئی جس سے چشم موسےٰ
بجھا ہوا تھا کوئی شرارہ تمھارے رخسار آتشیں کا
حسین جو میٹھی زباں سے مانگیں تو جان شیریں ہے نذر لیلیں
ہنسی خوشی سے جو زہر بھی دیں مزہ ملے مجکو انگبیں کا
عجب ہے آئینے کا مقدر کہ عکس افگن ہے چشم دلبر
قدم نکالا نہ گھر سے باہر شکار کھیلا غزال چیں کا
امیر دیکھا جو اسکا نقشہ تو نقش یوسف کا دل سے اترا
کہ نقش ثانی کے آگے ہوتا فروغ کیا نقش اولیں کا

ناواقف حضرات زمانے کی روش پر خیال کرکے سمجھتے ہیں کہ امیرؔ کو اپنے معاصرین سے چشمک رہتی ہوگی اور ان کے ساتھ اخلاص نہو گا۔ ایک مولوی صاحب نے ایسا ہی کچھ لکھ کر دریافت کیا ہے۔ اسکے جواب میں منشی محمد احمد صاحب صریرؔ (حضرتؒ کے خلف اکبر استاد اعلیٰ حضرت نواب صاحب بہادر رام پور بالقابہ) مختصر طور پر ان کو لکھتے ہیں "آپنے مجھ سے پوچھا ہے کہ ان کے تعلقات داؔغ مرحوم اور جلاؔل مغفور سے کیسے تھے۔ بندہ پرور وہ ابتدائے عمر سے صوفی تھے۔ دنیا بھر میں معاندانہ تعلق تو ان کا کسی سے تھا ہی نہیں میں نے بارہا ان کی زبان سے سنا ہے ؎ ہر کہ اودر راہ ما خارے نہد از دشمنی ٭ ہر گلے کز باغ عرش بشگفد بخار باد۔ اور یہ صرف قال نہ تھا حال تھا۔ جو لوگ ان سے ملے ہیں۔ غالبًا اسکی تصدیق بھی کرینگے جتنی ملاقاتیں میرے علم میں ان صاحبوں سے ہوئیں اور وہ حد شمار سے متجاوز ہیں وہ تو کمال پر لطف ہوتی تھیں۔ جناب داؔغ مغفور کو تو میں نے ان کے دکن جانے کے بعد دیکھا نہیں۔ جناب جلاؔل مرحوم کو والد مبرور کی رحلت کے بعد برسوں دیکھا ہمیشہ اُن کے لئے روتے اور ان کا ماتم کرتے دیکھا"

بڑے حریف ان کے فصیح الملک نواب میرزا خاں داؔغ سمجھے جاتے تھے مگر ان سے بھی خلوص دل کے ساتھ دوستانہ برتاؤ اور بے تکلفی تھی جس کی ایک شہادت چند وہ خطوط ہیں جو "خطوط منشی امیر احمد" میں حضرت ثاقبؔ کی کوشش سے چھپ چکے ہیں۔

فصیح الملک مرحوم نے ملک کی نا قدردانی کا شکوہ لکھا ہے اسکے جواب میں تحریر فرماتے ہیں "میرے پرانے یار پرانے غمگسار حضرت داؔغ سلامت۔ خداوند تعالےٰ یومًا فیومًا آپ کے اعزاز کو بڑھائے اور اس فن کو چمکائے۔ ملک کو آپ کی قدر ہو یا نہو میری نظر میں تو جس قدر ہے اسکو آپ کا دل بخوبی جانتا ہو گا۔ آپ سے اُن کوتاہ اندیش کا

کچھ خیال نہ کریں ارباب کمال خصوصاً وہ جن سے زمانہ کچھ موافقت کرتا ہے ہمیشہ محسود ہوا کرتے ہیں محسود ہونا سرمایۂ ناز و فخر ہے حاسد ہونے سے خدا محفوظ رکھے"

دوسرے خط میں لکھتے ہیں "میرا جی یہی چاہتا ہے کہ آپ جس قدر اپنے کمال اور قدر کمال میں ترقی کریں اُسی قدر انکسار و تواضع میں بھی ترقی کریں اسلئے کہ شجر میوہ دار کی شاخیں ہمیشہ جھکتی ہیں ؎ تواضع زگردن فروزاں نکوست + گدا اگر تواضع کند خوئے اوست

میں نے اپنی تحریر اولین میں جو کچھ آپ کو لکھا وہ محض دردمندی اور خیراندیشی سے تھا۔ آپ اسکا برا نہ مانیئے گا۔ دلسوز دوست کا جی جب سلگتا ہے تو وہ دلسوزی کی راہ سے دوست کو اُس راہ چلنے سے روکتا ہے جو اسکی بدنامی کا باعث ہو"

ایک اور خط میں گزشتہ صحبتوں کو یاد کرتے اور اسطرح دوستانہ نصیحت فرماتے ہیں۔

"بندہ نواز۔ سلام نیاز۔ ایک تحریر آپ کی تحریر کے جواب میں بھیج چکا ہوں امید ہے کہ اُسکا جواب آتا ہوگا۔ آج حمید آپ کا قدیم ملازم میرے پاس آیا۔ مجھے اسکو دیکھتے ہی وہ زمانہ یاد آگیا جب آپ یہاں تھے اور اُسی یاد کی لذت میں میں نے اُسے گلے لگایا۔ اور اسکی آنکھوں کو جن سے وہ دس بارہ دن بیشتر آپ کے جمال جہاں آرا کو دیکھا کرتا تھا میں دیر تک حسرت کی نگاہ سے دیکھا کیا اور بار بار آپ کے حالات اور ضبط اوقات کے کیفیات پوچھا اور سنا کیا۔ پیارے داغ! افسوس[ل] کہ میں نے حمید سے کوئی ساعت آپ کی خدا کی طرف مشغولی کی نہ سُنی۔ پیارے داغ! میرے لکھنے کا بُرا نہ ماننا خوشامد کرنیوالے تمھارے سیکڑوں ہیں ملامت کرنے والوں میں ایک مجھی کو رہنے دو"

[ل] ایک خط میں فصیح الملک مرحوم نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس وقت ساٹھ ہزار روپیہ نقد موجود ہے مگر افسوس کہ عمر چوسٹھ برس کی ہے۔

ایک خط میں دامن گلچیں کے لیے غزل کی فرمائش کر کے لکھتے ہیں "مگر یہ پہلے سے کہے رکھتا ہوں کہ غزل ایسی کہا کیجیے گا کہ ہم سے غریبوں کو بھی کہنے کی گنجایش رہے۔ یہ نہ ہو کہ پہلے ہی سے دنیا بھر کے قلم توڑ دیئے جائیں"۔

کبھی کبھی بے تکلفی میں باہم مزاح بھی ہو جاتی تھی۔

لطیفہ :- ایک دن کچھ شعر و سخن کا ذکر تھا۔ داغ مرحوم نے ظاہر کیا کہ میں بیس برس سے شعر کہتا ہوں۔ دو چار دن کے بعد کسی صحبت میں آتش مرحوم کے اس مطلع کی تعریف تھی۔

؎ شیریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے دہن میں + لیلےٰ پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں۔

داغ مرحوم نے کہا "مضمون تو خوب ہے لیکن مطلع دو لخت ہے"۔ حضرتؒ نے مسکرا کر کہا "مگر بیس برس کی شاعری میں تو ایسا مطلع نہیں ہو سکتا"۔

لطیفہ :- داغ مرحوم کا مقطع ہے ؎ ہر چند داغ ایک ہی عیار ہے مگر + دشمن بھی تو چھٹے ہوئے سارے جہاں کے ہیں (گلزار داغ)۔ جب مشاعرے میں غزل پڑھی تو امیرؔ و جلالؔ کی طرف انگلی اٹھا کے "دشمن بھی دو چھٹے ہوئے سارے جہاں کے ہیں"۔ پڑھا۔

حضرتؒ متانت کے ساتھ مزاح کو پسند کرتے تھے اور حسب موقع آئی پر چوکتے نہ تھے ایک دن صبح کو چھوٹے صاحبزادے منشی مسعود احمد ضمیر بی۔ اے جن کو حضرتؒ بہت چاہتے تھے دفتر ہی میں بیٹھے تھے۔ ان کے معلم عربی مولوی تبارک حسین صاحب وہیں آ گئے۔ صاحبزادے سبق پڑھنے کے لئے کتاب لے آئے اور بار بار ورق الٹ پلٹ کر سبق ڈھونڈھنے لگے تو حضرتؒ کیا فرماتے ہیں "بیٹا ہیٹنگ لگا لیا کرو"۔ پھر نصیحت کرنے لگے اور اسی ضمن میں فرمایا "آدمی میں دو جوہر چاہیئے خدا سے ڈرنا اور کسی بات میں کمال پیدا کرنا"۔

ایک دن تسلیم مرحوم نے یہ شعر پڑھا ؎

بے حجابی اس کو کیا شوخی نے میری وصل میں — ایک بات ایسی کہی جامے سے باہر ہو گیا

حضرتؒ نے ان کے کان میں کہا "آپ نے بڑی ہی کہہ دیا ہوگا۔"

ایک بار مجھ سے پوچھنے لگے "پالسی پالسی میں اخباروں میں دیکھتا ہوں یہ پالسی کے کیا معنے ہیں؟" میں نے عرض کیا "حکمت عملی معنے ہو سکتے ہیں"۔ بولے "تو بے ایمانی۔ دغابازی صاف الفاظ کیوں نہ کہو۔"

حضرتؒ اپنے احباب پر بھروسا رکھتے اور اُن کا بہت اعتبار کرتے تھے۔ خلد آشیاں کے عہد میں میرزا محمد باقر شیرازی بھی آئے اور نوکر ہو گئے چونکہ شاعر بھی تھے اور ایک مُسن آدمی، برسوں ایک رفیق کی طرح حضرت ہی کے یہاں ان کی نشست برخاست زیادہ رہی جب حضرتؒ خلد آشیاں سے کچھ کشیدہ ہو کر (جس کا حال اپنے موقع پر لکھا جائے گا) لکھنؤ چلے آئے تو آغا صاحب (حضرتؒ ان کو یہی کہتے تھے) سمجھانے بجھانے پر بھی رام پور میں نہ ٹھہرے۔ اور حضرت ہی کے پاس آ رہے۔ دو چار مہینے کے بعد حضرتؒ سے کہا کہ "آپ کہیں سے آٹھ دس ہزار روپے کی فکر کر دیجئے تو میں آپ کے لئے تجارت کروں۔ دو برس آپ کو کچھ نہ دوں گا۔ راس المال بڑھاتا رہوں گا۔ اس کے بعد اتنا منافع ملے گا کہ اچھی طرح آپ کی بسر ہو سکے گی۔ حضرتؒ نے کسی نہ کسی طرح فکر کر کے روپیہ آغا صاحب کے حوالے کیا۔ اور آغا صاحب نے چند دیسی میں روئی کی تجارت شروع کی۔ وقتاً فوقتاً معاملات و مناسبات تجارت کا اظہار کر کے اور اس پر زور دے کر پانچ سات ہزار روپیہ حضرتؒ سے اور لیا۔ اور کل روپے کی روئی کلکتے بھیج کر آپ بھی وہیں گئے اور سب روپیہ وصول کر کے دبا بیٹھے خط و کتابت بھی بند کر دی۔ آخر منشی محمد احمد صاحب ان کی تلاش میں کلکتے گئے ہفتوں سرگرداں رہنے کے بعد ایک دن کسی گلی میں اتفاق سے مل گئے۔ پوچھا "آغا صاحب!

خیر باشد"۔ کہنے لگے "منشی صاحب استخوان مرا آب کرد۔ زرنداد کارخراب شد" اور یہ کہکر چلتے ہوئے۔ حضرتؒ نے صبر کیا۔[1] اس تجارت کے لیے جو روپیہ قرض لیا تھا وہ خلد آشیاں نے ادا کر دیا (جیسا کہ آگے لکھوں گا)۔

ایک دن فرمانے لگے "ممتاز! جب تک مجھے بار بار تجربہ نہ ہو لیا بہت دنوں تک اس کا یقین نہ آتا تھا کہ لوگ جھوٹ بھی بولتے ہیں یا فریب بھی کرتے ہیں"

اس سے ان کی شان معصومیت بھی بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔

حضرتؒ ہمہ تن عجز و انکسار تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کو بھی یوں لکھتے تھے۔ "ہجوم مکروہات سے خط لکھنے میں مجھے دیر ہو گئی۔ معاف کیجئے گا"۔ "خط کا جواب آج جو بیسویں روز بھیجتا ہوں تقصیر تاخیر کا عذر خواہ اور آپ سے عفو کا امیدوار ہوں"۔ "غزل دیکھی اور اپنے گمان میں نبائی۔ واقعی خدا جانے بگاڑی ہے یا نبائی ہے"۔ ایک بار اُن کا کچھ کلام دیکھکر میرا جی لوٹ گیا میں نے لکھا "خدا سے دعا کرتا ہوں کہ میری عمر بھی آپ کی عمر میں جوڑ دے"۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں" ۲۹ نومبر ۱۹۰۰ء کا لکھا ہوا سعادت نامہ کل شام کو آیا۔ آنکھوں کا نور دل کا سرور بڑھایا۔ حسن خط کا تم سے بیاں کیا ہو + خوش قلم تو ہو اور دنیا ہو۔ تم اپنی جوہر شناسی سے میری پوری قدر کرنے کے آرزومند ہو تو میں اسکی راہ تم کو بتائے دیتا ہوں کہ جی توڑ کے میرے ستر عیوب عفو ذنوب حسن انجام مورد رحمت خاص و عام ہونے کی دعا کیا کرو۔ اس سے بڑھ کر کوئی احسان نہیں ہے۔ میری اس التجا کو سرا سری نہ سمجھو بلکہ میری زندگی میں اور مرے پیچھے ہمیشہ اس دعا کا التزام رکھو"۔ مجھے صنم خانہ عشق بھیجا ہے اور

---

[1] سنا کہ آغا صاحب کو اُن کے قدیم ملازم نے زہر دیا اور پندرہ سولہ ہزار کے سب نوٹ لے اُڑا۔
ع۔ تو بھی ٹھنڈا نہ رہے جی کے جلانے والے۔ امیرؔ

لکھتے ہیں "تمھاری نظر دقیق سے مورد ایرادات نہ ہو یہ تو محال ہے مگر خیر اُٹھتی پیٹھ کا سودا ہے گاہک پسند کرے یا نہ کرے"

نواب انتصار جنگ، مولوی مشتاق حسین، نواب محسن الملک، مولوی مہدی علی خاں، مولانا شبلی وغیرہ بڑے بڑے مشاہیر جب رام پور تشریف لاتے تو حضرتؒ کی ملاقات کو ضرور آتے۔ ایک بار کہیں باہر سے چار پانچ حضرات ایک ساتھ حضرتؒ کی ملاقات کے مشتاق آئے۔ میں باہر صحن میں وضو کر رہا تھا۔ اُن میں سے ایک صاحب کی زبان پر یہ مطلع تھا ؎

کہا جو میں نے کہ یوسف کو یہ حجاب نہ تھا تو ہنس کے بولے وہ منہ قابل نقاب نہ تھا

وہ لوگ کمرے میں حضرتؒ کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ نماز پڑھ کر میں بھی گیا تو حضرتؒ نے فرمایا۔ "میاں ممتاز! آپ سب صاحب بندہ نوازی کر کے تشریف لائے ہیں اور کچھ تازہ اشعار سنانے کے لیے اصرار ہے"۔ میں بیاض لے آیا تو ارشاد ہوا "تمھیں پڑھو"۔ میں نے دو غزلیں سنائیں وہ لوگ نہایت محظوظ ہوئے۔ بے حد دادِ سخن دی اور کہا "سچ یہ ہے کہ شاعری کو آپ کی ذات سے کمال حاصل ہوا"۔ فرمایا "یہ آپ کا حسنِ اخلاق ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔ بات یہ ہے کہ جب کامل دنیا میں باقی نہیں رہتے تو ناقص ہی کو لوگ کامل سمجھنے لگتے ہیں"

کبھی کبھی کسی شاگرد کی غزل دیکھ کر فرماتے "دورِ مجنوں گزشت و نوبت ماست"۔

اپنے احباب اور شاگردوں کے بہی خواہ اور سچے ہمدرد عزیزوں کے مثل تھے۔ اُن کے دکھ درد سے آپ کو دلی صدمہ ہوتا تھا۔ ۱۸۹۰ء میں جب میرا تعلق دفتر امیر اللغات سے تھا اور میں حضرتؒ سے اجازت لے کر وطن گیا تھا ایک خط میں میرے والد مرحوم کو لکھتے ہیں۔ "آپ نے میرے پیارے نورِ چشم ممتاز کو مجھ سے چھڑانے کی کئی وجہیں لکھی ہیں جن میں سے ایک قوی اور دو ضعیف ہیں میں تینوں کا مختصر جواب عرض کرتا ہوں۔ قوی علت اپنا

ضعف پیری و قرضداری او رزیر باری ہے۔ اس بنا پر سفر دور و دراز دکن نورچشم موصوف کا گوارا کرنا لکھا ہے اس کی نسبت میں جہاں تک سوچتا ہوں کوئی جواب مجھ سے بن نہیں پڑتا۔ یہ میرا مشرب نہیں کہ شفیق باپ بیٹے کو ایسی راہ لے جانا چاہے جو راہ باپ بیٹے دونوں کے حق میں موصل الی المقصود ہو اور میں کہوں نہیں میرا ہرج ہے میرا نقصان ہے۔ ہرگز ایسا نہونا چاہیئے۔ بلکہ جو محبت مجکو نورچشم موصوف سے ہے وہ اسی کو مقتضی ہے کہ میں اپنا ہرج گوارا کروں اور شاہ راہ مقصود پر جانے دوں مگر آپ نے ذریعۂ سفر حیدرآباد کو لکھ کر مجھ سے صلاح بھی پوچھی ہے تو بحکم حدیث اَلْمُسْتَشَارُ مُؤتَمِنٌ مجھ پر واجب ہے کہ میں اپنی رائے بھی عرض کردوں آگے اس رائے کی پسند و ناپسند میں آپ کو اختیار ہے الخ"

۱۸۹۲ء میں جب حافظ جلیل حسن صاحب کو دفتر امیراللغات سے تعلق تھا ایک خط حکیم عابد علی صاحب کوثر کو لکھا ہے "پیارے کوثر ملفوف کاغذ میں لکھوا کر بھیجتا ہوں اس کو آپ دیکھ کر اپنے مراسم کے موافق احمد علی خاں صاحب منصور آبادی کو جلد لکھ کر بھیجدیں اور کوئی دقیقہ کاربرآری کا فروگزاشت نہ کریں۔ مجھے محبی جلیل سے سخت انفعال ہے اور ان کی کامیابی کا نہایت ہی خیال ہے۔ آدمی یہ ایسے اچھے ہیں کہ جہاں ہوں وہاں اسلامی برکات پھیلیں۔ میں ان کی علیحدگی کو اپنی بدقسمتی جانتا ہوں مگر مجبوری گوارا کرتا ہوں بشرطیکہ اسی جوار یعنی قرب وطن میں ان کی بسر اوقات کی صورت نکلے الخ"۔

حکیم عبدالکریم خاں برہم کو لکھتے ہیں "آپ کے باب میں تحریک باطنی او رظاہری چلی جاتی ہے۔ خاطر جمع رکھئے انشاء اللہ آپ بہت جلد کامیاب ہوں گے"۔

کوثر کو لکھتے ہیں "محبی و مکرمی سید طفیل احمد صاحب (حضرت ریاض کے والد) کی ناچاقی طبیعت کو طول ہوا ہے۔ میں ہمیشہ اُن کے حالات مفصل پر اطلاع چاہتا ہوں اور

وہ براہ مہربانی جواب ہمیشہ لکھتے ہیں مگر بیان حالات میں ایسا اجمال ہوتا ہے کہ کما حقہٗ تسکین خاطر نہیں ہوتی۔ دل سے تشویش نہیں جاتی معلوم نہیں کیا کیا امراض ہیں۔ علاج کیا ہوتا ہے۔ کس کس مرض میں کس کس مقدار اس سے نفع ہوا ہے۔ نصیب اعدا معذوری کی حالت ہے یا اپنے پانوؤں سے چلتے پھرتے ہیں۔ آپ طبیب ہیں بہت تفصیل کے ساتھ اُن کے حالات سے آگاہی حاصل کرکے مجھے اطلاع دیں اور میرے پریشان دل کو اطمینان بخشیں تو میں نہایت ممنون ہوں گا۔ پُرانے مہربان دوستوں میں اُن کا دم باقی ہے۔ اللہ تعالےٰ اُن کے انفاس میں برکت دے۔"

سید زاہد حسین صاحب زاؔہد کو لکھتے ہیں "اللہ تعالےٰ تمھاری خاتون پر رحم کرے۔ میری بڑی لڑکی کو حرارت مزمنہ سے نجات نہ ہوتی تھی۔ اطبا عاجز ہو گئے تھے مگر ایک بغدادی سید نے گولیاں بنوادی تھیں اُن کے استعمال سے صحت ہو گئی۔ نسخہ بھیجتا ہوں خدا سے امید ہے کہ تمھاری خاتون کو صحت ہو جائے گی۔" مگر اُن کی خاتون (سابق) کا انتقال ہو گیا تو لکھتے ہیں "تمھارا خط نہ آنے سے پہلے ہی میرا جی دھڑکتا تھا کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ آج جو تمھارا خط آیا اس کا ہر فقرہ میرے کلیجے میں تیر بن کر اترا۔ حق تعالےٰ ہی توفیق صبر دے تو صبر آئے۔ تعزیت نامہ میں نے علیحدہ لکھا ہے اس کو ضرور بار بار پڑھئے۔ مگر اے میری جان سراپا ارمان زاؔہد ابھی سے دوسرے عقد کی فکر کر۔ تو نام خدا ابھی جوان ہے تیرا بچہ معصوم نادان ہے۔ اس کی پرورش میں جیسی کوشش چاہیئے ویسی تنہائی میں دشوار ہوگی۔ اور اس حیلے سے مرحومہ کا غم بہت جلد کم ہو جائے گا۔ میرے دل نے نہ مانا میں نے نیک نیتی سے سچی نصیحت کر دی اگر اس کا جواب مشعر قبول پاؤں گا تو خوش ہوں گا۔ اگر میں قابل سفر ہوتا تو تعزیت کے واسطے خود آتا اور تمھیں بہت کچھ سمجھاتا۔"

سید محمد نوح صاحب تسہیر کو بار بار تپ آجاتی ہے اُن کو صلاح دے کر اصرار کرتے ہیں "میں نے لطیف احمد سلمہ کے خط میں سری لال پیارے لال کے یہاں سے عرق منگوا کر استعمال کرنے کو لکھوا دیا تھا۔ آپ ضرور استعمال کریں۔ بار بار تپ کا آجانا اچھا نہیں ہے اس کے ازالے کی فکر ضروری ہے۔"

ایک خط میں حضرت زاہد کو لکھتے ہیں "سوزاں مرحوم کے اخلاف واقعی خلف ہیں یا اور قطع ہے۔ اُن کے عہدوں سے تو نہیں معلوم ہوتا کہ علمی اور اخلاقی صفات میں خلف الرشید ہیں ہائے میرے سوزاں کے کیا صفات تھے خدا بخشے۔" (خطوط منشی امیر احمدؒ)

منشی خورشید احمد صاحب (حضرتؒ کے منجھلے صاحبزادے) کی عنایت سے حضرتؒ کا وصیت نامہ مجھے دیکھنے کو مل گیا اس میں یہ بھی وصیت ہے۔

"اپنی اولاد کو خصوصاً اور عزیزوں دوستوں شاگردوں کو عموماً وصیت ہے کہ امام غزالی علیہ الرحمۃ کی کتابوں میں سے جو علم سلوک میں ہیں اور اُن کا اُردو میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے جیسے مذاق العارفین ترجمہ احیاء العلوم اور اکسیر ہدایت ترجمہ کیمیائے سعادت اور سراج السالکین ترجمۂ منہاج العابدین وغیرہ کسی کتاب کو ضرور مطالعہ کیا کریں کہ ان کا بیان مقاصد دین میں نہایت پُر تاثیر اور انسان کے دفع عوارض نفس و قلب میں طرفہ اکسیر ہے کوئی مصاحب و ناصح ان کتابوں سے بہتر نہیں۔ رفتہ رفتہ روح کو اُن کے مضامین ہدایت آگیں کے مطالعہ سے عجیب لذت ملتی ہے۔"

اللہ اللہ! اس موقع پر بھی ہم کو یاد رکھا۔ کیا ذات ستودہ صفات تھی کیسے سچے ہمدرد اور کس قدر ہمارے بہی خواہ تھے۔

حضرتؒ بچپن ہی سے شعر کہنے لگے اور شاعری کے دلدادہ تھے۔ برسات کا موسم تھا۔

ابر آ آ کر نکل جاتا پانی برستا نہ تھا ایک دن رات کو حضرتؒ کے والد ماجد عشا کی نماز پڑھ کر جانماز ہی پر لیٹ گئے سعادت مند بیٹا جس کا نواں سال تھا باپ کی دعائیں لینے کو پانو دبانے لگا۔ باپ نے شفقت سے پوچھا "امیر احمد ہم نے سنا ہے تم شعر کہتے ہو ذرا ہم بھی تو سنیں تمھارے شعر کیسے ہوتے ہیں" پہلے تو بلحاظ ادب ٹالنا چاہا لیکن مزید اصرار پر موسم کی حالت کے مناسب بیٹے نے برجستہ شعر کہہ کر سنایا ؎ ابر آتا ہے ہر بار برستا نہیں پانی + اس غم سے مرے آنسوؤں کی ہے یہ روانی۔ (کیا بلاغت ہے۔ پانی کے نہ برسنے سے عام پریشانی اور بےچینی کو دیکھ کر رنج و غم اور پھر ہمدردی سے اشکوں کی روانی جس سے کام نکل جائے اور عام اضطراب میں کمی ہو جائے۔ سالے کہ نکوست از بہارش پیدا۔ کوئی مشاق شاعر بھی کہتا تو اور کیا کہتا۔ یہ خدا کی دین نہیں تو اور کیا ہے اور فطری شاعر اور کسے کہتے ہیں)۔

باپ جو خود بھی شاعر تھے دل میں خوش تو ضرور ہوئے ہوں گے اور مرحبا کا لفظ زبان پر آتے آتے رہ گیا ہوگا مگر ہونہار بیٹے کو دیر تک نصیحت کرتے اور یوں سمجھاتے رہے۔ "جان پدر ابھی تمھارے دن تحصیل علم کے ہیں اس وقت سے شعر و شاعری کی طرف توجہ نہ کرنا چاہیئے۔ پہلے علم و فضل حاصل کر لو پھر شعر و سخن کی طرف متوجہ ہونا۔ ایسا نہ ہو کہ اس مشغلے میں تحصیل علم رہ جائے اور خاندان کے خلاف تم جاہل رہ جاؤ"۔

سعادت مند بیٹے نے باپ سے اقرار تو کیا۔ مگر خدا نے ازل سے شعر و سخن کا جو مادہ طبیعت میں ودیعت کر کے اقلیم سخن کا امیر بنا دیا تھا وہ کب چین لینے اور اقرار پورا ہونے دیتا تھا تحصیل علم کے ساتھ ساتھ حضرتؒ چپکے چپکے شعر کہتے رہتے اور کبھی کبھی چوری چھپے اپنے کسی خاندانی بزرگ کے ساتھ مشاعرے میں بھی چلے جاتے تھے چودھویں سال میں ہوائے شوق نے شاعری کی دبی ہوئی چنگاری میں شعلے پیدا کر ہی دیئے

اُن دنوں مولوی تفضل حسین فتحپوری[۱] کے یہاں بھی مشاعرے ہوتے تھے آخر حضرت سے نہ رہا گیا اور آزادی سے اُن مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ اب کسی سے تلمذ حاصل کرنے کا بھی خیال پیدا ہوا۔ اُس زمانے میں برقؔ۔ قلقؔ۔ رندؔ۔ وزیرؔ۔ صباؔ۔ بحرؔ۔ خلیلؔ وغیرہ ناسخؔ و آتشؔ کے عمدہ تلامذہ اور نواب عاشور علی خاں جن کا لقب شاعر گر تھا سب موجود تھے۔ خواجہ وزیر وزیرؔ مرحوم شیخ امام بخش ناسخؔ مغفور کے شاگرد رشید نہایت خوشگو شاعر تھے اور اُن کا مکان بھی حضرتؒ کے مکان سے قریب ہی تھا چاہا کہ انھیں سے تلمذ حاصل کریں مگر اُس زمانے میں عام طور پر خرد بزرگوں کا بہت ادب کرتے تھے۔ ایک ہی محلے میں رہنے سے خواجہ صاحب کی بزرگی کے لحاظ نے بالمشافہ عرض مطلب کی اجازت نہ دی خود تو کہہ نہ سکے ہم عمروں میں اپنی خواہش کا تذکرہ کیا اور اُن کے ذریعے سے اپنا مقصود خواجہ صاحب پر ظاہر کیا۔ خواجہ صاحب نے ان کی نوعمری کے خیال سے یہ کہہ کر ٹال دیا "مجھے اتنی فرصت کہاں کہ لڑکوں کا کلام دیکھوں"۔ مگر خواجہ صاحب کو یہ کیا معلوم تھا ع۔ کہ این بالا بلا خواہد شدن بالیدہ بالیدہ۔ یہاں نوجوانی کے دن طبیعت زوروں پر۔ لیاقت کا پندار اور خاندانی وجاہت کا زعم تھا۔ خواجہ صاحب کا یہ فقرہ اور اس طرح ٹال دینا دل پر بہت شاق گزرا۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب شاگرد کے شعر درست کرنے کے بجائے کاٹ دیتے اور خود شعر کہہ کر غزل میں بڑھا دیتے ہیں۔ چند مہینے صبر کیا۔ آخر رجب ۱۲۵۹ھ میں جب عمر کا پندرھواں سال قریب ختم تھا تدبیر الدولہ مدبر الملک منشی سید مظفر علی خاں بہادر جنگ اسیرؔ مرحوم امیٹھوی[۲] کی خدمت میں اپنا کلام اصلاح کے لئے پیش کیا اور اُن کے

---

[۱] فتحپور ضلع بارہ بنکی ملک اودھ۔

[۲] آپ کا مولد قصبہ امیٹھی تھا۔ مگر بچپن سے لکھنؤ میں قیام رہا۔ وہیں تحصیل علوم کی۔ عہد امجد علی شاہ بادشاہ

شاگرد ہو گئے۔

اس تلمذ کی کیفیت حضرت بسملؔ اور ضمیرؔ صاحب نے خود حضرتؒ کی زبان سے جو سنی تھی

اودھ میں وزارت کے میرمنشی رہے اور واجد علی شاہ کے عہد میں سلطانی خاص کچہری یا نیام رہی۔ غدر کے بعد فردوس مکان نواب یوسف علی خاں رئیس رام پور کے عہد سے آخر عمر تک نہایت قدر و منزلت کے ساتھ وظیفہ خوار ریاست رہے۔ ۸۰ برس کی عمر میں ۱۷ ربیع الاول ۱۲۹۹ھ کو ۲ بجے دن کے وقت لکھنؤ میں رحلت فرمائی۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ کے بڑے نامی شاگرد تھے۔ (امیر اللغات)۔

میرے دل کا تقاضا ہے کہ جو کچھ حضرتؒ کی زبان مبارک سے یا اپنے اور بزرگوں کی زبانی آسیرؔ مرحوم کی شعر گوئی وغیرہ سے متعلق سنا ہے اُسے بھی لکھوں کیونکہ وہ میرے دادا استاد تھے اور ایک تخصیص یہ ہے کہ میں بھی اسی امیٹھی کا رہنے والا ہوں اور میرے بزرگوں سے اور آسیرؔ مرحوم سے برادرانہ تعلقات تھے۔ حضرتؒ فرماتے تھے "منشی صاحب (آسیرؔ مرحوم) مجھ سے کہتے تھے کہ جب مجھے شاعری کا شوق ہوا تو اصلاح کے لئے استاد کی تلاش ہوئی۔ میاں مصحفیؔ سے زیادہ کامل فن اور قادر الکلام کوئی نظر نہ آیا۔ ارادہ کیا کہ جاؤں اور غزل اصلاح کیلئے پیش کروں مگر دیکھا تو دن رات سیکڑوں شاگرد میاں صاحب کے پاس جمع رہتے تھے اور اصلاح اور شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا۔ اپنی نومشقی کے باعث اس مجمع میں جا کر درخواست کرتے ہچکچاتا رہا آخر یہ خیال آیا کہ صبح کو بہت سویرے ہی جانا چاہیئے اس وقت تو کوئی نہ ہوگا۔ یہ خیال کر کے میں علے الصباح گیا تو دیکھا اس وقت بھی ایک گوالی دودھ لایا ہے اور میاں صاحب اس کی غزل پر اصلاح دے رہے ہیں۔ خیر یہ بھی غنیمت معلوم ہوا۔ میاں صاحب نے میری درخواست خوشی سے منظور فرمالی اور غزل پر توجہ سے اصلاح دی۔

یہ معمول تھا کہ رات کو سوتے وقت منشی صاحب (آسیرؔ مرحوم) کے سرہانے کاغذ کی چٹیں کاٹ کر اور پلنگ کے پاس مونڈھے پر قلمدان رکھ دیا جاتا تھا۔ وہ سو جانے سے پہلے کبھی ۴۰۔۵۰ کبھی ۷۰۔۸۰ اور کبھی اس سے بھی زیادہ شعر کہہ لیا کرتے تھے۔

آسیرؔ مرحوم کا قول تھا کہ نرم گرم سب شعر دیوان میں رکھنا چاہیئے۔ کیسا ہی معمولی شعر ہو کسی نہ کسی وقت

مجھ سے بیان کی کہ شاہ کرم محمد مینائی مرحوم کے ایک دوست نے جب سنا کہ امیرؔ

دوسرے کے کام آہی جاتا ہے (یہ قصہ ہے جب کا جب آتشؔ جواں تھا۔ اب تو لوگ استادوں کے کلام سے سند پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے جو خود کہیں وہی مستند ہے) اور ایک شعر جو آج تم کو پسند نہیں ممکن ہے کہ وہی شعر دوسرے کے دل پر اثر کر جائے اور اُسے لطف دے جائے (یہ واقعہ ہے۔ میرا ایک نوجوانی کا معمولی شعر تھا ؎ سوالِ بوسۂ گیسو پہ بولے، بڑی ہو تم کو تو سودا ہوا ہے۔ اس شعر کو سن کر میرے ایک دوست سر دھننے لگے اُن کو اپنا ایسا ہی سوال اور اس پر انھیں الفاظ میں کسی کا جواب یاد آگیا) ان کا یہ بھی فرمانا تھا کہ کوئی قافیہ چھوڑنا نہ چاہیئے خصوصاً جو سامنے کا ہو اور جس زمین میں قافیے کم ہوں۔ اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا۔ حافظ شاہ محمود علی فداؔ مرحوم امیٹھوی نے (جو سجادہ نشین درگاہ حضرت مخدوم خاصہ خداؒ اور امیرؔ کے ذی استعداد اور بہت خوش گو شاگرد تھے) اپنے ایک دوست کی فرمائش سے مجبور ہو کر رات ہی کو اس زمین میں ؎ دل الفت میں ہے آوارا ہمارا ٭ ابھی گردش میں ہے تارا ہمارا۔ غزل کہی۔ صبح کو وطن جانے والے تھے۔ جب رخصت ہونے کو استادؒ کے پاس گئے تو اُس غزل کو بھی دکھا لینا چاہا۔ حضرت اس وقت کسی سرکاری ضروری کام میں تھے فرمایا "آخر رخصت ہونے کو منشی صاحب (اسیرؔ مرحوم) کے پاس جاؤ گے انھیں کو دکھا لو" فداؔ مرحوم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے سلام کر کے بیٹھ گئے۔ وطن کا قصد عرض کیا اور غزل جیب سے نکالی ہی تھی کہ خوش ہو کر بولے (اسیرؔ مرحومؒ) "کیا کوئی غزل ہے"؟ انھوں نے غزل پیش کرتے ہوئے نہایت بے اطمینانی میں چند شعر کہہ دینا بیان کر دیا۔ غزل دیکھ لی تو فرمایا "کیسے جوان ہو صرف ۹ شعر کہے ہیں ہم تو اس بڑھاپے میں بھی رات کو سوتے سوتے سو پچاس شعر کہہ لیا کرتے ہیں"۔ خیر یہ رخصت ہوئے لب فرش تک پہنچے تھے کہ فرمایا "میاں محمود ایک سامنے کا قافیہ رہا جاتا ہے لکھ لو ؎ کوئی مزدور بھی لا ساتھ قاصد ٭ ہے خط شوقِ پشتارا ہمارا

میں کہتا ہوں کہ کسی استاد کا معمولی شعر بھی ضرورت کے وقت کام دے جاتا اور سند ہو جاتا ہے اور میرے اس خیال کی تصدیق "فرہنگ آصفیہ"۔ "امیر اللغات" اور "نور اللغات" وغیرہ سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے۔

آمیرؔ ؎ چال وحشت کی کسی روز جو چل جاؤں گا ٭ دو قدم میں ہیں دو عالم سے نکل جاؤں گا۔

شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں تو ایک دن اصرار کرکے کچھ کلام سنا۔ بہت خوش ہوئے

"چال چل جانا" اور "دو قدم میں" دو محاورے شعر میں موجود ہیں۔ امیر ؎ چکنی چکنی تری باتیں نہیں سنتا ناصح ہے ڈر رہا ہے کہ نہ سنبھلوں گا پھسل جاؤں گا" "چکنی چکنی باتیں" "سنبھلنا" "اور پھسل جانا" تین محاورے اس شعر میں مل گئے۔

خواجہ وزیر وزیر مرحوم کی نسبت البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُن کا جو رنگ تھا قریب پورا دیوان اسی رنگ میں ہے باقی شاعروں کے چھوٹے چھوٹے دواوین میں بھی ہر غزل کم سے کم میری نظر سے ایسی نہیں گزری جس میں تمام شعر عمدہ ہوں۔

امیر مرحوم نقل کرنے سے گھبراتے نہ تھے بلکہ کہنا چاہیئے کہ شوق تھا۔ کاغذ کا دو ورقہ ہاتھ میں لے لیتے چار زانو بیٹھ جاتے نسخہ سامنے رکھا ہوتا، لکھتے چلے جاتے جب قلم کی نوک ایک طرف سے گھس جاتی قلم کا میدان اوپر کرکے دوسری نوک کی طرف سے لکھنا شروع کرتے اور اسی طرح قلم کو بدلتے رہتے۔ آٹھ دس سطریں لکھنے کے بعد حقہ پی لیتے مگر اس سے مطلب نہ تھا کہ چلم میں تمباکو کیسا آگ بھی باقی ہے یا نہیں۔ کچی املی کا شوق تھا چھیلی رکھی ہوتی کبھی ایک ایک ٹکڑا اس کا بھی کھاتے جاتے۔ ایک روز فرمایا "میاں امیر تم تو کہتے تھے دیوان کے لیئے کافی غزلیں ہوگئی ہیں لاؤ تمہارا دیوان لکھدیں۔ دیوان لکھنے کو بیٹھے تو ایک طرف غزلوں کی نقل کرتے جاتے دوسری طرف جو زمیں پسند آتی اپنی غزل بھی ہوتی جاتی۔

ایک بار زود گوئی اور روانی طبع کا کچھ ذکر تھا فرمایا " لکھنے اور شعر موزوں کرنے میں برابر کا وقفہ ہوتا ہے" حاضرین کو کچھ تامل ہوا۔ کتاب کا ایک صفحہ نقل کرنے کو دیا اور خود غزل کہنے لگے۔ جب نقل کرنے والے نے کہا "میں تو لکھ چکا" آپ نے بھی کاغذ ہاتھ سے رکھتے ہوئے کہا "میں بھی کہہ چکا" دیکھا گیا تو ۲۰-۲۵ شعروں کی غزل مع مطلع و مقطع تیار تھی۔

ایک سپاہی کچھ لکھے پڑھے تھے۔ امیر مرحوم سے کہا "آپ نے تو لوگوں کو دیوان کہہ دیئے۔ مجھے آپ نے کبھی کچھ نہ کہدیا" فرمایا "تم دیکھتے ہو فرصت تو ملتی نہیں"۔ انھوں نے کہا "آپ چاہیں گے تو میرا بھی دیوان ہوجائے گا"۔ کچھ سوچ کے فرمایا "اچھا تم یہ کرو کہ جب میں اٹھی جایا کروں تو پالکی کے ساتھ ہو لیا کرو"۔ اُن کے اس عمل سے دس پندرہ بار کے آنے جانے میں ان کا بھی پورا دیوان ہوگیا۔

اور کہا کہ" ایک بہت بڑے شاعر منشی مظفر علی صاحب اسیر ہمارے محلے میں ایک صاحب کے

فرماتے تھے کہ" تمام عمر میں ایک بار شعر کہنا مجھ پر نہایت شاق اور سخت گزرا۔ لکھنؤ میں مسالمہ تھا۔ میں نے سلام کہنا شروع کیا کئی سو شعر کہے ان میں سے انتخاب کر کے دو سلام لکھ کر قلمدان میں رکھ لیے باقی شعر لوگوں کو بانٹ دیئے جس دن رات کو مسالمہ تھا شام کو ایک بے تکلف دوست آ گئے باتوں میں ان کی نظر قلمدان پر پڑی سلام نکال لیے اور پڑھکر کہنے لگے یہ تو میں اپنے واسطے لیے جاتا ہوں اور جیب میں رکھ لیئے میں نے کہا اور میں اب کیا کروں گا۔ کہا آپ اپنے لیئے اور کہہ لیجئے۔ بہت عذر کیا مگر ایک نہ سنی اور ہنستے ہو چل دیئے۔ کیا کرتا طبیعت پر جبر کیا اور جو کچھ آورد سے ہو سکا وہی مسالمے میں جا کر پڑھ دیا"

رام پور میں ایک دن حضرتؒ آسیر مرحوم کے پاس حاضر ہوئے تو صورت دیکھتے ہی کچھ خشونت کے ساتھ کہنے لگے" میاں امیر یہ مجھے پسند نہیں کہ کوئی کام نہ کروں اور مفت تنخواہ لیا کروں"۔ حضرتؒ نے مسکرا کر عرض کیا "آپ کو یہ کیا خیال آیا۔ رؤسا کاملان فن کی یونہی قدر دانی کیا کرتے ہیں"۔ فرمایا" نہیں مجھے یہ منظور نہیں"۔ عرض کی "ملک کو جو فیض شاعری میں آپ سے پہنچ رہا ہے یہی بڑی خدمت ہے"۔ اس کو بھی نہ سنا اور فرمانے لگے"۔ تم نواب صاحب سے کہدینا یا تو مجھ سے کوئی کام لیں نہیں تو میں اپنے گھر جاتا ہوں ایسی تنخواہ سے میں درگزرا"۔ "بہت خوب ضرور عرض کر دوں گا" کہہ کر حضرتؒ نے اس وقت ٹال دینا ہی مناسب سمجھا۔ دو چار دن کے بعد حضرتؒ پھر گئے تو دیکھتے ہی فرمانے لگے" میاں امیر ہم نے خود ہی ایک کام اپنے لیئے تجویز کیا ہے"۔ پوچھا "وہ کیا"؟ فرمایا" بوستان خیال نظم کر دیں دیکھو دو تین جز و نظم بھی کر ڈالے"۔ حضرتؒ نے سرسری نظر ڈالکر کہا "بہت خوب میں نواب صاحب سے عرض کر دوں گا مگر جب تک اُدھر سے یہ کام پسند اور اس کی منظوری نہو آپ یہ کام ملتوی رکھیئے"۔ بارے وہ جوش اس وقت نہ تھا کہا" اچھا"۔

لطیفہ:۔ ایک دن حضرتؒ نے دو چار شعر لوگوں کے سنائے اور کہا" اب تو یہی رنگ مقبول ہے۔ آپ تو ہر رنگ پر قادر ہیں اب ایسے ہی شعر کہا کیجیے"۔ فرمایا" یہ تُنک جھُنو! کہنا مجھے نہیں آتا۔ میر صاحب کی چوما چاٹی ٹھہری"! (جرأت کی شاعری کی نسبت فرمایا تھا)۔

رام پور میں جب غزل کہتے تو حضرتؒ کو انتخاب کے لیے دیتے جن شعروں پر انتخاب کا نقطہ لگایا جاتا اُن میں سے بعض کی نسبت اصرار سے کہتے کہ میرے تو یہ شعر بھی ویسے ہی ہیں جیسے انتخاب میں آئے ہیں

یہاں کبھی کبھی آتے ہیں میں موقع پاکر تم کو اُن سے ملواؤں گا۔ وہ تم سے اور تم اُن سے ملکر یہ تمھاری زبردستی ہے کہ اُن کو چھوڑ دیا! نگہ اپنی اپنی پسند اپنی اپنی۔

حضرتؒ نے اسیر مرحوم کی تاریخ وفات یہ کہی تھی ؎

افسوس کہ از گردش این چرخ کہن — حاصل ز حیات نیست جز رنج و محن
نازادہ کس از مادر ایام کہ مرگ — آمادہ نہ کرد بہر او گور و کفن
ناآمدہ کس ز نیستی در ہستی — کو را ننمودند نخستین مدفن
نشگفت گلے بفرودین اندر باغ — کافسردہ و پژمردہ نشد در بہمن
خوش بود زمان گل و ایام بہار — گر باد خزاں نیامدے در گلشن
این طرفہ کہ چوں خزاں درآید در باغ — اول فگند بخاک سوری و سمن
نازادہ کس از خاک کہ خاکش نگرفت — از کینہ در آغوش و نفشردش تن
گر چرخ بخاکیاں شود دشمن خاک — نوبادۂ خویش را چرا شد دشمن
خونریزتر از چرخ نباشد جلاد — خونخوارتر از خاک نباشد رہزن
ہر روز غمے زاید و ہر شب المے — تا مادر ایام بود در زادن
ہر شام چو مہ کشد سر از جیب افق — ہر صبح کشد چو روز از شب دامن
رسم ستمے تازہ نہد سیر نجوم — طرح سخطے نو فگند چرخ کہن
ماتم کدہ ایست سطح ایں خاک دژم — کز سوگ بزرگان ہمہ اندر شیون
فارغ نبود ہیچ دل از سوگ مہاں — خاصہ دل من ز سوگ آں فخر زمن
شاہنشہ اقلیم معانی کہ بیاں — قاصر بود از وصف کمالش چوں من
سد حیف مظفر علی از ایں بنگاہ — بربستہ سبک رخت و گراں گشت حزن
او اوج گرفت فضل و دانش پستی — او زندۂ جاوید شد و مرد سخن
استاد جہاں بود و بشاگردی او — زیباست اگر فخر کنند اہل زمن
جز راہ بحق نداشت پیدا و نہاں — جز روئے بہ او نداشت در سر و علن

خوش ہو گئے"۔ حضرتؒ نے اس کو ایک معمولی بات خیال کر کے کہا "دیکھا جائے گا"۔ چند روز کے بعد

از بعد ہزار و دو صد زین سال گہرے	از نسل علی آمدہ با خلق حسن
عمرے باید بلے بلائے ز جبش	پیدا شود و اویس آید بقرن
تا زیست چناں زیست کہ می باید زیست	چوں رفت چناں رفت کہ باید رفتن
چوں دید دریں جہاں غریب است ورا	باشد وطن دیگر و دیگر مامن
بگزاشت مرا بغربت اندر بے یار	خود یک تنہ راند و کرد روسوئے وطن
او رخت بروں برد ازیں دار فنا	من در غم او چاک زدم پیراہن
گفتم پئے تاریخ وفاتش گویم	یک مصرعۂ موزوں کہ دہد بوئے حزن
دیدم بفغاں و نالہ می گفت امیر	سلطان سخن امام فن قبلۂ من

۱۲۹۹ھ

(حاشیہ صفحہ ۴۳) ۵۳ ضلع لکھنؤ میں لکھنؤ سے پندرہ ۱۵ سولہ ۱۶ میل پر جانب شمال و مشرق ایک قصبہ ہے جو امیٹھی بندگی میاں کہلاتا ہے۔ کسی زمانے میں اس کا لقب مدینۃ الاولیا تھا۔ یہ عجیب مردم خیز قصبہ تھا۔ صرف چند بزرگوں کے نام یہاں لکھے جاتے ہیں۔ حضرت مخدوم بہاؤالحق خاصہ خداؒ۔ سید علاءالدینؒ خلیفہ حضرت سلطان المشائخؒ۔ ملک ماہ محمود علوی الملقب بہ محسن المجاہدین قطب الاقطاب شیخ الاسلام حضرت بندگی نظام الدینؒ (جن کی زیارت کے لیئے شہنشاہ اکبر اعظم امیٹھی آئے تھے)۔ قاضی محمد شاہؒ عرف قاضی شاہا محدث۔ حضرت مخدوم ضیاالحق عرف شاہ عبدالرزاقؒ۔ شیخ محمد فیاضؒ انصاری المخاطب بہ ملک العلما۔ حضرت بندگی مسعود الدینؒ الملقب بہ جعفر ثانی۔ حضرت شیخ علیم اللہؒ المخاطب بہ امام المحدثین والمفسرین۔ سید عبداللہ المخاطب بہ نواب عزت خاں میر آتش شہنشاہ اورنگ زیبؒ۔ استاذ الملک ملا شیخ احمد عرف ملا جیون (صاحب نورالانوار و تفسیر احمدی) ملا عبدالصمد محمد صوبہ دار گجرات۔ قاضی محمد یوسف عثمانی قاضی القضاۃ ہند۔ ملا فقیہ الدین فارغ۔ ملا فقیہ الدین عزت۔ منشی خدا بخش خان بہادر کانائب رزیڈنٹ فرخ آباد۔ منشی غلام باسط خاں میر منشی گورنر جنرل ہند۔ نواب سعید الدولہ منہاج الدین محمد خاں وزیر۔ حکیم نعمت علی خان بہادر وحدت۔ مولوی غلام امام شہید رحمۃ اللہ علیہ

وہ بزرگ تشریف لائے اور کہا "حضرت آسیر تشریف لائے ہیں چلو تم کو ملوا دیں" آپ نے کہا
جناب والا یہ کیا ملاقات ہے کچھ شاگرد میرے ہوں عہ پھر ان کے تب ملاقات کا لطف آئے
انھوں نے فرمایا "تم ابھی بچے ہو انھیں جانتے نہیں وہ بہت بڑے شاعر باکمال ہیں"

امیر المجاہدین مولوی امیر علی شہید۔ گر ؎
ایسی ہوئی آہ برباد الیسی ، کہ ویرانہ ہے اب وہ بستی نہیں ہے
از ریاض عثمانی مولفہ قاضی خادم حسن صاحب علوی العثمانی وکیل عدالت

عہ بزرگوں سے سنا ہے کہ جب اجودھیا (متصل فیض آباد۔ یو۔ پی) کے بجاریوں اور مہنتوں نے اپنی ناعاقبت اندیشی اور شورہ پشتی سے ناظمان ضلع سلطانپور وغیرہ کو ملاکر اجودھیا کی مسجد قدیم کو منہدم کر دیا اور قرآن کے ساتھ بے ادبیاں کیں تو ایک شور اور غوغا بلند ہوا۔ شہید ملتؒ نے وزارت میں استغاثہ پیش کیا مگر کون سنتا تھا فغانِ درویش کچھ توجہ نہ ہوئی۔ بالآخر مولاناؒ نے جہاد کے لیے وعظ کہا جن کے جھنڈے کے نیچے ہزاروں آدمی جمع ہو گئے اور مولانا بعد اتمام حجت لکھنؤ سے اجودھیا روانہ ہوئے سرکار لکھنؤ سے ان کے خلاف واعظ مامور ہوئے اور فوج بھی توپ خانے کے ساتھ بھیجی گئی جس سے مجمع درہم و برہم ہو گیا۔ صرف ۲۰۰ جان نثار مشتاق شہادت ساتھ رہ گئے اور ۲۰ صفر روز چہارشنبہ ۱۲۷۲ھ مطابق ۷ نومبر ۱۸۵۵ء کو صبح سے ظہر تک جنگ شدید رہی۔ کل جان نثار شہید ہو گئے۔ مولانا بھی زخموں سے چور ہو کر زمین پر بیٹھ گئے اور قرآن پڑھ کر جام شہادت نوش فرمایا۔ میری دادی مرحومہ جو مولاناؒ کی مرید تھیں بیان کرتی تھیں کہ جب مولوی صاحبؒ زخموں سے چور ہو کر زمین پر بیٹھ گئے تو ایک شخص آپ کا سر کاٹنے آیا۔ آپؒ نے فرمایا ٹھہر جا مجھے قرآن پڑھ لینے دے۔ قرآن پڑھ کر آپ نے قرآن کو درخت کی شاخ میں لٹکا دیا اور قاتل سے کہا "آ اب اپنا کام کر" تب اس نے آپ کا سر کاٹ لیا۔

بزرگوں کا خیال ہے کہ اسی بیداد کا نتیجہ یہ ہوا کہ چار مہینے کے اندر ۲۹ جمادی الاول ۱۲۷۲ھ مطابق ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو بادشاہت جاتی رہی اور ملک اودھ پر کمپنی نے اپنا قبضہ کر لیا ؎

بیک گردشِ چرخِ نیلوفری
نہ نادر بجا ماند و نے نادری

عہ بعض ہم عمر اُس وقت بھی حضرتؒ سے مشورۂ سخن کرتے اور اصلاح لیتے تھے۔

تمھارا ان کا مقابلہ ہی کیا" خیر اس وقت تو حضرتؒ نے ملنے ملانے سے معافی مانگ لی مگر اُسی زمانے میں شیخ قمرالدین حسن صاحب مینائی کی شادی میں آسیر مرحوم تشریف لائے اور اس وقت حضرتؒ بھی وہاں موجود تھے۔ باہم تعارف ہوا۔ آسیر مرحوم نے فرمایا کچھ کلام اپنا سنایئے۔ آپ نے انھیں دنوں میں ایک غزل کہی تھی جس میں قافیہ "ہلال" "جمال" "غزال" وغیرہ تھا۔ وہی غزل سنائی۔

آسیر مرحوم نے تعریف کی اور فرمایا "غزال" کے قافیے میں آپ نے خوب خوب شعر کہے ہیں"۔ حضرتؒ نے جوش میں آکر کہا "کیا آپ سمجھتے ہیں اس قافیے میں اب بھی کوئی شعر کہہ سکتا ہے"۔ آسیر مرحوم نے فرمایا "ہاں میاں یہ تو اپنی اپنی فکر اور اللہ کی دین ہے اس قافیے میں اور بھی شعر ہو سکتے ہیں"۔ آپ نے پھر کہا "میرے خیال میں تو اب اس قافیے میں کوئی شعر نہیں کہہ سکتا"۔ آسیر مرحوم نے ملازم کی طرف دیکھا اُس نے قلم دوات اور کاغذ لاکے رکھ دیا اور آسیر مرحوم نے وہیں بیٹھے بیٹھے سترؔ شعر غزال کے قافیے میں لکھ کر حضرتؒ کی طرف کاغذ بڑھا دیا۔ وہ شعر دیکھتے ہی آپ کو ایک سکتا سا ہو گیا اور ستائش کرنے لگے۔ اب آسیر ہی سے تلمذ اختیار کرنے کا تہیہ کر لیا۔ جب درخواست کی تو آسیر مرحوم نے بخوشی منظور کی۔ شاگرد نے پہلے پہل اس زمین میں ۱۸سہ غزلہ اصلاح کیلئے پیش کیا ؎ دل میں جب مہمان خیال زلف جاناں ہو گیا ؛ آنکھ میں خواب پریشاں سنبلستاں ہو گیا۔ اصلاح دیکھی تو بہت سے تصرفات پسند نہ آئے اور استاد سے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ "دو مہینے تک روزانہ مجھے ایک غزل دکھاؤ لیکن اصلاح کے وجوہ نہ دریافت کرو۔ اس کے بعد میں اصلاح کے وجوہ بھی بتا دوں گا"۔ پندرہ بیس غزلوں تک اصلاح دیکھ کر حضرتؒ یہ سمجھتے رہے کہ بننے کے بجائے غزل بگڑ جاتی ہے

لیکن رفتہ رفتہ ہر اصلاح کی خوبی خود ہی سمجھ میں آنے لگی اور دو تین مہینے کے بعد اصلاح کے وجوہ دریافت کرنے کی ضرورت باقی ہی نہ رہی۔

گو استاد نے دو ایک سال کے بعد فرما دیا تھا کہ اب تمھارے کلام میں اصلاح کی ضرورت نہیں رہی مگر جب تک استاد زندہ رہے حضرتؒ اپنا کلام پیش کر کے اصلاح کے لیے اصرار کے ساتھ تمنا ہی کرتے۔

آسیر مرحوم جواہر سخن کے جوہری تھے۔ کلام دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور نہایت التفات اور بزرگانہ شفقت سے اصلاح دیتے جس سے شاگرد کا دل اور حوصلہ بڑھا۔ ادھر عبدالکریم خاں میر نواب موزوں، حسین بخش جرار اور عالی وغیرہ خوش فکر اور مشاق استاد بھائی طبیعت کی لاگ بڑھاتے رہتے۔ تذکروں میں دیکھا اور لوگوں سے سنا بھی ہے کہ بعض نامور شاگرد اپنے اپنے استادوں سے منحرف ہو گئے۔ مشاعروں میں کھلم کھلا مخالفت ہونے لگی مگر حضرتؒ میں جہاں اور بہت سے اوصاف تھے استاد پرستی بھی اُن پر ختم تھی جس طرح سودا نے شاہ حاتم، آتش نے مصحفی، اور ذوق نے شاہ نصیر کا نام روشن کیا کچھ شک نہیں کہ امیرؒ نے آسیر کا نام روشن کیا۔ آسیر سے تلمذ ہونے پر ان کو ایک ناز تھا اور استاد سے خوش اعتقادی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ خلد آشیاں سے یہ طے ہو چکا تھا کہ آسیر ۶ مہینے رام پور میں رہیں گے اور دو سو روپے ماہوار ان کو تنخواہ ملے گی۔ باقی ۶ مہینے جہاں چاہیں رہیں سو روپے ماہوار ملیں گے۔ آسیر مرحوم جب تک رام پور میں رہتے حضرتؒ اپنا کلام اُن کو ضرور دکھاتے تھے۔ وہ فرماتے "میاں امیر اب تو یہ تمھاری زبردستی ہے تم میں علمی قابلیت مجھ سے زیادہ ہے تمھاری تحقیق میری تحقیق سے بڑھی ہوئی ہے۔" یہ کہتے "مجھے اس کی ضرورت ہے آپ ایک نظر دیکھ لیجیے۔" وہ پھر فرماتے "اب تمھارے لیے اس کی

ضرورت نہیں ہے" تو یہ پھر عرض کرتے "آپ دیکھ تو لیجئے کہیں تو قلم لگا دیجئے، زبردستی ہی اصلاح دے دیجئے"۔

ایک دن بستے میں کوئی کاغذ میں ڈھونڈ رہا تھا۔ حضرتؒ کا ایک قصیدہ[1] میری نظر سے گزرا جس میں قافیہ چمن۔ دہن اور ردیف استخوانِ مو تھی۔ اس میں بھی امیرؔ مرحوم نے دو جگہ اصلاح دی تھی۔

---

[1] اتفاق سے اس قصیدے کی ایک نقل میرے ہاتھ آگئی ہے لیکن اس میں جا بجا کتابت کی غلطی ہے اور الفاظ چھوٹ گئے ہیں۔ چند شعر درج ذیل ہیں:۔

کیا ہیں میان باغ بدن استخوانِ مو ۔۔۔ سنبل کے تار برگ سمن استخوان مو

دکھلاتے ہیں سپیدی و ظلمت سے ہم کو روز ۔۔۔ غربت کی شام صبح وطن استخوان مو

خوشبو کی کیا تلاش کہ اپنے بدن میں ہیں ۔۔۔ کافورِ خلد و مشک ختن استخوان مو

جنت میں جیتے جی ہوں کہ پیش نگاہ ہیں ۔۔۔ گیسوئے حور و نہر لبن استخوان مو

تشبیہ ایک یہ بھی ہے سمجھے اگر کوئی ۔۔۔ ہیں دود شمع و شمع لگن استخوان مو

یہ عشق پیچہ ہیں تو وہ شاخیں غزال کی ۔۔۔ رکھتے ہیں کیسے پیچ و شکن استخوانِ مو

بیجا خودی کا کبر ہے منصور روح کو ۔۔۔ دکھلا رہے ہیں دار و رسن استخوانِ مو

عبرت کا ہے مقام سپید و سیاہ دہر ۔۔۔ دکھلا رہے ہیں چاند گہن استخوان مو

کرتا ہے کیا بیان غم انگیز اے امیرؔ ۔۔۔ دکھلائیں یاں سے اور چلن استخوانِ مو

تعریف اس کی چاہیئے اب جس کے فیض سے ۔۔۔ پاتے ہیں پرورش ہمہ تن استخوانِ مو

اس کی ثنا میں رہتے ہیں مصروف صبح و شام ۔۔۔ رکھتے نہیں اگرچہ دہن استخوانِ مو

کرتے ادائے شکر میں ہر دم صدا بلند ۔۔۔ پاتے زباں جو بہر سخن استخوان مو

جس پر ہو لطف خاص تر و تازہ اس کے ہوں ۔۔۔ مانند ابر و نخل چمن استخوانِ مو

ایک روز آسیر مرحوم کی شاعری کا کچھ ذکر آیا۔ جھوم جھوم کر اُن کے یہ دو تین شعر پڑھے ۵

شراب پیر کی طاقت بحال رکھتی ہے　　دوا مریض کو برسوں سنبھال رکھتی ہے
خدا دراز کرے عمر تیغ قاتل کی　　کہ سب سے بڑھ کے ہمارا خیال رکھتی ہے
ہزار دہر میں طوفاں ہو ڈوبتا نہیں میں　　جزیروں پر مجھے گرد ملال رکھتی ہے

اور فرمایا " دیکھو روانی پر کیسا قبضہ تھا۔ جو ترتیب الفاظ نثر میں ہوتی ہے وہی منشی صاحب کی نظم میں ہے "۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی تھا کہ جس دن فن شعر میں کچھ بحث آپڑتی تو پھر استاد اور شاگرد دونوں کی آستینیں مباحثے پر چڑھ جاتیں۔ گھنٹوں بحث رہتی۔ ۱۲ بجتے ایک بجتا بار بار یاد دلایا جاتا کہ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ یہی جواب ملتا کہ ٹھہرو آتے ہیں اور دونوں بحث کو ختم ہی کر کے اٹھتے۔

جس پر کہ مثل برق غضب کی پڑے نگاہ　　جل جائیں مثل چوب رسن استخوانِ مو
حق نے دیا وہ حسن کہ اعضا کا ذکر کیا　　ہیں خوبصورتی میں دلہن استخوانِ مو
فانوس و شمع، نکہت و گلزار، شیر و موج　　پہلو و قلب، جان و بدن، استخوانِ مو
خوف عدو بجا ہے کہ ہیں اس کے واسطے　　کافور اور تار کفن استخوانِ مو
کرتی ہے ریزہ ریزہ وہ شمشیر وقت جنگ　　پر تو سے بھی میان بدن استخوانِ مو
تیزی وہ اسپ میں ہے کہ شعلہ ہیں برق ہیں　　اعضائے تن تو کیا ہمہ تن استخوانِ مو
تیزی سے طے کرے وہ سپید و سیاہ دہر　　جب تک ہوں آشنائے دہن استخوانِ مو
کیا ہو بیان فیل کی زور آوری کہ ہیں　　مستک کی طرح قلعہ شکن استخوانِ مو
وقت دعا ہے دست دعا اب بلند ہوں　　جب تک کہ ہیں مصاحب تن استخوانِ مو
یارب ہوں دست کیلئے دشمن کے واسطے　　صبح امید و شام وطن استخوانِ مو

لطیفہ :- ایک بار آسیر مرحوم نے فرمایا "دہلی میں فاتحے کو مونث بولتے ہیں میری رائے میں مونث ہی بولنا اچھا معلوم ہوتا ہے" اور اس پر اصرار کیا چند روز کے بعد مشاعرے کی طرح میں آسیر مرحوم نے غزل کہی اس میں ایک شعر کا دوسرا مصرع تھا۔ ع۔ تیری تربت پہ فاتحہ کو کن ہوا۔ حضرتؒ نے پوچھا "آپ تو فاتحے کو مونث ہی بولنا پسند کر چکے تھے"۔ مسکرا کر کہنے لگے "مگر شعر کہتے وقت تو مذکر ہی کہنا بھلا معلوم ہوا"۔

اس قسم کی بحثوں اور تحقیقات کا ایک واقعہ عزیزی مولوی صدیق الزماں سلمہ اللہ تعالےٰ (نبیرۂ حضرتؒ) نے یوں لکھا ہے :-

"رام پور میں ہم لوگ مولوی عظیم الدین صاحب مرحوم (خلف مولوی غیاث الدین صاحب مرحوم مصنف غیاث اللغات) سے پڑھتے تھے۔ میں چلّا چلّا کر "ماند" کی گردان پڑھ رہا تھا حضرت مرحوم و مغفور بنگلے میں بیٹھے ہوئے سن رہے تھے۔ مجھے بلایا اور اس کے بعد مولوی صاحب موصوف سے تحقیق شروع ہوئی کہ اس لفظ کا تلفظ "ماند" ہے یا "مُند" ہے مجھے یہ تو صحیح یاد نہیں کہ فیصلہ کیا ہوا لیکن یہ اچھی طرح یاد ہے کہ ۲ بجے کے عمل سے تحقیقات شروع ہوئی تو گفتگو اور تلاش حوالہ جات و کتب و امثال وغیرہ میں اتنا وقت صرف ہوا تھا کہ عصر کا وقت جا رہا تھا مجبوراً نماز کے لیئے بحث چھوڑ چھاڑ کر کھڑا ہونا پڑا تھا"۔

ایک اور واقعہ میں نے برادرم منشی عبدالرحمٰن صاحب تسبل مرحوم سے سنا کہ حضرتؒ لکھنؤ میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک دن چوک کے قریب جا رہے تھے کہ اُدھر سے ایک بوڑھی عورت یہ کہتی ہوئی گزری اور حضرتؒ نے اتنا سُن لیا "گھر میں نہیں دانے بھیا چلے بھُنانے"۔ پہلے تو کچھ دور نکل گئے پھر خیال آیا کہ اس مثل کا صحیح محل استعمال

تحقیق کر لینا چاہیئے۔ چنانچہ الٹے پاؤں واپس ہوئے اور تیز قدمی سے اس عورت کے قریب پہنچ کر دریافت کیا کہ اس نے اس مثل کا استعمال کس محل پر کیا تھا۔

اللہ اللہ کیسے مقدس لوگ تھے۔ کس قدر پاکیزہ خیالات اور کیا ذوق سلیم تھا اور کہاں تک نظر پہنچتی تھی۔ اب تو اس نئی روشنی کے زمانے میں کسی سے تلمذ اختیار کرنا لوگ اپنی کسر شان سمجھتے ہیں اور غلطی کی پروا صحت کا خیال نہیں کرتے۔

غرض یہ وہ زمانہ تھا کہ لکھنؤ میں آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ اسیرؔ۔ وزیرؔ۔ میر دوست علی خلیلؔ۔ میر وزیر علی صباؔ کی غزلوں پر مشاعروں میں بے حد تعریفیں ہوتی تھیں جس نے آگ پر تیل کا کام کیا۔

اب حضرتؒ بھی بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ ان کی نازک خیالی اور معنی آفرینی سے کلام کی دھوم مچ گئی۔ اچھے اچھے شاعر مشتاق رہنے لگے۔ اور اونچے اونچے لوگ قدردانی فرمانے لگے جس کے تقاضے سے حضرتؒ مشاعروں میں بیشتر ایک غیر طرحی غزل بھی بطور پیش خوانی پڑھتے تھے۔ نسیم دہلوی کے صاحبزادے نے اپنا معمول یہ کر لیا کہ جس زمین میں حضرتؒ غیر طرحی غزل پڑھتے اُسی زمین میں وہ بھی غیر طرحی غزل آئندہ مشاعرے میں پڑھتے۔ حضرتؒ کو ان کی یہ حرکت جو واقعی قابل ناگواری تھی ناپسند ہوئی اور آپ نے ایک زمین میں کئی سو شعر کہہ لئے اور مسلسل اُسی زمین میں غیر طرحی غزل پڑھتے رہے۔ دو ایک مشاعروں تک تو نسیمؔ کے صاحبزادے نے ہمت کی لیکن بالآخر مجبور ہو کر خموش ہو گئے اور حضرتؒ سے معافی چاہی۔

ایک بار نواب اصغر علی خاں نسیمؔ مغفور شاگرد مومنؔ مرحوم کے یہاں مشاعرہ اور یہ طرح تھی ع سختی پہ بھی نرم گفتگو کی۔ اب دیکھئے ایک نوجوان اپنی شاعری کی ابتدا میں کیا کہتا ہے امیرؔ

لذت جو ملی مرے لہو کی — خنجر نے بلائیں لیں گلو کی
آنکھیں دم قہر جنگ جو کی — تیغیں ہیں بھری ہوئی لہو کی
کی دل شکنی نہ تند خو کی — سختی پہ بھی نرم گفتگو کی
موسےٰ سے کہو کہ چپ رہیں اب — باری ہے ہماری گفتگو کی
روئے مری قبر پر وہ آکر — ہم خاک ہوئے تو آبرو کی
منھ اپنا نہ آرسی میں دیکھو — سنبھلے گی نہ چوٹ روبرو کی
کی جس پہ نگاہ تجھ کو دیکھا — اب تک تو نظر کہیں نہ چوکی
جز دیر و حرم کہاں میں جاؤں — راہیں تو یہی ہیں جستجو کی
جائے گا جنوں نہ سر سے بے ذبح — ہو فصد مری رگ گلو کی
ساقی نے سنگھائی غش میں مٹی — سوندھی سوندھی مجھے سبو کی
تن ہے غم زلف میں یہ لاغر — ہر عضو بدن گرہ ہے مو کی
تھا چار طرف اُسی کا جلوہ — کیوں نعش ہماری قبلہ رو کی
پلکیں دم جوش خوں فشانی — دھاریں نظر آتی ہیں لہو کی
اُس رخ کو میں آئینہ کہوں کیا — ہے یہ تو مثال روبرو کی
وہ مست ازل ہوں ساقیا میں — مٹی ہے خمیر میں سبو کی
دل ہی نہ رہا امید کیسی — جڑ کٹ گئی نخل آرزو کی
اب کیوں ہیں کلیم غش میں خاموش — پہلے نہ سنبھل کے گفتگو کی
لا کہکے دہن کو ہم ہوئے نیست — دو حرف میں ختم گفتگو کی
کیسی ارنی کہاں کے موسےٰ — خود دید کی اپنی آرزو کی

تھا پردۂ ظاہری جو منظور　　آواز بدل کے گفتگو کی
کلفت نہ مٹی امیر دل سے
اشکوں نے ہزار شست و شو کی　　(مرآۃ الغیب)

جب یہ شعر پڑھا سے دل ہی نہ رہا الخ وزیر مرحوم بے اختیار بول اٹھے "امیر بڑے خوش قسمت ہو خوب اسیر کیا"۔ پھر تو وزیر مرحوم نے بہت ڈورے ڈالے بار بار دام بچھائے مگر یہاں تو بڑے بول کا جواب یاد تھا اور طائر دل حضرت امیر کا شکار ہو چکا تھا۔

حضرت فارغ التحصیل ہو چکے تھے اور شعر و سخن سے دلچسپی بہت بڑھ گئی تھی۔ اپنے استاد ہی کے پاس زیادہ اٹھتے بیٹھتے اور اسی سلسلے میں استاد کے مکان پر فتح الدولہ برق۔ آفتاب الدولہ قلق۔ مقبول الدولہ مقبول وغیرہ مصاحب خاص اور بالانشین دربار شاہ اودھ سے بھی صحبتیں رہنے لگیں جس سے فن شعر کے اصول و رموز میں واقفیت بڑھتی رہی۔ حضرت کے اوصاف حمیدہ اور عادات پسندیدہ اور فن شعر سے ذوق و شوق اور ان کو ہونہار دیکھ کر استاد بھی بہت شفقت فرمانے لگے اور اپنے بیٹوں کی طرح اُن کو چاہتے تھے۔ چونکہ امیر مرحوم ان دنوں بادشاہ کے میر منشی اور رفیق بااختصاص تھے اُن کو خیال رہتا تھا کہ عزیز شاگرد کو بادشاہ کے دربار تک پہنچائیں تاکہ شاگرد کو زیادہ ناموری اور ذاتی اعزاز حاصل ہو۔ ایک[1] روز فرمایا کہ "میاں امیر ندرۃ السلطنتہ عرف نادر میرزا (یہ ایک شاہزادے تھے جن کو سلطان عالم بہت چاہتے تھے) کی تعلیم کے واسطے میں نے ایک معلم مقرر کر دیا تھا۔ مولوی صاحب کی شامت جو آئی

[1] یہ واقعہ خود حضرت کی زبانی میں نے سُنا۔

ایک دن شاہزادے کو ڈانٹ ڈپٹ دیا جس پر مولوی صاحب کو چار پائی میں باندھکر کوڑے لگائے گئے۔ اس کے بعد پتا نہیں کہ مولوی صاحب کیا ہوئے۔ بادشاہ سلامت کئی بار دوسرے معلم کے لیئے مجھ سے کہہ چکے ہیں۔ کیا تم ندرۃ السلطنۃ کو پڑھانا منظور کرتے ہو۔" حضرتؒ نے کہا "ڈر معلوم ہوتا ہے۔ کہیں اُن مولوی صاحب کی طرح میری بھی سزا نہ ہو جائے۔" فرمایا "نہیں مجھے یقین ہے کہ تم شاہزادے کو پرچا لوگے۔"

دوسرے دن آسیر مرحوم نے حضرتؒ کو شاہزادے کے یہاں عشق منزل میں پہنچوا دیا۔ شاہزادے صاحب محلسرا میں تھے۔ مولوی صاحب کی اطلاع کرائی گئی اور شاہزادے کے لکھنے پڑھنے کے کمرے میں مسند بچھادی گئی جس پر ایک طرف مولوی صاحب بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک خواص خاصدان رکھ گئی دوسری اگالدان لائی اس کے بعد رحل اور مشجر کے جزدان میں ایک کتاب آئی۔ دیر کے بعد شہزادے صاحب کی آمد آمد ہوئی۔ برآمد ہوئے تو اس شان سے کہ ایک خواص اپنے ہاتھوں پر اُن کے پائنچے لئے ہوئے۔ کمرے میں پہنچے تو مولوی صاحب کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر سلام کیا۔ مولوی صاحب نے مسند سے اٹھ کر تعظیم دی۔ شہزادے صاحب مسند پر دوسری جانب بیٹھ گئے۔ خواص نے سامنے قرینے سے پائنچے ڈھیر کر دیئے۔ مزاج پرسی کے بعد مولوی صاحب نے دل لبھالینے والی باتیں شروع کیں۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی دلچسپ صحبت کے بعد شہزادے صاحب کو چھٹی مل گئی۔ دوسرے دن بھی یہی کیفیت رہی۔ تیسرے دن شہزادے نے خود ہی پوچھا "مولوی صاحب آپ ہم سے پڑھنے کو نہیں کہتے ہیں۔" مولوی صاحب بولے "میرے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ شہزادے ہیں سلطنت کے کاموں کے لیئے لکھنا پڑھنا کس قدر ضروری بات ہے

اس کو آپ خود سمجھتے ہیں"۔" اچھا تو اب ہم پڑھیں گے" یہ کہہ کر کتاب جو تین جزو دانوں کے اندر تھی نکال کر کھولی تو الف بے سے بخیر سبق شروع ہوا۔ اب شہزادے کا یہ حال ہو گیا کہ صبح ہوئی اور مولوی صاحب کا انتظار شروع ہو گیا۔ دوپہر ڈھلی اور بار بار دریافت فرما رہے ہیں "دیکھو مولوی صاحب آئے؟" "جب آئیں فوراً اطلاع کرو"۔ حضرتؒ نے شہزادے کو پڑھانے کے لیے ایک انشا بھی لکھی جس کا نام انشائے نادری رکھا۔ رفتہ رفتہ شہزادے کے اس شوق کی خبر بادشاہ سلامت کو ہوئی تو ایک دن آپ سے سر حرم سے فرمانے لگے "بھئی یا تو ندرۃ السلطنۃ دن رات میں کسی وقت محل سے نکلتا ہی تھا اور کھیل کود میں پڑا رہتا تھا یا اب میں سنتا ہوں کہ دن بھر باہر ہی رہتا اور لکھتا پڑھتا رہتا ہے۔ امیر احمد نے تو اُسے خوب ڈھنگ پر لگایا ذرا ہم بھی ان کو دیکھنا چاہتے ہیں"۔

یہ تائید ایزدی تھی کہ اس باعزت عنوان سے شرف حضوری حاصل ہوا۔ حضرت نے مدح میں قصیدہ پیش کیا۔ بادشاہ سلامت سن کر بہت خوش ہوئے۔ بہت تعریف فرمائی اور سات پارچے کا خلعت مرحمت ہوا۔

ایک دن حکیم عبدالکریم خاں برہم کا خط آیا جس میں انھوں نے آخر کا مصرع لکھ کر پورا قطعہ مانگا تھا۔ میں نے پوچھا "حضرت یہ قطعہ کب اور کس موقع پر کہا گیا تھا"۔ فرمایا "ایک روز سلطان عالم نے سر دربار ارشاد فرمایا کہ اس مضمون کو (معشوق نے مجھے تو حقہ دیا اور رقیب کو بوسہ دیا یہ کیا بے انصافی کی) نظم کرو اور ابھی سناؤ۔ میں نے اسی وقت یہ قطعہ کہہ کر سنایا تھا"۔ ؎

مجھ کو حقہ دے کے ٹالا غیر کو بوسہ دیا　　　دیکھتا جا اور مرے دم باز اپنے طور کو

کس کا حصہ دے دیا کسکو زرا انصاف کر | دو ڈبے حلوا مجھے حلوائے بے دو داور کو

اسی ضمن میں یہ بھی ذکر فرمایا کہ "ایک دن بادشاہ کلی پی رہے تھے - ارشاد ہوا بھلا کلی کی تعریف میں تو کچھ کہو - میں نے اُسی دم تعمیل ارشاد میں یہ قطعہ موزوں کر کے سنایا"

ساقیا پھول سے کیا کام کلی پیتے ہیں | جس کی بو ہمسری نشۂ مُل کرتی ہے
دیکھنے میں تو ہے اک شاخ مگر واہ رے شاخ | دہن تنگ کو غنچہ کبھی گل کرتی ہے

اسی زمانے میں بادشاہ کو کبوتر اڑانے کا شوق ہوا اور نواب علی نقی خاں وزیر مخاطب بہ حضور عالم سے شد ہوئی - وہ مد مقابل قرار پائے - کہتے ہیں کہ کبوتر اس کثرت سے پالے گئے تھے کہ کبوتر باز زنا کے ذریعے سے کبوتر اڑاتے تھے - حضرتؒ نے بادشاہ سلامت کے کبوتروں کی تعریف میں ایک مثنوی (کبوتر نامہ) کہہ کر پیش کی - اس مثنوی میں پورے دو سو شعر ہیں - پوری مثنوی کا یہاں نقل کرنا تو ممکن نہیں لیکن چونکہ مثنوی غیر مطبوعہ ہے اور نایاب ہو رہی ہے اس لئے مختلف عنوانات سے کچھ کچھ شعر بطور نمونہ لکھے جاتے ہیں :-

حمد

گردان حمامۂ قلم کی | پرواز ہے طایٔر رقم کی
لکھتا ہے یہ حمد خالق پاک | عاجز ہیں جہاں طیور ادراک
کھیل اس کا ہے خلق ہفت اختر | چھتری ہے فلک یہ سب کبوتر
خاکی کو سپہر پر دیا گھر | بے بال و پری میں لگئے پر

نعت

شہباز سر سمائے سرمد | جن کا کہ ہے اسم پاک احمد
پہنچے جو زمیں سے آسماں تک | پھر اوج سما سے لامکاں تک

جبریل بھی ساتھ سے رہے باز | بیٹھے سر سدرہ وقت پرواز

حاکم ہو جو باز دوئے پیمبر | کیا صید ہو باز کا کبوتر — منقبت

وہ بال ہمائے اوج دولت | وہ شہپر طائر ریاست — مدح
جاری ہیں طیور پر بھی فرماں | بے شبہ ہے ثانی سلیماں
گر ظل ہما کہوں خطا ہے | حقا کہ وہ سایۂ خدا ہے

بادشاہ کبوتروں کا شوق کرتے ہیں

بازاروں میں جا بجا اڑی دھوم | لو چمکے کبوتروں کے مقسوم
سلطاں ہے کبوتروں کا خواہاں | پریوں کا ہے مشتری سلیماں
سن کر یہ خبر ہر اک زباں سے | طایر نکل آئے آشیاں سے
دھیان آیا ہما کو بھی یہ اکثر | افسوس کہ میں نہیں کبوتر
تھے جن کے گھروں میں کچھ کبوتر | سرخاب کا ان میں لگ گیا پر
آساں نہ کسی کو ہاتھ آئے | ان یوسفوں نے کنویں جھنکائے
مشکل سے یہ خوش جمال پائے | گدڑی میں گئے تو لال پائے
کیا مدح ہو ان کی مجھ سے تحریر | بیضاوی سے بھی نہ ہو گی تفسیر

در صفت سبز

سبزوں کے یہ سبز ہیں پر و بال | مدحت میں زباں ہے سبزہ سال لال
سبزی کا ہے ان کی یہ وتیرا | فیروزہ بھی جس پہ کھائے ہیرا

روشن ہے شرافت ان کی بالذات — گویا ہیں یہ سبز پوش سادات
بیٹھے تو تمام جا ہوئی سبز — اٹھے تو نظر پڑی ہوا سبز

در صفت لال

دیکھے جو یہ لال آتشیں رنگ — مرد آتش لعل ہو تہ سنگ
لالوں کا یہ رنگ ہے ہوا پر — افواج فرنگ ہے ہوا پر
سوہا یہ حسیں پہن کے آئے — بے آگ جہاں کے دل جلائے

در صفت زرد

نیرنگ نیا دم رستم ہو — شاخ گل جعفری قلم ہو
چھتری زردوں کی آسماں ہے — کیا مہر میں شاخ زعفراں ہے
دیکھ آکے انھیں اگر نظر ہے — کچھ تجکو بسنت کی خبر ہے

در صفت گل

پیارے ہیں عجب گلی کبوتر — گل کھاتے ہیں جن پہ ماہ پیکر
نزہت کا ملے ہیں منہ پہ غازہ — گلدستہ بندھا ہوا ہے تازہ
گل سے رنگیں ہر ایک شہپر — تصویر بہار ہے ہوا پر
حلقے نہیں ان کے بال و پر میں — گل دام چھپائے ہیں کمر میں

در صفت تاج

لقا ہے جوان میں مہ لقا ہے — مہتاب چکور ہو رہا ہے
خورسند ہو کیوں نہ طبع گل کی — گردن میں لچک ہے شاخ گل کی
رکھتے ہیں قدم زمیں پہ تن کے — دکھلاتے ہیں رنگ بانکپن کے

در صفت بڑی

پیدا ہیں یہ نگ ڈھنگ سارے   دن کو نکل آئے ہیں ستارے

در صفت جوگیا

سر بسکہ ہے اس ہوا سے معمور   جوگی ہوئے جوگیے ہیں مشہور

در صفت خرقہ بند

نایاب ہیں خرقہ بند ایسے   کامل کوئی خرقہ پوش جیسے
پر مارتے ہیں جو وقت پرواز   آتی ہے خدا خدا کی آواز

در صفت لال منی

ہیں قابل دید چشم بد دور   نکلا ہے بہشت سے رخ حور
مرجان کی شاخ پر گہر ہیں   یا چاند شفق میں جلوہ گر ہیں

در صفت نیلا

محبوب ہیں سب کے یہ نکیلے   بوسوں کے سبب ہوئے ہیں نیلے

در صفت زاغ

معراج کی رات ہیں یہ بے داغ   آنکھوں میں ہے انکی کحل مازاغ

در صفت گھاگھرا

اڑتے نہیں گھاگھرے برابر   بہتی ہے یہ گھاگھرا ہوا پر

در صفت دودھیا

دیکھے جو یہ دودھیا کبوتر   بھولے ابھی طفل شیر مادر

در صفت پنوریا

پان ان کے جو دیکھ کر ہو مسرور   عالم میں وہ سرخرو ہو مشہور

بانکے ہیں غضب کے خرونو کے | کھائے وہ سناں جوان کوٹو کے
اسی طرح اور مختلف قسموں مثلاً "خال" "سوسنی" "سیہ چپ" "سیمابی" "ریختہ" "تفتہ" وغیرہ کی تعریف لکھی ہے اور کئی کئی شعر میں۔ پھر کبوتروں کی جنگ کا نقشہ دکھایا ہے اور اس نوج کی تعریف کی ہے۔ آخر میں بادشاہ کی مدح کرتے ہوئے دعا ہے۔

کیا فوج یہ رنگ رنگ کی ہے | تدبیر ہوا پہ جنگ کی ہے
پائی ہے کسی نے سرخ وردی | پوشش ہے کسی کی لاجوردی
ہے جمع ہر ایک رنگ کی فوج | کچھ چین کی کچھ ہے زنگ کی فوج
جوگی کی طرح اڑیں گے کیا کیا | رکھ رکھ کے دہن میں اپنی گٹکا
دکھلائیں گے سیر لشکروں کی | تلواریں چلیں گی شہپروں کی
غٹ غوں غٹ غوں پکارتے ہیں | شیروں کی طرح ڈکارتے ہیں

. . . . | . . . .

عیدی کا تباہ ہوگیا ساتھ | کٹی ہے نقط غریب کے ہاتھ
سر کھو ہو کھی سے خاک کوئی | ہے نسر فلک کو حیلہ جوئی

. . . . | . . . .

اس فوج کی دھوم ہو نہ کیونکر | سلطاں کی ہے چشم لطف ان پر

. . . . | . . . .

رکھتا ہے امیر بھی تمنا | اس باغ کا دیکھ لے تماشا
بینائی دل ہے صاف روشن | دل بھی ہے کبوتر ایک لوٹن
بے بال و پری سے یوں ہے مضطر | جس طرح سے پر کٹا کبوتر

دعا

بالائے سپہر نسر طائر — پرواز پہ جب تلک ہے قادر
جب تک کہ ہے کبک مہ خراماں — ہے نوری مہر نور افشاں
سلطاں کی رہے ظفر خداساز — کنجشک عدو ہو عزم شہ باز
ہو تابع حکم چرخ اخضر — شیرازی روز و شب مسخر
احباب جو ہوں نواختہ ہوں — دشمن کے حواس باختہ ہوں

یہ جو کہتے ہیں کہ شاعر کو ہمہ داں ہونا چاہیئے اس کی ایک مثال یہ مثنوی بھی ہے لکھنؤ کا چڑیا خانہ مشہور زمانہ تھا اور خود بادشاہ کو اُس سے بڑی دلچسپی تھی مثنوی سنکر بہت ہی خوش ہوئے اور کافی صلہ دے کر حضرت کو بھی خوش کر دیا۔ اس کے بعد بادشاہ کی کتاب "صوۃ المبارک" کی شرح لکھی اور اس کا نام "نغمۂ قدسی" رکھا۔ جس کی دربار شاہی میں بہت قدر کی گئی۔ اس تصنیف سے حضرتؒ کی فنِ موسیقی میں بھی معلومات و واقفیت کا پتا چلتا ہے۔

اس کے بعد سے کبھی کبھی شرف حضوری اور کبھی کبھی مشاعرے میں شریک ہونے کا افتخار بھی حاصل ہونے لگا۔ ایک بار یہ طرح تھی۔ ع۔ بٹ رہا ہے شربت دیدار قیصر باغ میں
اس زمین میں یہ غزل کہی تھی۔

کس کے چمکے چاند سے رخسار قیصر باغ میں — چاندنی ہے سایۂ دیوار قیصر باغ میں
فی الحقیقۃ یہ بھی کم گلزار جنت[لہ] سے نہیں — حوریں پھرتی ہیں سر بازار قیصر باغ میں

لہ بزرگوں سے سنا ہے کہ سلطان عالم کے عہد میں قیصر باغ فی الحقیقۃ جنت ارضی ہو رہا تھا۔ اُن غنچوں اور جلسوں میں رہنے والے کہتے تھے ؎ اگر فردوس بر روئے زمین است؛ ہمین است د

ہر روش پر چل رہی ہے ایسی صحت کی ہوا　　چشم نرگس تک نہیں بیمار قیصر باغ میں

ہمین است وہمین است۔ وہاں کی ایک بہت ہی معمولی بات یہ تھی کہ رات کو پریاں ناچتی تھیں تو صبح کو فراش ان کی پوشاک سے گرا ہوا سیروں مقیش اور بادلا جھاڑ کرلے جاتے تھے۔ ان رنگ رلیوں اور عیش وعشرت کے مرقعوں کی یاد رام پور میں بھی بہت دنوں تک حضرتؒ کے دل کو بےچین کرتی رہی ؎ امیر افسردہ ہو کر غنچۂ دل سوکھ جاتا ہے ؎ وہ سیلے ہم کو قیصر باغ کے جب یاد آتے ہیں۔ لکھنؤ میں نہ رہنے کا سبب بیان کرتے ہیں ؎ ہے لکھنؤ کی جان تو کلکتے میں امیر ؎ خاک آئے میری آنکھ کو اب لکھنؤ پسند۔ وہ عجب داد ودہش کا زمانہ اور لکھ لٹ کارخانہ تھا۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ ایک بار میر مدد علی دفتری نے منشی صاحب (امیر مرحوم) سے یہ عرض کی کہ اس کی دو جوان لڑکیاں ناکتخدا بیٹھی ہیں۔ کچھ ایسی مدد کیجیے کہ اس فرض سے سبکدوشی ہو جائے۔ فرمایا اچھا میں خیال رکھوں گا۔ خدا کرے جلدی کوئی موقع مل جائے دس پانچ دن کے بعد اتفاق سے ایک روز بادشاہ نے فرمایا "میاں امیر میرے یہاں شاعر بہت سے ہو گئے ہیں اور میرے خیال میں ان میں سے اکثر بنائے اور بنے ہوئے شاعر ہیں میں چاہتا ہوں کہ آج ایک مشاعرہ ہو بلکہ اسی وقت ہو" اور یہ فرماتے ہی حکم ہوا کہ "جو شاعر دربار میں حاضر ہوں سب یہیں بلائے جائیں"۔ جب سب جمع ہو گئے تو فرمایا "بھئی میں یہ چاہتا ہوں اس وقت ایک مشاعرہ ہو۔ یہ طرح ہے سب لوگ یہیں بیٹھ جاؤ اور شعر کہو۔ مدد علی سب کے سامنے کاغذ اور قلم دوات رکھ دو"۔ خدا جانے کس قدر ادب اور کیسا انتظام رہتا تھا کہ حکم کی دیر تھی سب کے سامنے کاغذ اور قلم دوات رکھدی۔ قلمدانوں کا تو کیا کہنا مگر جس کے سامنے صرف دوات تھی وہ بھی نہایت خوشنما اور کوئی نہ کوئی بات اس میں بھی تھی اب جو شاعر حقیقت میں خود کچھ نہ کہہ سکتے تھے ان کے ہوش اڑ گئے بہت پریشان ہوئے آخر کچھ سوچ کر ایک نے پہل کی اور ایک کاغذ کی چٹ پر منشی صاحب (امیر مرحوم) کو لکھا "آج آبرو آپ کے ہاتھ ہے" اور میر مدد علی سے خوشامدانہ لہجے میں کہا "ذرا منشی صاحب تک اسے پہنچا دو"۔ اسے دیکھ کر منشی صاحب نے کہا "کچھ چٹیں کاغذ کی لا کر میرے پاس رکھ دو" اب میر مدد علی کی بن آئی۔ کسی چٹ پر ایک دو شعر کسی پر تین شعر منشی صاحب لکھ دیتے اور دفتری صاحب لے جاتے پہلے کچھ لے لیتے تب وہ چٹ دے دیتے۔

پابوکا پاؤں کر کیسا صاف ہے ایسی زمیں   دل پھسلتے ہیں دمِ رفتار قیصر باغ میں

دیر تک یہ دور رہا۔ ایک بار بادشاہ سلامت متوجہ ہوئے اور فرمایا "کیوں بھئی سب لوگ کہہ چکے اب مشاعرہ شروع ہو" سب نے اپنے اپنے شعر سنائے۔ بادشاہ سلامت خوش ہوئے اور وہ صحبت بخیر و خوبی برخاست ہو گئی۔ باہر نکلے تو مددعلی نے روپوں اور اشرفیوں سے اپنا دامن بھرا ہوا دکھا کر کہا "منشی جی یہ آپ کی بدولت ہے" فرمایا چلو اچھا ہوا بھئی اب تمھاری لڑکیوں کا عقد ہو جائے گا۔"

ایک بار راجا سید حامد حسن خاں (ممکن ہے کہ میں نام بھولتا ہوں) بقایا مالگزاری کی علت میں قید ہو گئے ان کے عزیز و احباب میرے (حضرتؒ) پاس آئے اور کہا منشی صاحب (امیر مرحوم) سے کہئے کچھ ایسی تدبیر کریں کہ راجا صاحب رہا ہو جائیں۔ میں نے منشی صاحب سے عرض کیا۔ فرمایا "راجا صاحب سید ہیں مجھے خود خیال ہے مگر موقع کا منتظر ہوں"۔ اتفاق سے انھیں دنوں کسی تقریب کا جشن ہوا۔ بادشاہ سلامت روشنی دیکھنے کو کوٹھے پر چڑھے منشی صاحب سے پوچھا "کیوں منشی جی یہ جشن کیسا رہا"۔ عرض کی "جہاں پناہ بہت ہی اچھا" فرمایا "میرا یہ مطلب ہے کہ نصیرالدین حیدر کے عہد میں (بادشاہ کو اس عہد سے خدا جانے کیوں چشمک تھی) ایسا جشن کوئی ہوا تھا"۔ عرض کی "جہاں پناہ بھلا ان دنوں یہ سامان آرائش و زیبائش ایسی داد و دہش کہاں تھی۔ بس ایک بات کی کسر ہے اگر وہ بھی ہو جائے تو ایک نرالی بات ہو گی"۔ بادشاہ سلامت نے بہت ہی اشتیاق سے پوچھا "ہاں ہاں بھئی کہو وہ کیا"؟ عرض کی "ایک سید زادہ راجا حامد حسن خاں بقایا مال گزاری کی علت میں قید ہے وہ رہا کر دیا جاتا"۔ ارشاد ہوا "ضرور رہا کر دیا جائے"۔ یہاں تو قلمدان ہر وقت ساتھ ہی رہتا تھا حکم لکھا اور دستخط کرا کے پروانہ جاری کر دیا۔

ایک دن بادشاہ سلامت نے فرمایا "پریوں کے جوڑے تو ایک طرح کے بن گئے میں چاہتا ہوں سب کے زیور بھی ایک ہی طرح کے تیار ہوں۔ آفتاب الدولہ (قلق) یہ کام میں تمھارے سپرد کرتا ہوں جتنا سونا وغیرہ درکار ہو لے لو"۔ غرض زیور تیار ہوا۔ پریوں نے پہن کر مجرا کیا دعائیں دیں۔ بادشاہ سلامت دیکھ کر مسکرا دیئے۔ کئی مہینے کے بعد ایک روز جب منشی صاحب کچھ کاغذات پیش کرنے کو بادشاہ سلامت کے پاس جانے لگے تو قلق مرحوم نے ایک کاغذ کا پرچہ دیکر کہا "منشی جی ذرا ہمارا بھی یہ حساب پیش کر دینا"۔ منشی صاحب نے اس کاغذ پر سرسری نظر ڈال کر کہا "بھئی میں اس کو نہیں پیش کر سکتا"۔ آفتاب الدولہ مرحوم بولے "اجی تم تو ناحق ڈرے جاتے ہو لاؤ ہم آپ پیش کرلینگے" اور وہ حساب لیے ہوئے ساتھ ہی ساتھ چلے گئے۔

بند جب ٹوٹیں شکست توبہ کی آئے صدا | لیں اگر انگڑائیاں میخوار قیصر باغ میں
تشنگانِ شوق ہیں شیریں لبوں کے میہماں | بٹ رہا ہے شربت دیدار قیصر باغ میں

جب منشی صاحب اپنے کاغذات پیش کر چکے تو عرض کی "سلطان عالم ایک ذرا سا حساب میرا بھی ہے" بادشاہ نے وہ پرچہ لے لیا اور دیکھ کر فرمایا "آفتاب الدولہ یہ تین لاکھ کے سونے میں پچاس ہزار کا سونا چھیچ میں گیا؟" دست بستہ عرض کی "غلام کو تو کوئی اور طریقہ کھانے کا معلوم نہ ہوا" بادشاہ نے مسکرا کر صاد کر دیا۔

رات کو اندر سبھا وغیرہ کے ناٹک میں پریاں گیروے کپڑے پہنے جوگنوں کا بھیس بدلے بین بجاتی یہ گاتی ہوئی آپ کو ڈھونڈھتی پھرتی تھیں "میں تو جانِ عالم کو میں تو سلطان عالم کو، ڈھونڈن چلیاں۔ کپڑے بھی رنگے، جوگن بھی بنی، در در میں پھری سیاں کے لیے۔

عبرت ۱۸۹۵ء میں مڈل کلاس کا امتحان دینے میں لکھنؤ گیا تھا۔ اور قیصر باغ میں اپنے چچا مرحوم کے پاس ٹھہرا تھا۔ باغ (کبھی تھا) کے وسط میں سنگ مرمر کی مشہور بارہ دری (جس میں امتحان ہوا تھا) اور جا بجا چمنوں میں سنگ مرمر کے بہت چھوٹے چھوٹے نہایت خوبصورت بنگلے سے بنے تھے معلوم ہوا کہ رات کو جانِ عالم (بادشاہ) انھیں میں سے کسی بنگلے میں چھپ جاتے تھے اور پریاں ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔ دوپہر کی چھٹی میں بارہ دری سے اپنی فرودگاہ پر جاتے ہوئے میں نے دیکھا کہ انھیں میں سے ایک بنگلے میں کتا سو رہا تھا! اس قیصر باغ میں جہاں شاید پرندوں کے بھی پر جلتے ہوں گے، کوڑے کرکٹ کی بھی گاڑیاں آتی جاتی دیکھیں ؎

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے | زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے
نہ گُل ہیں نہ غنچے نہ بوٹے نہ پتے | ہوئے باغ نذر خزاں کیسے کیسے (امیر)

ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

ایک برہمن راجا نے مالگزاری نہ ادا کی تو گرفتار ہو کر قید کر دیئے گئے۔ دو چار دن کے بعد سلونو (رکھشا بندھن) کا تیوہار پڑا۔ راجا نے کسی ذریعے سے اپنے گھر سے ایک عمدہ راکھی تیار کرا کے منگوائی اور پہرے والوں کو راضی کرکے پہنچتے ہی دیوان جی کے ہاتھ میں راکھی باندھ دی۔ دیوان جی مسکرا دیئے اور پوچھا "واصلباتی نویس راجا صاحب کے ذمے کتنی مالگزاری باقی ہے"۔ کہا "ایک لاکھ"۔ دیوان جی نے کہا آج کی تاریخ میں ایک لاکھ راجا صاحب کے جمع کر لیے جائیں اور جیب خاص کے خرچ میں ڈال دو"۔ راجا صاحب کہا جائیے راجا صاحب سید لیکر پیش کر دیجئے"۔

نخلِ گُل ہے ہر تماشائی زہے فیضِ بہار | پھول جھڑتے ہیں دمِ گفتار قیصر باغ میں
سبزۂ خوابیدہ کیسا آگیا جو خفتہ بخت | اس کے طالع ہوگئے بیدار قیصر باغ میں
اے دلِ مایوس بے برگی سے افسردہ نہ ہو | لائے گا نخلِ تمنا بار قیصر باغ میں
دور ہوں گی کلفتیں مٹ جائیں گی سب کا مشیں | لالہ ہے بے داغ گُل بے خار قیصر باغ میں

سایۂ بالِ ہما کیا ڈھونڈتا ہے اے امیرؔ
بیٹھ زیرِ سایۂ دیوار قیصر باغ میں

بادشاہ سلامت پر اظہارِ لیاقت کا ایک اور موقع ملا۔ بادشاہ کے دو مختصر متن تھے جو کسی خاص فن میں نہ تھے اور صحت وغیرہ میں بھی پایۂ اعتبار سے گرے ہوئے تھے۔ حضرتؒ نے اپنی علمی قابلیت اور زورِ طبیعت سے اُن میں معنے بٹھائے اور کھینچ تان کر فنون کے قالب میں لائے۔ غلط کو صحیح بنایا اور صرف یہی نہیں بلکہ ان میں صنائع بدائع پیدا کئے اور ایک کا نام "ہدایۃ السلطان" دوسری کتاب کا نام "ارشاد السلطان" رکھا۔ ان کتابوں کے صلے میں بھی بیش بہا خلعت پائے اور اب بادشاہ سلامت کی ان پر خاص نظرِ عنایت رہنے لگی۔ ہر صنف کی خداداد قابلیت کے ساتھ امیرؔ مرحوم کی کوشش سونے میں سہاگے کا کام کر گئی۔ اور ۱۲۶۹ھ میں حسبِ فرمانِ شاہی حضرتؒ کچہری خاص میں (محکمہ پیشی) دو سو روپے ماہوار پر ملازم ہوگئے۔ اس محکمے کے افسر امیرؔ مرحوم تھے۔ امرا و ارکین سلطنت میں بھی اور زیادہ اعزاز و اکرام ہوا۔ عزت و وقار کے ساتھ آرام سے بسر ہونے لگی۔ اگر زمانہ کچھ اور وقت دیتا تو ایسا سامان پیدا ہو گیا تھا کہ حضرتؒ اپنی قابلیت سے کسی بڑے عہدے پر پہنچکر بہت زیادہ نام اور نمود اس عہد میں حاصل کرتے مگر افسوس کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد نیرنگِ زمانہ سے وہ بساط الٹ گئی یعنی انتزاع

سلطنت کے بعد ہی ۱۲۷۴ھ ۱۸۵۷ء کا غدر شروع ہو گیا۔ ع آں قدح بشکست و آں ساقی نماند
ہزاروں اُمرا و شرفا کے خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔ اُس زمانے کے بزرگوں سے سنا ہے
کہ شہزادیاں اور وزیرزادیاں تک پانووں میں چیتھڑے لپیٹے در بدر اور صحرا بہ صحرا ماری
ماری پھرتی تھیں۔ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے اور پانی کے ایک ایک پیالے پر اپنا
ہزاروں کا مرصع زیور اتار اتار کر دے دیتی تھیں۔

شہر میں بغاوت کی آگ شعلہ زن تھی اس کے بجھانے کو کہیئے یا اور آگ لگانے کو
توپوں سے گولے اور بندوقوں سے گولیاں برس رہی تھیں۔ آصف الدولہ کے امام باڑے کو
انگریزی فوج نے اپنا قلعہ بنا لیا تھا جس کے سامنے مینائی خاندان کے مکانات تھے
اسی کے متصل زینت بیگم کا محل تھا جو خاندان شاہی میں سے بڑے مرتبے کی بیگم تھیں
اسی محل میں باغی لوگ پناہ گزیں تھے۔ غرض جب وہ محلے کا محلہ بھی منہدم اور
مسمار ہو گیا یا جل کر خاک سیاہ تو مجبوراً یہ خاندان بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بے سر و سامان متوکلاً
علے اللہ وہاں سے چل کھڑا ہوا حضرتؒ نے اس خانہ بربادی کی کس قدر حسرتناک بائی کہی تھی

ے گھر کھُدنے کی پوچھو نہ مصیبت ہم سے — روتی ہے لپٹ لپٹ کے حسرت ہم سے
یا ہم جاتے تھے گھر سے رخصت ہو کر — یا گھر ہوتا ہے آج رخصت ہم سے [1]

فرماتے تھے سب سے زیادہ صدمہ مجھے اپنے قلمی دیوان اور اور تصانیف کے قلمی نسخے
جل جانے کا ہوا جو غیر مطبوعہ تھے۔

وہ ایسا شورش کا زمانہ تھا کہ ہر شخص پریشان اور غیر مطمئن، راستے غیر مامون تھے
حضرتؒ اپنی مصیبت کا ایک شمہ یہ بیان فرماتے تھے کہ جسم پر صرف ایک شلوکا اور

---

[1] میر امان علی سحر مرحوم نے اُسی زمانے میں ایک قصیدہ نواب منور الدولہ کی مدح میں کہا تھا جس کی تشبیب میں لکھنؤ کی بربادی کا
ہلکا سا خاکہ کھینچا ہے ے

پاجامہ تھا جس کو دو بار تالاب میں اپنے ہاتھ سے دھو دھو کر پہنا تھا۔ غرض بہت دشواری اور بڑی مصیبت سے کاکوری (لکھنؤ سے چار پانچ کوس پر ایک مشہور قصبہ اُمراد شرفائے اودھ کا ہے) پہنچے۔ وہاں بہت سے عزیز و احباب تھے حضرتؒ پہلے مع اعزہ انھیں کے مہمان ہوئے۔ پھر ایک مکان آسایش کے قابل مل گیا اس میں ایک سال کے قریب قیام کیا اور یہ معمول رہا کہ روزانہ پہر دن چڑھے سے دوپہر تک جناب مولانا شاہ تقی علی قلندرؒ خلف حضرت شاہ تراب علی قلندرؒ سے صحبت رہتی اور علمی مذاکرے رہا کرتے۔ وہ بھی عجب محفل نور ہوتی تھی اور سہ پہر سے شام تک حضرت حسان الہند مولوی محمد محسنؒ محسن کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہتا۔ اس زمانے میں مولوی صاحبؒ نے شہیدیؒ کے مشہور قصیدے پر نعت میں ایک بے مثل قصیدہ کہا تھا اس کی تضمین کیلئے حضرتؒ سے کہا۔ آپ نے اس پریشانی کے زمانے میں اس پر مصرع لگائے۔ مولوی صاحبؒ نے بہت سے شعرا اور سخن فہم حضرات کو دعوت دی اور اس جلسے میں وہ تضمین

تمام ہند کی تھا جان لکھنؤ اپنا
ہمارا خسرو جم جاہ جان عالم تھا

جہاں ہے قالب بیجاں کسی میں جان نہیں
فراق موت سے بدتر ہے اس مسیحا کا

عجیب مجمع اہل کمال تھا افسوس
ہزار حیف وہ صحبت فلک نہ دیکھ سکا

نہ پانچوں وقت کی نوبت نہ وہ دیاش گجر
نہ توپ چلتی ہے اب ہے غضب کا سناٹا

جہاں میں صاحب جوہر کی ہے یہ بے قدری
ٹکے ٹکے پہ بکیں اصفہانیاں کیا کیا

یہ انتہا کی صفائی ہوئی ہے گلیوں میں
کہ لکھنؤ میں کسی کا قدم نہیں جمتا

کسی کا کھد گیا پشتہ کہیں گری دیوار
چبوترہ کہیں غائب کسی کا در وا زا

جو کچھ خرید کو بازار تک گیا کوئی
وہاں سے پھر کے جو آیا تو گھر نہ پہچانا

یہ حکم ہے کہ نہ ہوں چار ایک جا باہم
وہ دن گئے کہ شب و روز رہتا تھا جلسا

پڑھی گئی "مخمس نعتیہ" اس کا تاریخی نام ہے[ع]۔ دو چار بند یہاں لکھے جاتے ہیں صورت حالات پر نظر کیجئے اور امیرؒ کی فکر عالی کے کرشمے دیکھئے۔

ہیں بسم اللہ آزادی ہوں سر پر تاج ہے مد کا ‏ ‏ ‏ الف آوارگی کا راست نقشہ ہے مرے قد کا
تجرد تختۂ اول ہے میری مشق بے حد کا ‏ ‏ ‏ مٹانا لوح دل سے نقش ناموس اب وجد کا
دبستان محبت میں سبق تھا مجکو ابجد کا

صف اغیار ہے مجلس نشیں پہلوئے قاتل میں ‏ ‏ ‏ کوئی کہدے کہ مجکو کیوں پھنسا رکھا ہے مشکل میں
یہی تعزیر ہے اتنی تو ہو میری جگہ دل میں ‏ ‏ ‏ کنارے پر بٹھالے مجکو ظالم اپنی محفل میں
گناہ شوق بے حد سے جو میں ہوں مستحق حد کا

قلم رکھدے قلم کر اپنے دونوں ہاتھ خنجر سے ‏ ‏ ‏ سراپا اس کا تو کھینچے گا سر توڑ اپنا پتھر سے
چلا ہے کھینچنے اس قد کو کیا قمری کے شہپر سے ‏ ‏ ‏ بنایا خامہ مو کو ہمارے دست لاغر سے
کھنچا لیکن نہ دامن اے مصور اس سہی قد کا

دکان حسن چمکی بندۂ بے دام خلقت ہے ‏ ‏ ‏ تہ محراب ابرو سجدہ اب عین عبادت ہے
خریداری تری جی بیچکر حکم شریعت ہے ‏ ‏ ‏ ترے بازار میں ایمان فروشی رکن طاعت ہے
دم سودا بنا سنگ ترازو سنگ اسود کا

اس کے بعد حضرتؒ نے خود بھی اس زمین میں بہت بڑا قصیدہ کہا۔ اور پھر اسی زمین میں دو نعتیہ غزلیں بھی کہی ہیں۔ حضرت محسنؒ فرماتے تھے کہ امیر مویدمن اللہ ہیں اور یہی قول حضرتؒ کا مولوی صاحبؒ کی نسبت تھا۔ قصیدے اور غزلوں کے چند شعر

ع "اس مخمس کی تاریخیں ان دو درود دل سے بھی نکلتی ہیں جو مقبولیت کی بین دلیل ہے:-
(۱) اللّٰھم صل علٰے محمدٍ عبدک ورسولک النبی الامی وآلہ واصحابہ وازواجہ دائماً وابداً ۱۲۰۵ ہجری
(۲) اللّٰھم صل علٰے محمدٍ عبدک ورسولک النبی الامی وآلہ وازواجہ اجمعین ۱۲۶۶ فصلی

حصہ دوم میں دیکھئے۔

جب تسلط ہو چکا اور امن کا اعلان ہو گیا تو لکھنؤ واپس گئے۔ وہاں عدالتیں قائم ہو چکی تھیں، انگریزی افسر تحقیقات کر رہے تھے۔ گو اس فقیر صورت درویش سیرت خاندان کے ذمے کوئی الزام نہ تھا مگر استغنا اور صبر و توکل نے اجازت نہ دی کہ جائداد کی ضبطی اور عمارات کی بربادی کا استغاثہ کرے۔ صرف یہ کیا کہ اپنے جد اعلےٰ کا مزار تھوڑا بہت درست کرا دیا اور پھر لکھنؤ سے یہ قافلہ منتشر ہو گیا۔ خود حضرتؒ پہلے کانپور گئے وہاں نواب محمد باقر علی خاں نے جو نواب معتمد الدولہ وزیر اودھ کی اولاد میں اور حضرتؒ کے والد مرحوم کے عمدہ تلامذہ میں سے تھے دو مہینے تک اپنا مہمان رکھا۔ آخر ۱۲۷۴ھ میں پہلے مین پوری پھر وہاں سے ہمیر پور (ضلع باندا) اس خیال سے گئے کہ کچھ سلسلۂ معاش پیدا کریں۔ احباب میں سے کسی نے صلاح دی کہ وکالت کا امتحان دینا چاہیئے کسی نے کہا تحصیلداری کے لئے کوشش کرو۔ ہمیر پور میں شیخ وحید الزماں خاں بجنوری مرحوم ڈپٹی کلکٹر تھے جن کی چھوٹی صاحبزادی سے حضرتؒ کی نسبت غدر سے پہلے ہی قرار پا چکی تھی۔ ڈپٹی صاحب کو جب ان کا آنا معلوم ہوا تو اصرار کر کے اپنے مکان پر لائے اور نہایت شفقت و بزرگانہ محبت سے اپنے پاس رکھا۔ چند روز کے بعد فرمایا کہ "امیر احمد کچہری میں کچھ کام سیکھو تمہارا جی بہلے گا اور کوئی صورت روزگار کی بھی مناسب حال نکل آئے گی۔" ڈپٹی صاحب نے کچہری پہنچ کر بگھی ان کو لے جانے کے واسطے واپس بھیجی اور آپ سوار ہو کر کچہری چلے۔ بیان فرماتے تھے کہ "میں نے دل میں خیال کیا کچہری پہنچ کر جو لفظ پہلے میرے کان میں پڑے گا اسی سے میں اپنے حق میں تفاول کروں گا۔ میں بگھی سے اترتا ہی تھا کہ اتنے میں عدالت کے چپراسی نے کسی فریق مقدمہ کو پکارا "گیا دین"۔ یہ سنتے ہی میرے

دل نے کہا یہ ہدایت منجانب اللہ ہے وہ نوکری ہی کیا جس میں دین جائے اور اُسی بگھی پر فوراً واپس چلا آیا۔ ڈپٹی صاحب نے انتظار کرکے چپراسی سے پوچھا تو اُس نے عرض کی آئے تو تھے مگر بگھی سے اُترتے اُترتے واپس چلے گئے۔ یہ سن کر ڈپٹی صاحب کو تکرار اور خلفشار ہوا، اُسی وقت بگھی منگوائی، گھر آئے اور مجھ سے پوچھا خیر تو ہے امیر احمد تم واپس کیوں چلے آئے میں نے عرض کی انگریزی نوکری پر میرا دل کسی طرح راضی نہیں ہوتا ڈپٹی صاحب بہت کچھ سمجھاتے رہے مگر میں نے انکار ہی کیا۔"

اُن کی اس احتیاط اور اپنے مذہبی خیالات میں پختگی نے آخر اپنا اثر دکھایا۔ فردوس مکاں نواب یوسف علی خاں ناظم والی مصطفےٰ آباد عرف رام پور (یو۔پی) نے حضرتؒ کا بستہ جستہ کلام دیکھا اور سنا تھا۔ اُدھر تو اُن کے آوازۂ سخن نے اب زیادہ مشتاق کر دیا تھا اِدھر شیخ وحید الزماں خاں مرحوم کی طرف سے تحریک اور سعی کا سلسلہ ہوا (جو آپ سے پہلے رام پور چلے آئے تھے) تو فردوس مکاں نے رمضان المبارک ۱۲۷۵ھ میں حضرتؒ کو نہایت اشتیاق اور آرزو سے بلایا اور اپنا مہمان خاص کیا۔ ایک دن باتوں باتوں میں جب نواب صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ آپ اُن مولوی کرم محمد مینائیؒ کے چھوٹے صاحبزادے ہیں جن سے نواب نے اپنے والد جنت آرام گاہ نواب محمد سعید خاں کے زمانۂ قیام لکھنؤ میں عربی پڑھی تھی تو نواب نے جو پہلے ہی سے ان کی قادر الکلامی اور خوشگوئی سے ان کے گرویدہ ہو رہے تھے زیادہ اخلاص کا برتاؤ کیا اور اپنی ملازمت کے لیئے کہا حضرتؒ ملازمت کر لینے پر تو آمادہ ہوئے مگر شاعری کے سلسلے میں نوکری کرنے سے انکار کیا اور یہ چاہا کہ کوئی ملکی خدمت لی جائے۔ اس کے ضمن میں شعر و سخن کا بھی سلسلہ رہے گا۔ اس کو فردوس مکاں نے خوشی سے منظور فرمایا۔

اور سو روپے ماہوار پر عدالت دیوانی کا مفتی مقرر کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد حضرت مخدوم عبدالحق ردولوی کے عرس میں حسب معمول[1] شرکت کی غرض سے حضرتؒ نے وطن جانے کے لیے رخصت مانگی۔ نواب صاحب نے بہت خوشی سے اجازت دی اور آمدورفت کیلئے جیب خاص سے خرچ مرحمت فرمایا۔ آٹھ کہاروں کی پالکی اس سفر کے واسطے ہمراہ کی۔ اور اصرار کے ساتھ ارشاد ہوا کہ واپسی میں اپنے بھائیوں اور والدہ وغیرہ کو اپنے ساتھ لیتے آیئے گا۔ حضرتؒ کے منجھلے بھائی مولوی حافظ عنایت حسین صاحب نے تو آستانۂ مخدوم صاحبؒ سے جدائی گوارا نہ کی مگر بڑے بھائی مولوی طالب حسن صاحب اور والدہ اور بڑی اور منجھلی بھاوج کو حضرتؒ اپنے ساتھ لے آئے۔ اور نواب صاحب نے مولوی طالب حسن صاحب کو نائب سررشتہ داری پر مامور کیا۔ غالباً یہ ۱۸۶۰ء تھا۔ اسی سال شیخ وحیدالزماں کی چھوٹی صاحبزادی کے ساتھ حضرتؒ کا نکاح ہوا۔

چونکہ مقدمات میں انہماک اور فتوے نویسی کے کام سے حضرتؒ کو اتنی فرصت نہیں ہوتی تھی جتنی نواب صاحب کو مشغلۂ شعروسخن کے لیے مقصود تھی۔ اس لیے ۱۲۷۸ھ میں آپ کو محکمۂ رجسٹری کا افسر مقرر کر دیا۔ اور آپ کی جگہ مولوی طالب حسن کو مفتی کا عہدہ عنایت ہوا۔ اب شعروسخن کا زیادہ چرچا رہنے لگا۔ اُس زمانے میں نواب غلام حسین خاں بریلوی شاگرد مصحفی بڑے جوہر شناس سخن تھے۔ فردوس مکاں نے اُن کو لکھا "مصحفی کے بعد لکھنؤ کا ایک قادرالکلام مجھے خوش نصیبی سے ملا ہے۔ آیئے تو اس کا کلام آپ کو سنوائیں"۔ جب وہ آئے تو حضرتؒ کو ان سے ملوایا۔ رئیس موصوف ایک مہینے تک نواب صاحب کے

[1] آپ کے تشریف لے جانے سے ردولی میں بھی مشاعرہ کیا جاتا اور شعروسخن کا چرچا خوب رہتا۔ لوگ مشتاق رہتے اور زمانۂ عرس کا انتظار کرتے رہتے۔ وہاں کے اکثر حضرات شاگرد بھی تھے اور فیض صحبت کے متمنی رہتے۔

مہمان رہے اور بار بار حضرتؒ سے ملاقات ہوئی اور ہر قسم کا کلام سنا اس کے بعد نواب صاحب سے کہا کہ ”منشی امیر احمد تمام اصناف سخن میں ایسے ہی ہیں جیسے میاں مصحفی تھے“ انھیں دنوں میرزا نوشہ (غالب مغفور) کی یہ غزل دہلی سے رام پور آئی تھی ؎

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیمکش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

گو مرزا صاحب کا کلام جن انمول جواہر سے مالا مال ہے اُن کے سامنے یہ غزل کچھ زیادہ آب و تاب نہیں رکھتی مگر اس کا بہت چرچا اور شہرت تھی۔ فردوس مکاں کے ارشاد سے حضرتؒ نے بھی یہ غزل کہی ؎

مرے بس میں یا تو یارب وہ ستم شعار ہوتا
یہ نہ تھا تو کاش دل پر مجھے اختیار ہوتا

پس مرگ کاش یوں ہی مجھے وصل یار ہوتا
وہ سر مزار ہوتا میں تہ مزار ہوتا

ترا میکدہ سلامت ترے خم کی خیر ساقی
مرا نشہ کیوں اترتا مجھے کیوں خمار ہوتا

مرے اتقا کا باعث تو ہے میری ناتوانی
جو میں توبہ توڑ سکتا تو شراب خوار ہوتا

میں ہوں نامراد ایسا کہ بلک کے یاس روتی
کہیں پا کے آسرا کچھ جو امیدوار ہوتا

نہیں پوچھتا ہے مجھکو کوئی پھول اس چمن میں
دل داغدار ہوتا تو گلے کا ہار ہوتا

وہ مزہ دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب
مرے دونوں پہلوؤں میں دل بیقرار ہوتا

دم نزع بھی جو وہ بت مجھے آکے منہ دکھاتا
تو خدا کے منہ سے اتنا نہ میں شرمسار ہوتا

نہ ملک سوال کرتے نہ لحد فشار دیتی
سر راہ کوئے قاتل جو مرا مزار ہوتا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی
وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

میں زباں سے تم کو سچا کہو لاکھ بار کہدوں
اسے کیا کروں کہ دل کو نہیں اعتبار ہوتا

مری خاک بھی لحد میں نہ رہی امیر باقی
انھیں مرنے ہی کا اب تک نہیں اعتبار ہوتا

[1] نواب صاحب غزل سن کر خوش ہوئے اور بہت تعریف کی۔ جب غالب مرحوم رام پور تشریف لائے تو یہ غزل ان کو بھی سنوائی۔ مرزا صاحب نہایت خوش ہوئے اور دل کھول کر داد سخن دی۔

[1] غدر کے بعد مرزا صاحب مرحوم کا وظیفہ دارالسرور رام پور سے مقرر ہو گیا تھا۔ شمس العلما مولوی الطاف حسین حالی مرحوم "یادگار غالب" میں لکھتے ہیں "غدر کے دو برس بعد نواب یوسف علی خاں مرحوم رئیس رام پور نے سو روپے ماہوار ہمیشہ کے لیئے مرزا کے واسطے مقرر کر دیا جو نواب کلب علی خاں مرحوم نے بھی بدستور مرزا کے اخیر دم تک جاری رکھا۔ حکیم مومن خاں مرحوم کی رحلت کے بعد فردوس مکان مرزا صاحب سے اپنے کلام میں اصلاح بھی لیتے تھے۔" حضرت فرماتے تھے کہ "نواب خلد آشیاں کے عہد میں بھی غالب مرحوم (جیساکہ عود ہندی سے بھی ظاہر ہے)۔

حضرت میرزا صاحب کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتے اور خردانہ ادب کرتے تھے ایک دن ملاقات کو گئے تو میرزا صاحب نے فرمایا "آج کچھ رات رہے سے آپ کا یہ شعر ۔ دل ہی نہ رہا امید کیسی ؛؛ جڑ کٹ گئی نخل آرزو کی ۔ خود بخود وردِ زبان ہے اور ہر مرتبہ لطف اور لذت بڑھتی جاتی ہے"۔

اس زمین میں نواب فصیح الملک داغ مرحوم کی بھی یہ غزل ہے جو غالباً مرحوم نے بھی نواب فردوس مکاں کی فرمائش سے کہی ہوگی ؎

عجب اپنا حال ہوتا جو وصال یار ہوتا ۔ کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا
کوئی فتنہ تا قیامت نہ پھر آشکار ہوتا ۔ ترے دل پہ کاش ظالم مجھے اختیار ہوتا
جو تمھاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا ۔ تمھیں منصفی سے کہدو تمھیں اعتبار ہوتا
غم عشق میں مزہ تھا جو اسے سمجھ کے کھاتے ۔ یہ وہ زہر ہے کہ آخر مے خوشگوار ہوتا
نہ مزہ ہے دشمنی میں نہ ہے لطف دوستی میں ۔ کوئی غیر غیر ہوتا کوئی یار یار ہوتا
یہ مزہ تھا دل لگی کا کہ برابر آگ لگتی ۔ نہ تجھے قرار ہوتا نہ مجھے قرار ہوتا
ترے وعدے پر ستمگر ابھی اور صبر کرتے ۔ اگر اپنی زندگی کا ہمیں اعتبار ہوتا

(بقیہ حاشیہ ص۷۵) رام پور تشریف لاتے اور جب تک جی چاہتا قیام فرماتے تھے۔ ایک اندھا نائی اکثر آپ کے پانو دبانے آیا کرتا تھا۔ آپ اس سے کچھ باتیں کیا کرتے تھے۔ ایک دن اس کے گھر کا حال پوچھا اُس نے یہ بھی بیان کیا کہ اس کی لڑکی جوان ہوگئی ہے تنگدستی کے سبب اس کا نکاح نہیں ہوا ہے۔ خیر سن لیا جس روز میرزا صاحب دہلی جانے لگے حسب معمول نواب صاحب نے سفرخرچ کے نام سے پانچ سو روپے بھیجے۔ آپ پالکی پر سوار ہوئے کچھ دور جاکر خیال آیا اس نائی کو بلوایا اور یہ کہکر "لے بھائی اپنی بیٹی کا بیاہ کردے"۔ وہ پانچ سو۵ اس کے حوالے کردیئے۔ اُسی وقت نواب صاحب تک اس فیاضی کی خبر پہنچی۔ فرمایا کہ "میرزا صاحب کے پاس تو زادِ راہ نہ ہوگا فوراً پانچ سو۵ روپے اور دے کر ایک سوار دوڑایا گیا کہ جہاں میرزا صاحب ملیں یہ روپے دے کر رسید لائے"۔ اللہ اللہ وہ کیسا زمانہ تھا اور کیسے اخلاق وعادات تھے۔ سچ ہے توانگری بدل است نہ بمال۔

یہ وہ درد دل نہیں ہے کہ ہو چارہ ساز کوئی | اگر ایک بار مٹتا تو ہزار بار ہوتا
گئے ہوش تیرے زاہد جو وہ چشم مست دیکھی | مجھے کیا الٹ نہ دیتی جو نہ بادہ خوار ہوتا
مجھے مانتے سب ایسا کہ عدو بھی سجدہ کرتے | در یار کعبہ بنتا جو مرا مزار ہوتا

تمہیں ناز ہو نہ کیونکر کہ لیا ہے داغ کا دل
یہ رقم نہ ہاتھ لگتی نہ یہ افتخار ہوتا

اسی زمین میں حضرتؒ کی یہ دوسری غزل بھی صنم خانے میں ہے اور ایسا یاد آتا ہے کہ نثار مرحوم کے اصرار سے "پیام یار" کے لئے کہدی تھی۔

نئی چوٹیں چلتیں قاتل جو کبھی دوچار ہوتا | کہ ادھر سے وار ہوتا تو ادھر سے پیار ہوتا
ترے عکس کا جو قاتل کبھی تجھ پہ وار ہوتا | تو نثار ہونے والا یہی جاں نثار ہوتا
رہی آرزو کہ دو دو ترے تیر ساتھ چلتے | کوئی دل کو پار کرتا کوئی دل کے پار ہوتا
اثر اس قدر تو ہوتا ترے لوٹنے کا ان پر | کہ وہ کروٹیں ہی لیتے جو میں بیقرار ہوتا
ترے ناوک ادا سے کبھی ہارتا نہ ہمت | جگر اس سے آگے ہوتا جو جگر کے پار ہوتا
مرے دل کو یوں مٹایا کہ نشان تک نہ رکھا | میں لپٹ کے رو تو لیتا جو کہیں مزار ہوتا
ترے تیر کی خطا کیا مری حسرتوں نے روکا | نہ لپٹتیں یہ بلائیں تو وہ دل کے پار ہوتا
میں جیوں تو کس کا ہو کر نہیں کوئی دوست میرا | یہ جو دل ہے دشمن جاں یہی دوستدار ہوتا
ترے پھولوں میں جو آتے تو نئے وہ گل کھلاتے | کہ کلائیوں میں گجرے تو گلے میں ہار ہوتا
ترے ننھے دل کو کیونکر مری جان میں دکھاتا | وہ دھڑکنے کیا نہ لگتا جو میں بیقرار ہوتا
مرا دل جگر جو دیکھا تو ادا سے ناز بولا | یہ ترا شکار ہوتا وہ مرا شکار ہوتا
سر قبر آتے ہو تم جو بڑھا کے اپنا گہنا | کوئی پھول چھین لیتا جو گلے میں ہار ہوتا

دمِ رخصت اُن کا کہنا کہ یہ کاہے کا ہے رونا — تمھیں میری قسموں کا بھی نہیں اعتبار ہوتا

میں نثار تجھ پہ ہوتا تو رقیب جان کھوتا — میں ترا شکار ہوتا وہ مرا شکار ہوتا

شبِ وصل تو جو بیخود نہ ہوا امیرؔ چوکا — ترے آنے کا کبھی تو اُسے انتظار ہوتا

حضرتؒ نے دربار رام پور میں باریاب اور مطمئن ہونے کے بعد اپنے استاد حضرت اسیرؔ مرحوم کے لیے بھی تحریک فرمائی۔ نواب فردوس مکاں نے نہایت خوشی سے طلب فرمایا۔ سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر کی اور نہایت عزت و احترام ملحوظ خاطر رکھا یہاں تک کہ اپنے کلام میں اصلاح بھی لی لیکن چونکہ غالبؔ مرحوم کی طرح اسیرؔ مرحوم کا قیام رام پور میں مستقل نہیں رہتا تھا اس لیے نواب صاحب آخر آخر میں حضرتؒ ہی سے اپنے کلام میں مشورہ[1] فرمانے لگے اور ہر بات کا لحاظ و خیال اس قدر رکھتے کہ اکثر پھل میوے کسی قسم کی مٹھائی یا اقسام طعام میں سے جو چیز خود نواب صاحب کے پسند خاطر ہوتی حضرتؒ کے واسطے ضرور بھیجتے تھے۔ کبھی حضرتؒ کی طبیعت کچھ ناچاق ہو جاتی تو دونوں وقت مزاج پرسی کو خاص آدمی آتا۔ اطبائے خاص پر توجہ کی تاکید ہوتی اور صبح و شام ہوا کھانے کے لیے بگھی آتی اور شیخ وجیہہ الزماں خاں مرحوم اور علی حسن خاں مغفور کے ذریعے تاکید ہوتی کہ ایسا کوئی کام نہ کریں جس سے دل و دماغ پر زور پڑے۔

اسی زمانے میں حضرتؒ کے واسوخت دیکھ کر نواب فردوس مکاں نے بھی ایک واسوخت بہاریہ لکھا اور حضرتؒ کو اصلاح کے لیے دیا جس سے واسوخت میں واقعی بہار آ گئی اور نواب موصوف اس قدر مسرور ہوئے کہ چار واسوخت اور تصنیف فرمائے۔

اب نواب صاحب کی دلبستگی حضرتؒ سے اتنی بڑھ گئی تھی کہ جب دربار وائسرائے میں

---

[1] دیباچہ امیر اللغات حصہ اول۔

آگرے تشریف لے گئے اور فرخ آباد میں خیر خواہی ایام غدر کا خلعت برطانیہ گورنمنٹ سے ملا اور کونسل کے ممبر ہو کر کلکتے گئے تو حضرتؒ کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے معلوم نہیں یہ سفر کب کئے تھے مگر نواب فصیح الملک مرحوم کے قطعہ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۲۸۰ھ میں کلکتے سے واپس تشریف لائے تھے۔ یہاں وہ قطعہ بھی ناظرین کی دلچسپی کے خیال سے لکھا جاتا ہے۔

قطعہ تاریخ تشریف آوری جناب مستطاب نواب محمد یوسف علیخاں صاحب بہادر فردوس مکاں طاب ثراہ۔ از کلکتہ

کیا ولی عہد اور نواب آئے آج	برج صد حشمت کے دو کوکب یہ آئے
دو مسیحا آئے بہر درد ہجر	خاطر طالب کے دو مطلب یہ آئے
دو قمر اک بار آئے ہیں نظر	تھا زبانوں پر یہی جس شب یہ آئے
مژدہ اس آمد کا ہے سامان زیست	جان میں جان آگئی گویا جب یہ آئے
بہر استقبال میں پہنچا مگر	کون جانے کون آئے کب یہ آئے
گوش بر آواز لب پر یہ دعا	مجکو سنوا دے کہیں یا رب یہ آئے
دیکھ کر گرد سواری یک بیک	منتظر یوں بول اٹھے سب یہ آئے
ایک کی تھی ایک سے تکرار یہ	میرا جذب شوق لایا جب یہ آئے
داغ نے بھی پیش کش تاریخ کی	شان و شوکت جاہ و اقبال اب یہ آئے

۱۲۸۰ھ (گلزار داغ)

اور خوبیوں سے قطع نظر "اب یہ آئے" مصرع تاریخ کی جان ہے جس کی خاطر سے

قطعے کا قافیہ و ردیف یہی ہے۔ دوسرا کمال تعمیہ ہے جو کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شعرائے لکھنؤ کی صحبت سے داغ مرحوم کو مذاق سلیم حاصل ہوا تھا۔

حضرتؒ کے قطعات تاریخ دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نواب فردوس مکاں ۱۲۸۱ھ میں علیل ہوئے مگر صحت ہوگئی اور جشن صحت عید کے مہینے میں منایا گیا۔ اتفاق میں اتفاق یہ کہ اسی دن نوروز بھی تھا حضرتؒ نے یہ قطعات تاریخ لکھکر پیش کئے۔

تمہید جشن صحت بندگان والا مقام جناب نواب محمد یوسف علیخاں بہادر

بہ ادائے تہنیت عید صیام

مژدہ اے طالبان شاہد عیش — کہ ہوئی صبح عید شام امید
عید کا چاند چرخ پر نکلا — مل گئی قفل آرزو کی کلید
دور دور قران سعد آیا — ہیں ہم آغوش مشتری ناہید
یوسف عہد کو ہوئی جو شفا — مرتبے میں ہوئی دوبالا عید
دو ن ہمرنگ کی اسے کہئے — جشن صحت ادھر اُدھر ہے عید
عید سی عید ہے خوشی سی خوشی — ہے عجب ساعت سعید و حمید
اصل مقصود جشن صحت ہے — عید ماہ صیام ہے تمہید
دھوم ہے ہر طرف مبارک ہو — وصل میں وصل اور دید میں دید
ہمہ تن چشم و گوش ہے عالم — کہ یہ عالم نہ دید ہے نہ شنید
دیکھ کر بخشش و نوال حضور — چرخ پر کاسہ بنگیا خورشید
جوڑے زہرہ وشوں نے وہ پائے — اطلس چرخ جن کے آگے مزید

فکر تاریخ کی جو میں نے امیر | کیا ہی روح القدس نے کی تائید
ہوئی تاریخ جشن وعید بہم | جشن میں جشن اور عید میں عید

۱۲۸۱ھ

قطعۂ تاریخ جشن صحت

شرف داں مہر کو ہے یاں عروج ماہ دولت ہے | عجب صحبت عجب جلسہ عجب شادی کی ساعت ہے
کسے سال ہمایوں ہاتھ آتا ہے امیر ایسا | مہنیا عید کا نوروز کا دن روز صحت ہے

۱۲۸۱ھ (مراۃ الغیب)

جشن صحت میں سواری بھی نکلی اور حضرت نے اس کی یہ تاریخ کہی :-

شکر ہے نواب کو صحت ہوئی | پھر مرے خالق نے دکھلائی بہار
دیکھ کر اس کی سواری کا تزک | چشم نرگس بن کے شرمائی بہار
آمد آمد جب سواری کی ہوئی | دھوم اُڑی آئی بہار آئی بہار
رنگ یہ اس کی سواری کا جما | ابر رحمت کی طرح چھائی بہار
کرتی ہے بادِ بہاری کے حضور | ہر قدم پر جبہ فرسائی بہار
اشرفی کے پھول اپنی جیب میں | بھر کے بیلے کے لئے لائی بہار
یہ بدیہہ ہو گئی تاریخ امیر | شہر کیوں گلشن نہو آئی بہار

۱۲۸۱ھ

مگر نواب فردوس مکاں مارچ ۱۸۶۵ء میں بعارضہ سرطان پھر بیمار ہوئے اور یہ مرض الموت تھا۔ بروز جمعہ ۲۲ ذیقعدہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۴ اپریل ۱۸۶۵ء کو انتقال فرمایا[1]۔

---

[1] بعض بزرگوں سے ایسا سنا ہے کہ فردوس مکاں ایک حکیمانہ خیال کے رئیس تھے کسی خاص مذہب میں اُن کو غلو نہ تھا مگر سرکار عالیہ بیگم صاحبہ کو مذہب اہل تشیع سے نہایت شغف تھا اور (خلد آشیاں) نواب کلب علی خاں

منشی عبدالرحمٰن صاحب بسملؔ کی زبانی سنا ہے کہ جس مشاعرے کی غزل میں حضرت ناظمؔ فردوس مکاں کا یہ شعر تھا ــــ لے گئے حور و ملک روح مری دست بدست ٭ ڈاک تا گلشن فردوس بریں بیٹھ گئی۔ اسی کے بعد علیل ہوئے اور رحلت فرمائی۔ حضرتؒ نے یہ تاریخ وفات کہی۔ جو اُن کے دلی رنج و غم کی مختصر کیفیت ہے :۔

در فراق ناظم معجز بیاں یوسف لقا ٭ جوش زد سیلاب خوں از دیدۂ گریان من

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۱) ولی عہد کا رجحان مذہب اہل سنن کی طرف تھا اور نوجوانی ہی سے نماز وغیرہ کے پابند تھے۔ لوگوں نے یہ بات فردوس مکاں تک پہنچائی خصوصاً بیگم صاحبہ نے زور شور سے اس امر کی شکایت کی۔ نواب نے بیٹے کو بلا کر نصیحت اور تاکید کی تو بیٹے کے بادۂ اعتقاد میں اور جوش آیا اور اس دن سے موتی مسجد میں جو در دولت سے قریب ہے کھلم کھلا سنیوں کے ساتھ نماز پڑھنے لگے۔ اس کے ساتھ میں لوگوں نے کچھ اور لگائی بجھائی کی جس سے نواب کا دل پھر گیا اور انگریزی سرکار کو درخواست لکھی کہ کلب علی خاں کے اطوار پسندیدہ نہیں ہیں اس لئے حیدر علی خاں کو میں نے اپنا ولی عہد قرار دیا۔ میرے بعد وہی مسند نشین ہوں گے۔ اس تجویز پر اکثر ارکان دولت نے بھی صاد کیا۔ درخواست دستخطوں سے بھی مزین ہوگئی مگر جس دن روانہ کی جاتی اس روز اتفاق سے شیخ وجیہ الزماں خاں مرحوم (یہ ڈپٹی وحید الزماں خاں مرحوم کے بڑے بھائی اور ارا کین ریاست میں نہایت معتمد بہت معزز اور غیر معمولی قابلیت کے آدمی تھے) سفیر ریاست کو بعض ضروری امور عرض کرنے کے لئے تنہائی میں شرف باریابی حاصل ہوا۔ نواب صاحب نے اپنی اس تجویز کا بھی ذکر کر کے وہ درخواست ان کی طرف بڑھا دی۔ شیخ صاحب مرحوم نے درخواست پڑھ کر رکھدی۔ نواب صاحب نے پوچھا "کیوں آپ کی کیا رائے ہے"۔ عرض کی "حضور کو اگر خادم کی ناچیز رائے لینا ہوتا تو پہلے ہی یہ عزت افزائی فرمائی جاتی اب تو درخواست دستخطوں سے بھی مزین ہو چکی میں کیا عرض کروں"۔ نواب صاحب نے ذرا تیکھی چتون سے فرمایا "خیر اب بھی کہئے"۔ شیخ صاحب مرحوم نے تقریر شروع کی اور ثابت کر دیا کہ زبردستی حق تلفی کی جاتی ہے ــــ (اس خیر خواہی کو نواب خلد آشیاں نے ہمیشہ بنظر استحسان دیکھا اور شیخ صاحب مرحوم کے خاندان کی بہت عزت کرتے رہے) نواب دل میں تو قائل ہوگئے مگر یہ کہکر "اُنھ آپ کی منطق تو ایسی ہی ہوا کرتی ہے"۔ درخواست چاک کر ڈالی۔

تا بِ الٰہ دل رفت و دل از دست از کار رفت — زلفِ تن او جملہ برہم زد سر و سامانِ من
تیرہ شد چوں شام ماتم در نظر ایں خاکداں — چاک شد مانند دامانِ سحر دامانِ من
شکر منت ہائے او ایمان خود دانستہ ام — ذکر او تا بودہ ام بودست حرزِ جانِ من
بسکہ از شورِ فغانم محشرے برپا شد است — میشود شورِ قیامت ہر نفس قربانِ من
گریہ ام در ماتمش رنگ فراوانی گرفت — میچکد طوفانِ نوح از گوشۂ دامانِ من

بہر سالِ آں عزیزِ مصرِ دلہا گفت آمیر
مسند آرائے جہاں شد یوسفِ دورانِ من

۱۲۸۱ھ (مرآۃ الغیب)۔

اسی تاریخ کو نواب کلب علی خاں نے مسندِ ریاست پر جلوس فرمایا۔ حضرتؒ نے اس خوشی میں یہ قطعاتِ تاریخ کہے :۔

آفتابِ سپہرِ حشمت نے — تخت پر جب جلوس فرمایا
فرطِ بالیدگی سے وقتِ جلوس — پایۂ عرش تخت نے پایا
عرشیوں نے کہا مبارک ہو — فرشیوں کے سروں پہ یہ سایا
سایہ اُس سایۂ الٰہی کا — ابرِ رحمت کی طرح سے چھایا
تختِ دولت پہ ماہِ دولت نے — مہر ہو کر جلوس فرمایا
مہر کا رنگ ہو گیا پھیکا — ماہِ کامل فلک پہ شرمایا
نذر کو آسماں دُرِ انجم — طبقِ ماہتاب میں لایا
نور سے طور ہو گئی کوٹھی — پرتوِ حسن نے یہ چمکایا
کیوں نہ خوش ہوں محمدی مشرب — عہدِ خلقِ محمدی آیا

اس سلیماں نے خلق سے اپنے | خاتم دل پہ نقش بٹھلایا
جی اٹھا جس سے چار بآیں کیں | رنگ اعجاز تازہ دکھلایا
جھک گئے میکشان بزم سوال | جام جود و کرم جو چھلکایا
نئے سر سے جواں ہوا اقبال | نخل دولت مراد بر آیا
ہے یہ سر تاج تاجداروں کا | اس پہ اللہ کا رہے سایا
واقعی ہے امیر سال جلوس | دور دور فلاح خلق آیا

۱۲۸۱ھ

ایضاً

خلق کی تقدیر چمکی وہ ہوئے مسند نشیں | نور فیض کبریائی سے جو مالامال ہیں
ڈھل گئی ہے نور کے سانچے میں تاریخ اے امیر | آفتاب آسمان دولت و اقبال ہیں

۱۲۸۱ھ (مرآۃ الغیب)

مگر فصیح الملک مرحوم نے گیارا شعر کا یہ قطعہ کہا ہے جس کے ہر مصرع سے سنہ ۱۲۸۲ھ نکلتا ہے (شاید یہ قطعہ باضابطہ مسند نشینی کے موقع پر کہا گیا ہو)۔ اس کمال کے ساتھ مرحوم کی مشہور زمانہ فصاحت ہر مصرع سے ٹپکتی ہے:-

تعریف جشن زیبا جاہ دام ملکہ | تہنیت جشن و طرب
۱۸۸۲ء | ۱۲۸۲ھ

قطعہ

بھر کر شراب صاف پلا آج جام میں | ساقی ہے انجمن کی زباں پر ترانہ آج
رنگیں بدل زمانہ تعجب نہیں گر اب | شادی کا زہرہ رنگ سے دے شادیانہ آج
پریوں کا جمگھٹ اور حسینوں کا جلسہ ہے | کیا ایک رنگ پر ہے یہ جشن شہانہ آج

فانوس جھاڑ آئینے تصویر لمپ بھی
چمکا ہے بزم جشن سے دیوان خانہ آج

سارا ہے جلوہ کلب علیخاں کے دم سے آج
عہد سرور آج ہے جشن شہانہ آج

آفاق کیا سخاوکرم سے کیا بحال
حاتم کا کیا مٹایا جہاں سے فسانہ آج

یہ سروری کہ دادودہش اسقدر کہ بس
کیا کیا دیا ہے دولت و مال خزانہ آج

پیدا کہاں ہے لعل خوش آب آج کوہ میں
یکتا رہا صدف میں نہ گوہر کا دانہ آج

پیہم ہے سجدہ ریز نہاں فرق فرقداں
کیا کیا ہوا بلند ترا آستانہ آج

کچھ سہم کے نہیب سے تھرائے شکل بید
جھکے جو مدعی پہ ترا تازیانہ آج

موج عطا سے پاس ہوا خواہ شادماں
حاسد کا دم ہی تن سے ہو بیگانہ آج

داغ مدح سنج مداح نواب

۱۲۸۲ھ (گلزار داغ)

۱۰ ارجون ۱۸۶۵ء کو گورنمنٹ کی طرف سے نواب ممدوح کی باضابطہ مسند نشینی عمل میں آئی اور اس کے بعد ملکہ معظمہ کے حضور سے گورنر جنرل بہادر کی معرفت خلعت خاص آیا حضرت نے دونوں جشنوں میں قصیدے پڑھے جن کے مطلع یہ ہیں۔ ؎

؎ فصل گل آئی ہوا گلزار جنت بوستاں
بڑھ کے ضوواں سے ہے ان روزوں دماغ بوستاں

؎ عالم خواب میں پہنچا میں عجب باغ میں کل
شجر طور کو جس باغ کی کہیے کوپل

یہ قصیدے مرآۃ الغیب میں طبع ہو چکے ہیں۔ انھیں جشنوں کے حالات میں دو مثنویاں بھی تصنیف فرمائی تھیں جو خوش قسمتی سے مجھے حاصل ہو گئیں ہیں۔ اور خدا کو منظور ہوا تو کبھی نذر ناظرین کی جائیں گی۔

خلد آشیاں کے زمانہ ولی عہدی میں باورچی والے مقدمے کا حال میں پہلے لکھ چکا ہوں

اب جو وہ مسند نشین ہوئے تو حضرتؒ کو یہ کھٹکا ہوا کہ ایسا نہ ہو کہیں وہ خلش اب نکالی جائے
مگر جنت نصیب نواب کلب علی خاں ان رئیسوں میں نہ تھے جو اپنی خواہش پر انصاف کا
خون روا رکھتے ہیں، وہ نہایت قدر شناس اور انصاف پسند رئیس تھے۔ مسند نشینی کے
بعد ہی چوتھے پانچویں دن بھرے دربار میں مفتی سعد اللہ مرحوم کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔
"آپ کو وہ مقدمہ یاد ہے جس میں آپ نے ہمارا خیال فرمایا اور منشی امیر احمد نے کچھ توجہ
نہ کی"۔ "کیوں منشی صاحب آپ نے اس مقدمے میں اپنے استاد کا بھی خیال نہ کیا اور
ہمارے پیغام پر کچھ بھی توجہ نہ کی۔ آخر کس وجہ سے ہمارے ایما کے خلاف آپ نے
مقدمے کا فیصلہ کیا تھا"۔ حضرتؒ نے عرض کیا "میں نے خوب تحقیق اور جانچ کی تو حق
مدعی کی جانب پایا اس کے بعد میں نے غور کیا کہ یہاں کا جیل خانہ بہتر ہے یا وہاں کا
عذاب۔ ایمان نے کہا یہاں کا جیل خانہ گوارا کر لو۔ سرکار نے مجھے متدین سمجھ کر عدالت
میرے سپرد کی تھی۔ اگر مجھ سے کچھ غلط فہمی ہوئی تو میں حاضر ہوں مناسب تدارک عمل میں
آئے"۔ نواب صاحب نے حضرتؒ سے صاف صاف کہدیا کہ زمانۂ ولی عہدی میں تو
مجھے بہت رنج ہوا تھا مگر آج میں آپ کی اس طرز عمل کی نہایت قدر کرتا ہوں اور
بہت خوش ہوں کہ آپ پر میری سفارش کا بھی کچھ اثر نہ ہوا اور وہی کیا جو آپ کو حق نظر آیا
تو مجھے پورا یقین ہے کہ آپ پر کسی کا دباؤ نہیں پڑ سکتا۔ آپ پر مجھے پورا اعتماد ہے اور
اس بات پر فخر ہے کہ میرے ملازم ایسے حق شناس ہیں جن کو بڑی سے بڑی سفارش
احقاق حق سے باز نہیں رکھ سکتی۔ آپ میری طرف سے مطمئن رہیئے۔

اسی طرح ایک بار محمد یعقوب خاں رسالدار کی شکایت میں پرچہ گزرا کہ رسالدار صاحب نے
ایک آدمی کو مار ڈالا۔ خلد آشیاں نے حضرتؒ کو طلب کر کے فرمایا کہ یہ معاملہ میں آپ کے سپرد

کرتا ہوں اس کی پوری پوری تحقیقات کر کے مقدمے کا فیصلہ کیجئے گا۔ حضرتؒ نے تحقیقات کامل کے بعد رسالدار کو بری کر دیا۔ خلد آشیاں نے جب یہ سنا تو حضرتؒ کو طلب کیا اور فرمایا "منشی صاحب یہ آپ نے کیا کیا؟" حضرتؒ نے عرض کیا "مسل کی روئداد پر فیصلہ کیا گیا۔ کیا حضور کو میرے تدین میں کچھ شک ہے"؟ فرمایا "نہیں نہیں آپ مطمئن رہیں"۔ حضرتؒ کی رائے مرافعے اور صدر مرافعے میں بحال رہی۔

شاہ اودھ واجد علی شاہ طاب ثراہ تو کلکتے میں نظر بند تھے اور اہل کمال لکھنؤ میں پریشان اور خستہ حال زندگی کے دن کاٹ رہے تھے کہ خلد آشیاں مسند نشیں ہوئے اور چند ہی روز میں اُن کی قدر دانی اور جوہر شناسی کا ایسا شہرہ ہوا کہ جو باکمال لکھنؤ سے اٹھا وہ رام پور ہی پہنچا اور تھوڑے ہی دنوں میں سرکار رام پور میں اہل کمال کا ایک بے نظیر باغ نظر فروز تھا۔ ہر علم و فن کا صاحب کمال وہاں موجود تھا۔ اسی سے لوگوں کی زبانوں پر تھا "لکھنؤ اُجڑ کر رام پور آباد ہوا"۔ لوگوں کی تنخواہیں تو کچھ زیادہ نہ تھیں مگر اسے خلد آشیاں کی خوش نصیبی کہو یا قدر دانی کا جادو جس نے دلوں کو تسخیر کر رکھا تھا۔ جب تک وہ زندہ رہے کسی کو دوسری سرکار میں جانے کا خیال بھی نہ آیا۔ اگر ذوقؔ مرحوم کا قول تھا ؎ گرچہ ہے ملک دکن میں ان دنوں قدر سخن ؛ کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر۔ تو داغؔ مغفور بھی کہتے تھے ؎ ہر چند رام پور میں گھبرا رہا ہے داغؔ ؛ کس طرح جائے کلب علیخاں کو چھوڑ کر۔

خلد آشیاں نے ان چیدہ لوگوں کی قدر دانی ہی نہیں کی بلکہ اُن کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ایک واقعہ میں نے یہ سنا ہے کہ نواب خلد آشیاں اور مہاراجا اندور سے بہت دوستی اور پگڑی بدلی ہوئی تھی۔ ایک بار مہاراج خلد آشیاں کے مہمان[۱] ہوئے اور

[۱] لطیفہ:۔ ایک دن باتوں باتوں میں نواب صاحب نے مہاراج سے کہا "بھائی صاحب مجھے تو اس

نواب صاحب نے مہمان نوازی اور برادرانہ تپاک کی کوئی بات اٹھا نہ رکھی۔ رخصت ہونے سے ایک دن پہلے مہراج نے کہا "بھائی صاحب مجھے آپ سے بہت شکایت ہے" نواب نے متحیر ہو کر پوچھا "خیر تو ہے بھائی صاحب مجھ سے کیا قصور ہوا"۔ کہا "سنا ہے آپ نے بہت سے ارباب کمال جمع کئے ہیں مگر مجھ سے کسی کو نہ ملایا"۔ بولے "بھائی صاحب مجھ سے غلطی ہوئی معاف کیجئے اب جس وقت ارشاد ہو سب حاضر کئے جائیں"۔ مہراج نے کہا "کل صبح کا وقت رکھئے پھر تو ہم چلے جائیں گے"۔ شام کو یہ باتیں ہوئیں۔ رات بڑھے سب کو طلب کر کے پروانے دیدیئے کسی کو کہیں بھیجدیا کسی کو کہیں اور زبانی فرمادیا "ابھی ابھی روانہ ہو جاؤ اور جب تک میرا حکم نہ پہنچے رام پور نہ آنا"۔ دوسرے دن جب ملاقات ہوئی تو دو چار کو جن کی نسبت یقین ہوا کہ راجا کی گوں کے نہیں ہیں پیش کر کے کہا "بھائی صاحب مجھے نہایت ندامت اور افسوس ہے کچھ لوگ تو پہلے ہی سے باہر کام پر گئے ہوئے تھے اور کچھ لوگ تیسرا چوتھا دن ہے اپنے اپنے کام پر چلے گئے ہیں حسب وعدہ اب کے جب آپ تشریف لائیں گے تو انشاءاللہ ان کو بھی ملازمت حاصل کراؤں گا"۔ مہراج نے کہا "ضرور ضرور"۔ اور وہ بات خوبصورتی کے ساتھ یوں ٹل کر ختم ہوگئی۔

جب مہراج روانہ ہو گئے تو سب طلب کر لئے گئے۔ خدا بخشے مولوی عبدالحق صاحب[1] (خیرآبادی) بھلا کب رکنے والے تھے عرض کی "حضور ارڈسا تو اپنی ناموری کے خیال سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۷) برص اور بہری کے مرض نے ایسا پریشان کر دیا ہے اور مجھے اتنی تکلیف ہے کہ میں چاہتا ہوں ڈیڑھ کروڑ روپیہ میرے خزانے میں ہے وہ کوئی لے لے اور مجھے اچھا کر دے"۔ مہراج سمجھ گئے بولے "بھائی صاحب ڈیڑھ کروڑ آپ کی طرف سے اور سات کروڑ میری طرف سے۔ کوئی آپ کو اچھا تو کر دے۔

[1] مولانا نہایت آزاد منش اور ظریف الطبع تھے۔ اُن کے لطائف اگر کوئی لکھنے بیٹھے تو ایک کتاب ہو جائے۔ ڈاکیا خطوط دیتا آپ بے پڑھے بلکہ بے کھولے چاک کر کے تسلے یا انگیٹھی میں ڈال دیتے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۸) ڈاکیا کہتا صاحب دو خط بیرنگ تھے۔ کتنے چار آدمی سے محصول نے لے۔ ایک دن حضرتؒ کے سامنے بھی یہی ہوا۔ پوچھا " مولانا یہ کیا ادا ہے"۔ کہنے لگے "بھئی خط دو تین قسم کے ہوتے ہیں۔ گھر کا خط ہوگا تو وہی دکھڑا کسی کو بخار آتا ہے کسی کی آنکھیں دکھتی ہیں۔ خرچ کی تکلیف ہے۔ پوچھو کوئی بیمار ہے تو میں کیا کروں۔ تنخواہ معمولی بھیجدی جاتی ہے۔ اب اور روپیہ کہاں سے لاؤں۔ کسی شاگرد کا خط ہوگا تو وہی فضول سوالات۔ فلاں کتاب میں ایسا لکھا ہے اس کا مطلب فلاں مولوی صاحب یہ بتاتے ہیں آپ کی رائے اس باب میں کیا ہے۔ خانۂ ملاح در چین است وکشتی در فرنگ میں اتنی دور بیٹھا ہوں بھلا تحریر کے ذریعے اُسے کیا سمجھاؤں۔ کسی دوست کا خط ہوگا تو وہی بیکار باتیں۔ بڑے بے مروت ہو برسوں سے نہ خود آئے۔ نہ کوئی خط لکھا"۔

نواب خلد آشیاں نے حج کا ارادہ کیا تو ہاتھی بھی ساتھ لے جانا چاہا اور ہاتھی بمبئی روانہ بھی کر دیا گیا۔ ایک دن مولانا سے کہا " مولانا عرب کے لوگوں نے ہاتھی نہ دیکھا ہوگا میں اپنے ساتھ ہاتھی بھی لیے جاتا ہوں لوگ دیکھ کر خوش ہوں گے"۔ مولانا بولے "حضور بہت مناسب ہے۔ اصحاب فیل کے بعد حضور ہی ہاتھی لے کر جاتے ہیں یہ واقعہ بھی یادگار رہے گا"۔ نواب نادم ہوئے اور دم بخود رہ گئے۔ اُسی وقت حکم دیا کہ ہاتھی واپس لایا جائے مولانا کی عمر کے آخری حصے میں سرکار نظام سے چار سو (۴۰۰) روپے ماہوار ان کا وظیفہ مقرر ہوگیا تھا۔ فرماتے تھے خدا کی قدرت دیکھو عمر بھر تو ریاست رام پور کی ملازمت کی اور پنشن دلوائی حیدر آباد سے۔

عالی جناب نواب سید محمد حامد علی خاں بہادر بالقابہ نے بھی مشتاق ہوکر بہت اصرار سے مولانا کو بلا کر اپنے پاس رکھا ایک دن نواب نے کہا " مولانا میرے سر میں درد ہوا کرتا ہے"۔ مولانا بول اٹھے "حضور کے سر پر دو چڑیلیں آتی ہیں"۔ نواب نے تعجب سے پوچھا " مولانا یہ کیا؟ " کہا " ایک حکیم دوسرا ڈاکٹر۔ اگر یہ دونوں آسیب دور ہو جائیں تو پھر کبھی اس قسم کی شکایتیں حضور کو نہ ہوں"۔

۱۸۸۱ء میں جب میں رام پور گیا تھا اُن دنوں نواب چھٹن صاحب کے مکان پر مشاعرے ہوتے تھے جس مشاعرے کی طرح سے لہو مراعرق انفعال کرتے ہیں۔ تھی۔ اس میں شرکت کا فخر مجھے بھی حاصل ہوا تھا۔ ایک بے تکلف صحبت شعر وسخن تھی۔ مولانا صاحب مرحوم اور فصیح الملک مغفور بھی اُس مشاعرے میں

درخواست کرنے پر بھی سب کو بھگا دیا۔ یہ معمہ میری سمجھ میں نہ آیا کہ ہم لوگ کس مصلحت سے شہر بدر کر دیئے گئے تھے"۔ نواب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے فرمایا "مولانا آپ لوگ مجھے ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں۔ راجا صاحب میری اور تو جس چیز کو پسند کرتے میں دیدیتا لیکن اگر وہ آپ لوگوں میں سے کسی کو مجھ سے مانگتے تو میں کیا کرتا۔ نہ دیتا تو انھیں رنج ہوتا اور دے دیتا تو یہ صدمہ مجھ سے اٹھایا نہ جاتا زندگی بھر کف افسوس ملتا"۔

ابتدا ہی سے نواب خلد آشیاں حضرتؒ کے ساتھ خصوصیت کا برتاؤ رکھتے تھے۔ تنخواہ بھی دونی کر دی تھی۔ جب ۱۲۸۳ھ میں اپنے والد کی طرح کونسل کے ممبر ہو کر کلکتے تشریف لے گئے تو اُن کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ حضرتؒ اپنے ایک خط میں شاد آب مرحوم کو لکھتے ہیں "جلوت کی ملاقات میں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم نوکر اور یہ آقا ہیں مگر خلوت میں وہ برتاؤ تھا جیسا بے تکلف سچے احباب میں ہوتا ہے" (خطوط منشی امیر احمد)

نواب خلد آشیاں نے پہلے برسوں خود تو کچھ کہا نہیں مگر دربار میں اور فنون کے مثل شعر و سخن کا بھی چرچا رہتا تھا۔ نواب خود ذی علم ذی ہنر اور صاحب علم و اہل ہنر کے نہایت قدردان تھے۔ مباحثے مناظرے کے دیکھنے سننے کا بہت شوق تھا جیسا کہ میں نے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۹ ۔ تشریف رکھتے تھے۔ پہلے منشی محمد احمد صاحب صریر نے صدر میں بیٹھ کر نواب خلد آشیاں کی غزل پڑھی اس کے بعد اور شعرا نے اپنی اپنی غزل سنائی۔ میرزا حیا کے صاحبزادے کو خدا جانے طرح کا مصرع غلط پہنچا تھا یا اور کوئی سبب ہوا انھوں نے طرح کے خلاف ردیف میں (ملال ہو اکمال ہوا) غزل کہی تھی۔ ان کی باری آئی تو جیسے ہی مطلع کا پہلا مصرع پڑھا۔ مولانا نے فوراً کچھ منھ بنا کے ان کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا "واہ! آپ تو ڈگی سے سرپٹ جانے لگے"۔ تمام مشاعرہ ہنسی کے مارے بیچین تھا مگر ادب آنکھ دکھاتا تھا۔ بیچارے نے مشکل سے دو شعر پڑھے اور عذر کر کے غزل جیب میں رکھ لی۔ اس ظرافت میں یہ نکتہ تھا کہ طرح کے خلاف ردیف میں غزل پڑھنا ہی کیا۔

بعض بزرگوں سے سنا ہے اکثر اُن کا دربار گویا ایک درسگاہ علم وہنر ہوتا تھا صورت یہ تھی کہ کسی طبیب سے کہا "حکیم صاحب آج میرے سر میں درد ہوتا ہے کچھ دوا تو تجویز کر دیجئے"۔ طبیب نے معمولی حال پوچھا اور نسخہ لکھ کر پیش کر دیا۔ آپ نے ملاحظہ کر کے یہ کہتے ہوئے دوسرے طبیب کی طرف نسخہ بڑھا دیا "حکیم صاحب دیکھئے تو میرے خیال میں یہ دوا تو نسخے سے نکال ڈالنے کی ہے"۔ اور یوں دونوں طبیبوں میں بحث شروع کرادی۔ درمیان میں اور طبیبوں کی بھی رائے پوچھی بس پھر کیا تھا کچھ اِدھر ہوئے کچھ اُدھر اور آپ مسکراتے ہوئے ان کی بحث نہایت غور سے سن رہے ہیں کسی دن کسی محاورے یا عروض قافیے کا ذکر چھیڑ کر شعرا میں مباحثہ کرادیا کبھی کوئی فقہ وغیرہ کا مسئلہ پوچھ کر علما میں مناظرہ کرادیا۔ اس اصول سے نواب کی وسعت نظر اور تحقیق بہت بڑھ گئی تھی۔

کبھی کبھی اپنی اصلاح شدہ غزل بھی مجمع شعرا میں لے بیٹھتے اور فرماتے "میں نے یہ شعر اس طرح کہا تھا۔ میاں آمیر نے اس کو یوں بنایا ہے۔ مجھے تو اپنا ہی کہا ہوا اچھا معلوم ہوتا ہے (کبھی کبھی فرماتے تھے "میاں آمیر کہتا تو میں ہی اچھا ہوں مگر اصلاح تم خوب دیتے ہو")[1]۔ آپ لوگ کیا کہتے ہیں" اس پر بیشتر شاعر نواب کی طرف ہو جاتے۔ آپ مسکراتے ہوئے آمیر کی طرف دیکھتے یہ اصلاح کے وجوہ بیان کر کے (پہلے سے غزل میں لکھے بھی ہوتے تھے) عیب وصواب سے آگاہ کرتے اور نہ چھیڑ اسی پر ختم ہو جاتی۔

۱۲۸۹ھ میں خلد آشیاں نے پہلے پہل غزل کہی۔ اُس وقت دربار میں جو نامور

[1] لطیفہ:۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ ایک دن صبح کو جو میں سرکار میں گیا تو میر مجاور علی (پرائیوٹ داروغہ) مجھ سے کہنے لگے "آج آپ کی قسمت یاری کرتے کرتے پھر گئی"۔ میں نے پوچھا "کیا ہوا؟ کہا "کوئی اصلاح بہت پسند آئی بار بار پڑھتے اور جھومتے رہے پھر مجھ سے ارشاد ہوا مجاور ۱۲۵ اشرفیاں تو لے آ۔ میں نے لیجاکر رکھدیں۔ ایک لمحے کے بعد ارشاد ہوا کہ ۶ ماشی لے آ۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد ۳ ماشی منگوائیں۔ آخر میں فرمایا ابھی تو یہ سب اٹھالے جا پھر دیکھا جائے گا"۔

شعرا موجود تھے سید اسمٰعیل حسین منیرؔ مرحوم کے ایک قصیدے میں ان کی تفصیل ہے۔

مجمع شاعران نامی ہے — شاعری کی ہے گرم بازاری
بحرؔ منشی اسیرؔ اور امیرؔ — ہمسر انوری و مختاری
طبع پاک عروجؔ و داغؔ سے ہے — منفعل ابر کی گہرباری
ہے جلالؔ و حیاؔ و شاغلؔ سے — محفل نظم جلوہ گرساری
مثنوی میں صباؔ و خواجہ بشیرؔ — رونق شاعری و نثاری
بدر شاداں عمیسؔ غنیؔ ہر دم — رہتے ہیں مدح خوان سرکاری
فارسی گو نثارؔ شیرازی — ترز بانی میں ابر آزاری
فن تاریخ میں رساؔ منصور — جانؔ صاحب کی ریختی پیاری
سب سے بڑھ کر منیرؔ کو حاصل — یکمالی و ہرزہ گفتاری[۱]

خصوصیت کے ساتھ قابل خیال داغؔ مرحوم اس وجہ سے ہیں کہ ان کے شاگرد حضرت سیمابؔ اکبر آبادی اُن مرحوم کی سوانح عمری میں لکھتے ہیں " مرزا صاحب رام پور پہنچے تو نواب صاحب (فردوس مکاں نواب یوسف علی خاں) نے اُن کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ لیا اور نواب کلب علی خاں کا مصاحب مقرر کر دیا۔ نواب کلب علی خاں کا

[۱] معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب الدولہ قلقؔ مرحوم اس زمانے میں وہاں سے چلے جا چکے تھے جب منیرؔ مرحوم نے یہ قصیدہ کہا تھا اور شاید منشی امیر اللہ تسلیمؔ مرحوم اس وقت تک رام پور نہ گئے ہوں گے۔ فداؔ مرحوم کی زبانی سنا ہے کہ جس زمانے میں سرکاری مشاعرے ہوتے تھے شعرائے دربار میں سے کبھی کبھی کسی کو شرکت میں دیر ہو جاتی تھی۔ خلد آشیاں کے مزاج پر یہ بات گراں گزرتی تھی۔ آخر ایک دن یہ حکم دے دیا کہ " ۹ بجے کے بعد جو آئے اس سے کہہ دیا جائے کہ اب اجازت نہیں ہے "۔ اتفاق سے قلقؔ مرحوم ۹ بجے کے بعد پہنچے تو سنتری نے عرض کی " اب اجازت نہیں ہے "۔ مرحوم گھر بھی نہ گئے اسی جگہ سے مراد آباد اور وہاں سے لکھنؤ چلے گئے۔

زمانۂ ولی عہدی تھا اور انھیں ایک مصاحب کی سخت ضرورت تھی جو انھیں علم و ادب میں بہرہ اندوز کر سکے اور ان کی آئندہ زندگی میں قابلانہ اثرات پیدا کرے۔ مرزا صاحب نے عہد یوسفی میں ایک خاموش مگر معزز زندگی بسر کی اور کچھ زمانے کے بعد جب نواب کلب علی خاں سریر آرائے حکومت رام پور ہوئے تو درباری شعرا میں[۱] مرزا صاحب کو بھی ایک خاص اور ممتاز درجہ مل گیا جس کے وہ ہر طرح اہل تھے۔ نواب کلب علیخاں مرحوم کو مرزا صاحب کی مصاحبت نے ایک سخن فہم اور سخن گو رئیس بنا دیا تھا اور جب وہ تخت پر بیٹھے تو اچھے خاصے شاعر تھے"

بہرحال نواب خلد آشیاں نے اصلاح کے لیئے غزل امیر ہی کے پاس بھیجی اور انھیں سے تلمذ اختیار کیا۔ ع چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل سے نمود تھی ٭ پہلی پھڑک اٹھی نظر انتخاب کی۔ یہ ایک بدیہی ثبوت ہے اس امر کا کہ امیر اپنے ایسے ایسے ہم عصر شعرا میں نہایت ممتاز قادر الکلام مسلم الثبوت استاد اور بے مثل شاعر تھے۔

اب نواب صاحب کو شعر گوئی کا شوق ہوا۔ دن کو تو زیادہ تر امور ملکی و مالی میں مصروف رہتے تھے، رات کو شعر کہتے تھے اور ہرکاروں کی ڈاک لگی رہتی تھی۔ اِدھر شعر کہا اور اُدھر لفافے میں بند ہو کر استاد کے پاس پہنچ گیا۔ کسی کسی دن تو پچھلی رات تک یہی سلسلہ رہتا تھا حضرتؒ رات ہی کو غزل پر اصلاح دیتے اصلاح کے وجوہ لکھتے اور صبح کی نماز سرکار ہی میں جا کر پڑھتے تھے۔ پہلے یہ اصلاح شدہ غزل پیش کر لیتے اس کے بعد مصاحب منزل میں دربار شروع ہوتا تھا۔ برسوں نواب صاحب شعر گوئی کے ذوق میں اور اُستاد کلام کی درستی اور اصلاح میں راتوں کو بہت کم سوئے۔ اسیر مرحوم کہا کرتے

---

[۱] جہاں تک ہم کو معلوم ہے داغ مرحوم داروغۂ اصطبل اور منصرم فراش خانہ تھے۔

"جوشِ اطاعت اور پاسِ نمک خواری میں یہ شب بیداری اور اصلاح میں ایسی دشواری برداشت کرنا تمھارا ہی کام ہے۔ میں تو کوڑی دُکان بھیک مانگ لوں مجھ سے یہ سختیاں نہ اُٹھیں یہ پاپڑ نہ بیلے جاسکیں"۔

اصلاح میں دشواری کا حال حضرت ریاضؔ مجھ سے بیان کرتے تھے کہ بعض بعض مرتبہ حضرتؒ کو ایک ایک شعر پر پچیس پچیس اصلاحین دینا پڑی ہیں۔ نواب صاحب دل سے تو ہر اصلاح پسند کرتے لیکن آزمایش کے لئے زبردستی کوئی نہ کوئی بات نکال دیتے اور اس پر اصرار کرتے کہ کچھ اور ترمیم کیجئے۔ یہ بھی بند نہ ہوتے اور اپنی جان لڑا دیتے۔ یہ انھیں کا کام تھا کہ زمین اور مضمون کی پابندی کے ساتھ ساتھ اتنی اصلاحیں دیتے اور ترمیم کرتے تھے۔

یہ تو خیر آقا کے کلام کی اصلاح تھی جب تک شاعری سے نفرت نہ ہوئی تھی تمام شاگردوں کے کلام پر نہایت توجہ سے اصلاح دیتے تھے۔ شعر میں کوئی پہلو ترقی وغیرہ کا ان کی نظر اصلاح سے بچ کے نہ جاتا تھا[۱]۔ محتاط طبیعت اصلاح میں بھی کمی نہ کرتی تھی۔ فداؔ مرحوم فرماتے تھے کہ جن دنوں سرکاری مشاعرے ہوتے تھے حضرتؒ کو بہت کم فرصت ہوتی تھی یہاں تک کہ کبھی کبھی خود بھی غزل نہ کہہ سکتے تھے تاہم یہ معمول تھا کہ شاگردوں کی غزل پر اصلاح دے کر فرماتے "صاف کر کے پھر دکھا لینا" اس کے بعد جس دن مشاعرہ ہوتا اس روز غزلوں کو پھر ایک نظر دیکھ لیتے تھے۔

---

[۱] فداؔ مرحوم نے غزل کہی ؎ جوشِ سودا گھٹ چلا ہے میرے سر سے دیکھنا ؛ اے پری ہاں پھر اُسی بکی نظر سے دیکھنا۔ غزل میں مرحوم کو اس شعر پر ناز تھا کہ ردیف خوب چمکی ہے ؎ میں ادھر غش کھا کے جب گرنے لگا ہنگام دید ؛ بول اٹھا وہ خود نما ہنس کر اُدھر سے دیکھنا۔ سب لوگوں نے اس شعر کی بہت تعریف کی۔ جب غزل اصلاح کے لیے پیش ہوئی تو حضرتؒ نے یہ شعر کاٹ دیا اور لکھ دیا "اُدھر سے بول اٹھا میں ذم کا پہلو ہے اور تم سے تعجب ہے کہ اس کا خیال نہیں کیا"۔

۱۸۸۹ء سے اصلاح کا طریقہ میں نے یہ دیکھا کہ شاگردوں کی غزل کبھی خود دیکھ کر اصلاح دیتے تھے کبھی منشی سید محمد عسکری صاحب وسیم (جو مجھ سے پہلے دفتر امیر اللغات کے سکرٹیری تھے) اور اُن کے بعد جلیل القدر نواب فصاحت جنگ حافظ جلیل حسن صاحب جلیل سے سنتے جاتے اور اصلاح لکھواتے جاتے۔ چند نمونے اس کے یہاں دکھائے جاتے ہیں۔

نواب ؎ یہ کون آیا کہ جس کے بیٹھنے سے — اٹھے ہیں سیکڑوں فتنے کمیں سے

اصلاح ؎ " " " بیٹھتے ہی — " " " " " "

نواب ؎ تجھی کو جو سمجھتا ہو گا سب کچھ — اسے مطلب بھلا کیا کفر و دیں سے

اصلاح ؎ تجھی کو جو کوئی سمجھا ہو سب کچھ — " " " " " "

نواب ؎ بنائے ہیں ستمگر کیسے کیسے تو نے دنیا میں — پئے بیداد یارب دل بھی ہوں دو چار پہلو میں

اصلاح ؎ " " " " " " — ستم سہنے کو " " " " "

فدا ؎ ہوش بلبل کے اڑائے ہیں صبا نے کیسے — پتے کھڑکا دیئے دو چار کہ صیاد آیا

اصلاح ؎ ہوش بلبل کے اڑانے کو صبا آندھی ہے — " " " " " "

ریاض ؎ ہنگام نزع گریہ یہاں بیکسی کا تھا — آپ بتائیں کون یہ موقع ہنسی کا تھا

اصلاح ؎ " " — تم ہنس پڑے یہ کونسا موقع ہنسی کا تھا

ریاض ؎ نسیم آئی ہے شمع مزار گل کرنے — وہ صبح ہونے سے پہلے ہی جل بجھی ہو گی

اصلاح ؎ نسیم اب آئی ہے شمع مزار گل کرنے — " " " " " "

زاہد ؎ زاہد نے نقش پائے صنم کو مٹا دیا — کچھ ایسے ہوش اڑے نہ رہا ہوش نقش پا

اصلاح ؎ " " — کچھ شوق سجدہ میں نہ رہا ہوش نقش پا

عابدؔ ؎ طرۂ وجیغہ دستر پیچ ہیں طرفہ لیکن
طرہ خوبی میں ہے ان تینوں کے اوپر سہرا

اصلاح ؎ طرۂ وجیغہ دستر پیچ ہیں سب چوٹی کے
دل کے لینے میں مگر طرہ ہے سب پر سہرا

کوثرؔ ؎ کسر نہ رونے میں اے چشم تر اٹھا رکھنا
زرا جو تھم گئے آنسو تو کرکری ہوگی

اصلاح ؎ جھپک نہ جائے مری آنکھ ابر تر سے کہیں
زرا جو تھم گئے آنسو بڑی ہنسی ہوگی

جگرؔ ؎ خوش نصیبی ہے جو لبریز ہوا ساغر عمر
لب بلب ہوتے ہی ساقی ترے پیمانے سے

اصلاح ؎ " " " "
لب بلب ہو کے چھلکتے ہوئے پیمانے سے

دلؔ ؎ قیس پہنچا ہے دور ناقہ سوار
گرد بھی اب نظر نہیں آتی

اصلاح ؎ قیس کیا دیکھتا ہے ناقے کو
" " " "

قرارؔ ؎ احباب چارہ ساز بنے ہیں شب فراق
تبدیل ہو نہ صورت زخم جگر کہیں

اصلاح ؎ ہمدرد چارہ ساز بنے ہیں شب فراق
" " " " " "

ایک روز خاص دربار میں نواب خلد آشیاں نے دو چار شعر ہوسؔ کے قصیدے کے پڑھے اور فرمایا کہ اس زمین میں اب تو ایسا قصیدہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ یہ سن کر حضرتؒ کو لاگ سی ہو گئی اور منقبت میں قصیدہ کہا! جازت حاصل کرکے دربار میں وہ قصیدہ سنایا جس کی تشبیب کے چند شعر یہ ہیں :-

کیونکر نہ کروں ملک معانی کو میں تسخیر
خامہ ہے مرا دست یداللہ کی شمشیر

آئے جو تعلی پہ مری ہمت عالی
دشوار نہیں قلعۂ افلاک کی تسخیر

جو معنیٔ روشن ہے وہ ہے غیرت خورشید
سودا نہیں مجکو جو کروں مہر کو تسخیر

سرکش مری نرمی سے کبھی بڑھ نہیں سکتے
لہر آب کی شعلے کیلئے بنتی ہے زنجیر

انصاف کی چھوٹے دم انشا نہ رعایت
پروانے کروں میں قلم شمع سے تحریر

دل صاف زباں صاف سخن صاف ہے میرا — موتی کی لڑی[ل] ہے کہ مسلسل مری تقریر
طائر آتے ہیں ٹھہر جاتی ہیں نہریں — داؤد صفت ہے وہ مرے لحن میں تاثیر
شعر اپنے بیاضِ دلِ غلماں پہ جو لکھوں — دے مردمکِ حور سیاہی پئے تحریر
خضرِ رہِ باطن ہے مری غفلتِ ظاہر — یوسف کی زیارت ہے مرے خواب کی تعبیر
قل نکلے زباں سے جو مری ہو قمِ عیسیٰ — واں جی اُٹھے مردہ تو یہاں بول اٹھے تصویر
تھے قبضۂ خسرو میں معانی کے جو کشور — سب میں نے کئے تیغِ زباں کھینچ کے تسخیر
جب مصحفی و میر پئے تہنیت آئے — تھوڑی سی زمیں دی انھیں اس ملک میں جاگیر
لطفِ سخنِ تازہ کہاں اُن کے سخن میں — کہنہ ہوں دوائیں تو بدل جاتی ہے تاثیر

جب یہ شعر پڑھا ؎

بیچارہ ہوس کیا ہے کہے گا جو قصیدہ — ایسے تو بہت ہیں مرے گلشن میں عصافیر

خلد آشیاں نے مسکرا کر فرمایا "میں نے آپ کی نسبت نہیں کہا تھا آپ تو سب کچھ کہہ سکتے ہیں۔"

نواب ذوالفقار علی خاں مرحوم (بڑے بیٹے کی حیثیت سے اُس وقت ولی عہد ہی تھے) کی شادی رچی۔ نواب خلد آشیاں نے حکم دیا کہ در و دیوار سبز رنگے جائیں شہر آراستہ ہو۔ شعرا سہرے اور مبارکبادیں کہیں اور انھیں ارباب نشاط گلی کوچے میں گاتے پھریں۔ حضرت نے بھی سہرا لکھ کر پیش کیا۔ خلد آشیاں نے ملاحظہ کر کے فرمایا "منشی صاحب یہ تو کچھ نہیں کوئی اچھا سا سہرا کہئے"۔ حضرتؒ کی طبیعت میں ایک جوش پیدا ہوا۔ اور دوسرے دن دوسرا سہرا پیش کیا۔ اُس پر ارشاد ہوا اس سے تو پہلا ہی اچھا تھا۔ اب یہ معمول سا ہو گیا کہ روز ایک

ل اب "موتی کی لڑی" ترک کر دیا تھا۔ "موتیوں کی لڑی" کہتے تھے۔

سہرا لکھکر پیش کرتے اور ہر روز اسی قسم کے فقرات سنتے تھے۔ ایک سہرے پر یہ بھی فرما دیا "لاحول ولا قوۃ آپ میرے استاد ہوکر ایسا معمولی سہرا کہتے ہیں"۔ غرض سولھا سہرے اسی طرح ناپسند ہوگئے۔ سترھویں دن سترھواں سہرا لکھکر سنایا جب یہ شعر پڑھا ؎ پھول جھڑتے ہیں جو ہنسنے میں دلھن کے منہ سے ٭ میری مالن انھیں پھولوں کا بنالا سہرا۔ خلد آشیاں اچھل پڑے اور بے اختیار زبان سے "سبحان اللہ" نکل گیا۔ مکرر سہ کرر پڑھوایا اور جھومتے رہے جب سرور کچھ کم ہوا تو فرمانے لگے "منشی صاحب! سچ تو یہ ہے کہ آپ نے ایک سے ایک بہتر سہرا لکھا۔ میں تو آپ کا امتحان کرتا تھا کہ دیکھوں سہرے کے مضامین آپ کہاں تک کہہ سکتے ہیں۔ میں تو عقد کے دن تک آپ سے یوں ہی سہرے کہواتا رہتا مگر کیا کروں اس شعر کو سن کر ضبط کا یارا نہ رہا"۔

اسی طرح ایک بار سرکاری مشاعرے میں طرح ہوئی ؎ پتھر بنا جو شیشہ تو توبہ شکن ہوا۔ بعد مشاعرہ حسب معمول نواب صاحب نے حضرتؒ کی غزل منگوا کر ملاحظہ کی اور فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے اس زمین میں آپ نے جی لگا کر غزل نہیں کہی۔ حضرتؒ اداشناس تو تھے ہی دوسرے دن دوسری غزل پیش کی۔ ملاحظے کے بعد فرمایا "یہ غزل بھی آپ نے توجہ سے نہیں کہی۔ ذرا پوری فکر کیجئے"۔ تیسری غزل پر ارشاد ہوا "میاں امیر معلوم ہوتا ہے یہ زمین ہی پھولنے پھلنے کی نہیں ہے" آخر حضرتؒ نے جھنجھلا کر چوتھی غزل ملاحظے میں گزرانی۔ اس فکر فلک پیما اور قوت گویائی کو دیکھ کر نواب میں طاقت امتحاں نہ رہی، بے اختیار بول اٹھے "منشی صاحب آپ ہی کو خدا نے یہ قدرت دی ہے کہ جب چاہا جتنا چاہا اور جیسا چاہا کہہ لیا"۔

یہ غزلیں مرآۃ الغیب میں چھپ چکی ہیں۔ یہاں چند شعر لکھے جاتے ہیں ؎

چھیڑا جو میں نے یار کو گرم سخن ہوا ٭ پیدا مری زبان سے اس کا دہن ہوا

وہ مست ہوں نصیب مجھے تب کفن ہوا — جب ہم مئے فروش کے گھر پیرہن ہوا
یہ موشگافیوں سے ہوا شاعروں کی تنگ — علم خدا میں جا کے نہاں وہ دہن ہوا
رکھنا تھا پاک پرسش روز حساب سے — اس واسطے عطا نہ بتوں کو دہن ہوا
سو عکس آئنے میں پڑے اور مٹ گئے — اس گھر میں جو گیا وہ غریب الوطن ہوا
روئیں لپٹ کے خوب مرے دل کی حسرتیں — غربت میں یہاں جو خیال وطن ہوا
احباب اپنے اپنے گھروں میں ہیں محو عیش — کس کو خبر کہ کون غریب الوطن ہوا
طالب کو تیرے جلوے نے مطلوب کر دیا — نظارۂ جمال سے بت برہمن ہوا
چھانی ہے پھاڑ پھاڑ کے اس میں شراب ناب — کیا صرف کار خیر مرا پیرہن ہوا
لالچ تھا واسطے ہی سے ذوق سخن ملے — اس سے میں ہم سخن سے ترے ہم سخن ہوا
لکنت نہیں فراق ترا ناگوار ہے — لب پر رکا جدا جو زباں سے سخن ہوا
چارۂ غم فراق کا کیا ہے سوائے صبر — ٹھہری زباں جدا جو زباں سے سخن ہوا
گالی تو دی سوال پہ اُس نے ہزار شکر — دست سوال جادۂ راہ سخن ہوا
مجھ مست کی ہے ہاتھ ترے یا رب آبرو — تجھ کو کریم جان کے توبہ شکن ہوا
نفرت ہوئی فراق میں ایسی شراب سے — زاہد کہا کیا میں نہ توبہ شکن ہوا

قسمت کے پیچ دیکھے ان آنکھوں نے اسقدر
تار نگاہ زلف شکن در شکن ہوا

خلد آشیاں کو حضرتؒ کا ادب ہمیشہ ملحوظ خاطر رہتا تھا۔ اُن کے سامنے کبھی محفل رقص سرود یا اور کوئی بے تکلف صحبت نہ ہوتی۔ حضرتؒ فرماتے تھے "سنا ہے خلد آشیاں نہایت

لہ یہ مومن مرحوم کا رنگ ہے۔

خوش گلو اور فن موسیقی میں بھی کامل تھے[1]۔"

حضرتؒ فرماتے تھے "خلد آشیاں نہایت محرور المزاج تھے۔ گرمیوں میں دن کو خس کے بنگلے میں بیٹھے رہتے تھے جس کو ہم اسکے برابر پانی سے تر رکھتے ہیں تو جب کبھی اُس بنگلے میں حاضر ہوا مجھے زکام ہو گیا۔ پانی ٹھنڈا کرنے کو صراحیاں اتنی برف میں لگائی جاتیں کہ ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھیں۔"

ایک دن خاص دربار میں خلد آشیاں مولانا عبد الحق مرحوم سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے "مولانا خدا نے مجھے ایسا محرور المزاج پیدا کیا ہے کہ غصے کو ضبط کر جاتا ہوں تو مجھے بخار آجاتا ہے۔" مولانا کی بیچین طبیعت بھلا کب رکتی تھی پوچھا "حضور کیا کوئی ایسا بھی ہے کہ اس پر غصہ آتا ہے تو حضور کو ضبط کرنا پڑتا ہے؟" مسکرا کر فرمایا "ایک تو آپ ہی کی ذات مبارک ہے دوسرے (حضرتؒ کی طرف دیکھ کر) یہ بیٹھے ہیں۔"

ایک بار خوش قسمتی سے مجھے بھی خلد آشیاں کی زیارت قریب ہی سے اس طرح نصیب ہو گئی تھی کہ بقر عید کا دن تھا۔ چلّے کے جاڑے اور جاڑے بھی رہیلکھنڈ کے اس پر طرہ صبح کا وقت۔ چھڑکاؤ کر کے سڑک خوب تر کی گئی تھی۔ ہم لوگ گرم کپڑے پہنے اوڑھے تھے

---

[1] ندا مرحوم جو خود بھی بڑے کن رسیا تھے کہتے تھے کہ "گرمیوں کے دن اور چاندنی رات تھی میں اپنے کوٹھے پر لیٹا تھا (مکان در دولت سے قریب تھا) رات بڑھے خلد آشیاں خورشید منزل کی چھت پر اپنی یہ نئی غزل گا رہے تھے ۔ ساقیا دے تو ذرا ناز سے اک جام مجھے ؛ کہ سمجھتے ہیں بہت نیک مے آشام مجھے ۔ کیسے کیسے ترے وصلت کے مزے لوٹوں میں ؛ زندہ رہنے دے اگر لذت دشنام مجھے ۔ آواز با مدارا ہونے سے صاف سنائی دیتی تھی۔ گانے میں غزل کو مستزاد بنا دیا تھا۔ ہر تان اور مُرکی چھری کٹاری تھی اور مجھ پر مرغ بسمل کی سی کیفیت طاری تھی۔ دل میں کہتا تھا کہ آج یہ کون نیا خوش گلو استاد فن سرکار میں گا رہا ہے۔ صبح کو دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ خود حضور پر نور تھے۔"

پھر بھی دانت سے دانت بج رہا تھا۔ شیخ زید الزماں مرحوم کے مکان پر جو در دولت سے قریب تھا۔ سواری کی بہار دیکھنے کو کھڑے تھے۔ نواب صاحب ہوادار پر سوار نکلے تو صرف جامدانی کا کرتا پہنے تھے اور دوشالہ پاؤں پر پڑا تھا۔

۱۲۹۶ھ میں خلد آشیاں کسی بات پر مفتی طالب حسن مرحوم سے ناراض ہو گئے اور مفتی صاحب ترک ملازمت کر کے لکھنؤ چلے گئے تھے۔ ایک روز نواب صاحب نے حضرتؒ سے فرمایا "میں سنتا ہوں آپ اپنے بھائی سے خط و کتابت رکھتے ہیں"۔ عرض کی "حضور یہ صحیح ہے اور اس میں تعجب کی کیا بات ہے"۔ فرمایا "آپ کو اس کا خیال نہیں ہے کہ میں ان سے ناراض ہوں"۔ عرض کیا "حضور اس کا تو افسوس ہی رہتا ہے لیکن بڑا بھائی اور وہ بڑا بھائی جس نے باپ کی طرح میری پرورش کی بھلا مجھ سے کب چھوڑا جا سکتا ہے۔ کیا اب میں اتنے سے بھی گیا گزرا ہوا کہ اُن سے خط و کتابت رکھوں"۔ بات کچھ نہ تھی مگر رئیس تو رئیس اُس وقت خدا جانے کس خیال میں تھے فرمایا "مگر میں اس کو گوارا نہیں کر سکتا یا اپنے بھائی سے قطع تعلق کیجئے یا مجھ سے ترک تعلق کیجئے"۔ کچھ سکوت کر کے عرض کی "اس کا جواب میں پھر دوں گا"۔ گھر آئے تو چپکے چپکے روانگی کا سامان کر کے اس خیال سے کہ نواب صاحب مارج ہوں گے رات کو پوشیدہ طور سے بنس میں سوار ہو کر مراد آباد اور وہاں سے ریل پر لکھنؤ چلے گئے۔ پھر رفتہ رفتہ اہل و عیال کو بھی حکمت عملی سے بلا لیا۔ نواب صاحب دل ہی دل میں پچھتاتے اور افسوس کرتے۔ تنخواہ برابر بھیجتے رہے۔ آخر طلبی میں خط بھیجا حضرتؒ نے معذرت کی۔ چند روز کے بعد ایک مصاحب کو بھیجا کہ سمجھا بجھا کر لے آؤ۔ وہ ناکام واپس آئے تو چندے توقف کر کے دوسرے مصاحب اور اسی طرح تیسرے مصاحب بھیجے گئے مگر حضرتؒ نے معذرت ہی کی۔ آخر نواب صاحب نے

لکھا کیا آپ چاہتے ہیں کہ باوجود ناسازی طبیعت اور ضعف و نقاہت کے میں خود آپ کو لینے لکھنؤ آؤں"۔ اب انکار کا موقع عذر کی مجال نہ تھی جواب میں کچھ ایسا لکھا کہ نمکخوار قدیم فوراً اٹھ کھڑا ہوتا مگر اس دوسوا دو برس میں یہاں پندرہ سولہ ہزار کا مقروض ہو گیا ہوں یہ قرض پانوؤں میں بیڑیاں ہو رہا ہے (یہ محض بہانہ نہ تھا بلکہ واقعہ تھا) نواب صاحب نے منشی محمد احمد صاحب کو طلب کر کے سولہ ہزار روپیہ دے دیا اور فرمایا "منشی صاحب کو اب جلد لے آؤ"۔ اب کوئی عذر مناسب نہ معلوم ہوا چنانچہ حضرتؒ پھر رام پور تشریف لے آئے۔

انھیں دنوں کا حال جب حضرتؒ لکھنؤ میں تشریف رکھتے تھے منشی محمد احمد صاحب نے مجھ سے بیان فرمایا کہ ایک روز آسیر مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے حضرت افضلؔ (افضل الدولہ مظفر الملک سید افضل علی خاں بہادر شوکت جنگ) حضرتؒ کے پاس آئے اور کہا "لکھنؤ کے لوگ آپ کا کلام سننے کے بہت مشتاق ہیں۔ بھائی جان (مرحمت الدولہ بہادر الملک سید غضنفر علی خاں بہادر صولت جنگ حکیم خلف اکبر آسیر مرحوم) نے اپنے یہاں ایک مشاعرہ قرار دیا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ ضرور اس مشاعرے میں شریک ہوں"۔ حضرتؒ نے اپنے صحیح عذرات پیش کیے۔ اس پر انھوں نے کہا "آپ کی غزلیں تو اس زمین میں مرآۃ الغیب میں موجود ہیں اُنھیں میں سے شعر انتخاب کر کے غزل پڑھ دیجیے گا۔ اور بھائی جان نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر آپ مشاعرے میں نہ شریک ہوں گے تو ہم سمجھیں گے کہ والد مرحوم کا شاگرد ہونے سے جو حق ہمارا آپ پر ہے اُسے آپ نے بھلا دیا"۔ یہ ایسی چبھتی ہوئی بات تھی کہ وعدہ کرتے ہی بن پڑا مگر اُن سے یہ اقرار لے لیا (بوجہ علالت) کہ جلد ہی آپ کو غزل پڑھ لینے کا موقع دیا جائے گا۔ حضرتؒ کو بجائے خود بھی یہ خیال رہا کہ مرآۃ الغیب میں سہ غزلہ موجود ہے اسی میں سے کچھ شعر انتخاب کر کے پڑھ دیں گے۔

اُستاد زادوں کی خوشی پوری ہوجائے گی۔ ابھی مشاعرے کو دو دن باقی تھے کہ حضرت افضل پھر آئے اور کہا "بھائی جان نے مجھے بھیجا ہے کہ آپ کو مشاعرہ یاد دلادوں" اور بہ سبیل تذکرہ یہ بھی کہا کہ "غزل کہنے میں محنت کرتے آج پندرہ دن ہوگئے ہیں راتوں کو سونا چھوڑ دیا ہے کیا کریں ہمیشہ یہی خیال رہتا ہے کہ ابّا جان کا نام روشن رہے" خیر وہ تو یہ کہہ کر رخصت ہوگئے لیکن یہ سن کر حضرتؒ کے کان کھڑے ہوئے اور شوق مرحوم اور بسمل کاکوروی نے کہا کہ ہم آپ کو پرانی غزل مشاعرے میں نہ پڑھنے دیں گے، اگر مشاعرے میں شریک ہونا ہے تو نئی غزل کہیئے۔ یہاں دل میں ایک جوش پیدا ہوا اور طبیعت کو لاگ ہوگئی۔ قدیم اور جدید رنگ پر خیال رکھ کر (کیونکہ دونوں رنگ کے شیدا اس وقت لکھنؤ میں موجود تھے) اس قلیل وقت میں دو غزلیں نئی کہیں۔ مشاعرے کے دن دونوں استاد زادے خود آکر حضرتؒ کو مشاعرے میں لے گئے اور ایک کمرے میں جو تمام ضروری سامان سے مرتب تھا حضرتؒ کو بٹھا دیا۔ صدہا شاعروں کے علاوہ ہزاروں سامعین رونق افروز مشاعرہ تھے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا ہر قسم کا سامان راحت موجود تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ عہد شاہی کے بعد سے ایسا مشاعرہ لکھنؤ میں کوئی نہیں ہوا تھا۔ چند شاعر غزل پڑھ چکے تو حضرتؒ نے جناب افضل کو ان کا وعدہ یاد دلایا۔ اس پر حضرت حکیم کھڑے ہوئے اور اہل مشاعرہ کو مخاطب کر کے کہا "حضرات جن کی شاعری کا شہرہ ہندوستان میں ہے اور جن کو سننے کے بہت سے لوگ اس مشاعرے میں بھی مشتاق ہیں وہ منشی امیر احمد صاحب مینائی استاد نواب صاحب رامپور آپ ہی ہیں۔ آپ زیادہ دیر تک بیٹھنے سے معذور ہیں اور مجھ سے وعدہ لے لیا تھا اس لئے اب آپ اپنی غزل پڑھتے ہیں۔ امید ہے کہ اس بے سلسلہ غزل خوانی کو آپ حضرات معاف فرمائیں گے"۔ آوازیں آئیں "بسم اللہ ہم سب ہمہ تن مشتاق ہیں" حضرتؒ نے غزل پڑھنا شروع کیا جس کے چند شعر یہ ہیں۔

اس شان سے ہم آئے تری جلوہ گاہ میں
مشعل دکھائی برق تجلّے نے راہ میں

اندھیر کر رہی ہے یہ چشم سیاہ میں
شوخی کو قید کیجئے نیچی نگاہ میں

توبہ بھی کچھ بھروسے کے قابل ہو زاہدو
پہنچی ہے ہم سے ٹوٹ کے اب خانقاہ میں

وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں
میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں

افتادگی میں بھی مجھے معراج ہے نصیب
ٹھوکر بھی کھائی ہے تو محبت کی راہ میں

آنکھ اپنی فتنہ ہائے قیامت پہ کیا پڑے
جسکے یہ فتنے ہیں وہ ہے اپنی نگاہ میں

بیتابیاں جو مانگیں تو دنیا نہ تو ہمیں
لے صبر اب ہم آئے ہیں تیری پناہ میں

تیرے جلال میں بھی مزہ ہے جمال کا
چشم کرم چھپی ہے غضب کی نگاہ میں

یہ عکس کس کے چاند سے چہرے کا پڑ گیا
پانی کو ناز ہے کہ میں یوسف ہوں چاہ میں

ہم ہیں سیاہ کار تو رحمت ہو پردہ پوش
مے پیتے ہیں تو سایۂ ابر سیاہ میں

غمزے کا بانکپن صف مژگاں میں دیکھئے
کس نوک کا جوان ہو یہ اس سپاہ میں

سوداؔ و میرؔ دونوں تھے کامل مگر امیرؔ
ہے فرق واہ واہ میں اور آہ آہ میں

تحسین کے شور اور ستایش کے غلغلے میں غزل ختم ہو گئی اور حضرتؒ اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔ مشاعرے میں بے خودی سے ایک سناٹا تھا اور کوئی اپنی غزل پڑھنا نہیں چاہتا تھا ع میں شعر پڑھ کے بزم سے کیا اٹھ گیا امیرؔ، بلبل چہک کے صحن چمن سے نکل گیا[1]۔ آخر تھوڑی دیر کے بعد نواب یوسف حسن خاں (تلمیذ رشید امیرؔ مرحوم) نے جناب حکیم سے

---

[1] منشی عبدالرحمن بسمل کہتے تھے کہ اسی وقت مشاعرے کے باہر بلکہ چوک تک حضرتؒ کے کئی شعر لوگوں کی زبانوں پر تھے جیسے ع وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں الخ ع آنکھ اپنی فتنہ ہائے قیامت پہ الخ ع افتادگی میں بھی ہمیں معراج الخ

مخاطب ہو کر کہا "یہ وہی شاعری تھی جس پر استاد مرحوم کو ناز تھا۔ خیر کیا یاد کرو گے یہاں بھی ہمیں تمھارے کام آتے ہیں" (خدا جانے دونوں میں یہ کیا راز و نیاز تھا) یہ کہکر اپنی غزل پڑھنا شروع کیا۔ جس کا پہلا مطلع یہ تھا ؎ اللہ رے پیچ و تاب مرے دود آہ میں: گھونگر بڑھا دیا تری زلف سیاہ میں۔ جس سے مشاعرے کے جسم میں پھر جان آگئی اور غزل خوانی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

حضرتؒ ایک بار مجھ سے خود فرمانے لگے کہ "کبھی ایک ہی خوبصورت لفظ سے شعر کا جادو چل جاتا ہے۔ جیسا اس مطلع میں گھونگر کا لفظ کام کر رہا ہے۔"

آئندہ مشاعرہ غیر طرح قرار پایا جس میں بعض حضرات نے اپنی اپنی دس پانچ غزلوں میں سے دو دو چار چار شعر چوٹی کے سنائے۔ اس پر شیخ احمد علی شوق قدوائی مرحوم بول اٹھے "یہ کیا طریقہ ہے کوئی غزل پوری پڑھیے تو سخنوری کا حال معلوم ہو یوں تو غزل میں دو چار شعر سبھی کے اچھے ہوتے ہیں"۔ حضرتؒ نے "دامن گلچیں" کی طرح میں جو غزل کہنا شروع کیا تھا اس میں سو شعر کے قریب کہے تھے اور اسی پچو غزلے میں سے اس مشاعرے میں منتخب غزل پڑھی تھی۔ چند شعر یہاں لکھے جاتے ہیں۔

یہاں آنکھوں میں دم ہے اب کوئی ساعت میں مرتے ہیں
قضا کہتی ہے جلدی کیا ہے آئینگے سنورتے ہیں

نکل جاتے ہیں وہ جس راہ سے بیچین کرتے ہیں
ہزاروں چٹکیاں لیتے ہیں جس کُلیں گزرتے ہیں

میں اس شوخی پہ صدقے ہوں کہ مجھ سے بزم میں پوچھا
یہ سب تو غش ہیں مجھپر آپ کہیئے کس پہ مرتے ہیں

ہماری جان تم ہو وہ ہماری جان کا دشمن
تمھارے دوست ہیں ہم اسلئے دشمن سے ڈرتے ہیں

میں کہتا ہوں تمھیں نے دل لیا میرا تو کہتے ہیں
کہ ہاں ہاں لے لیا اچھا کیا ہم کب مکرتے ہیں

کبھی مدنظر گر عاشقوں کا قتل ہو تم کو
ہمیں بھی یاد رکھنا ہم بھی تم کو پیار کرتے ہیں

مراخط بھیک کر قاصد کے منھ پر طنز سے بولے
خلاصہ سارے اس طومار کا یہ ہے کہ مرتے ہیں

یہ کسکی دید کا طالب ہو کس کے وصل کا خواہاں
یہ کس کی حسرتیں ہیں آپ جن کا خون کرتے ہیں

پسند آیا انھیں مجکو اسی کا شکر کیا کم ہے
کہ شکوہ لے کے بیٹھوں آپ دل لیکر مکرتے ہیں

کیا ہے نام کیا استاد کا روشن خدا رکھے
امیر استادزادوں پر ہم اپنے فخر کرتے ہیں

یوں تو خلد آشیاں کی داد و دہش اور انعام و اکرام جس کا شہرہ عرب و عجم میں تھا سبھی کی دستگیری اور کاربر آری کیا کرتا تھا مگر حضرتؒ کے ساتھ اس میں بھی ایک تخصیص رہتی تھی۔ فرماتے تھے کہ جب کچھ دینا منظور ہوتا کسی وقت تنہائی میں پوچھتے "کیوں منشی صاحب آج آپ کچھ پریشان سے نظر آتے ہیں" یہ عرض کرتے "حضور نہیں"۔ "بھلا کچھ کہیئے تو"۔ "حضور کوئی بات ہو تو عرض کردوں"۔ "اجی آپ تو مجھ سے تکلف کرتے ہیں"۔ یہ فرماکر بکس کھولتے اور دو ایک گڈیاں نوٹوں کی نکال کر سامنے رکھ دیتے۔ اب یہ ان کی قسمت تھی چاہے چار پانچ سو کے نوٹ نکلیں چاہے ہزار دو ہزار کے۔ دو چار مہینے کے بعد پھر کسی دن یوں ہی پوچھتے اور اُسی طرح دو ایک گڈیاں نوٹوں کی عنایت ہو جائیں۔ مچھی بھون میں ایک چھوٹا سا مکان جس کو سردخانہ کہتے تھے تمام ضروری سامان آسایش کے ساتھ حضرتؒ کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ ظہر کی نماز آپ وہیں پڑھتے اور خلد آشیاں جب تلاوت قرآن مجید کر لیتے تو بلا لیتے۔ اس وقت سے ۴ بجے تک صحبت تخلیہ رہتی اس کے بعد دربار ہوتا تھا۔

اخیر عمر میں خلد آشیاں کی طبیعت زیادہ ناساز رہنے لگی تو حضرتؒ کو ایشیائی طرز حکومت سے واقف اور امین و مزاج شناس پاکر اپنا رازدار اور پرائیویٹ سکرٹیری بھی

بنا لیا۔ رازداری کی مراسلت اور پرائیوٹ خط وکتابت میں نواب صاحب کی زبان تھی اور ان کا قلم۔ پہلے سہ پہر کو بھی ۲ بجے سے ۶ بجے شام تک سرکار میں حاضر رہتے تھے اب اس خدمت کی بدولت دن کی قید رہی نہ رات کی سفر ہو یا حضر جاڑے ہوں یا گرمی لو چلتی ہو یا مینہ برستا ہو ہر وقت کی حاضری۔ نواب اکثر اپنے بے نظیر باغ میں جاکر رہتے تو باغ ہی میں حضرتؒ کے لیئے بھی خیمہ نصب کرایا جاتا تھا۔ جب ضرورت ہوتی جس وقت کام پڑتا بلا لیتے۔ چند روز کے بعد نواب صاحب کو حضرتؒ پر اس قدر بھروسا اور اتنا اعتماد ہو گیا کہ ملکی امور میں بھی اپنا صلاح کار کر لیا۔ یہ بھی ایشیائی آداب ملحوظ رکھ کر جو بات ہوتی اس کی بھلائی برائی عرض کر دینے سے نہ چوکتے۔ لوگوں کی بھلائی کرنے اور کلمۂ خیر کہنے میں کبھی تامل نہ کرتے۔ نواب صاحب کی قدر دانی اور داد و دہش کا شہرہ دور دور تھا۔ مکی، مدنی، شیرازی، شوستری وغیرہ بھی اپنی اپنی حاجت لے کر اس سرکار میں آتے اور حضرتؒ کے وسیلے سے سب کی کاربرآری ہوتی رہتی تھی۔ نواب صاحب مردم شناس اور حق پسند تھے ان کی سنتے سمجھتے اور صلاح کی قدر کرتے تھے تو یہ کہتے بھی تھے۔ کیونکہ نواب اور رؤسا کی طرح خود پسند نہ تھے۔ اُن میں راج ہٹ نہ تھی۔

حضرتؒ اپنی خداداد قابلیت اور اوصاف حمیدہ سے اب نواب صاحب کو اس قدر عزیز ہو گئے تھے کہ یہ کبھی بیمار ہو جاتے تو ان سے صلاح اور مشورہ لے لینے کے خیال سے اکثر امور ملتوی رہتے۔ شب و روز میں تین تین چار چار بار چوبدار مزاج کا حال دریافت کرنے اور خیریت پوچھنے کو آتے تھے۔ فنا تو ایک دن سب کے لیے ہے امیر ہو یا غریب موت کس کو چھوڑا ہے۔ ۲۷ جمادی الآخرہ ۱۳۰۴ھ مطابق ۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء کو بروز چہارشنبہ خلد آشیاں نے اس دار ناپائدار سے رحلت فرمائی۔ اور حضرتؒ پر یہ بہت بڑی آفت آئی۔

ایسے آقا اور ایسے شاگرد کی دائمی جدائی کا صدمہ جس قدر ہو تھوڑا ہے کوئی دوسرا اس کا اندازہ کیا کر سکتا ہے۔ برسوں یہ حال دیکھا کہ جہاں خلد آشیاں کا نام زبان پر آجاتا آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے ؎ جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے ؛ اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے (امیرؔ) حضرتؒ نے جو تاریخ وفات کہی اس سے کچھ کچھ ان کے درد دل اور غم جاں گسل کا اندازہ ملتا ہے۔

الاماں از برق تازی ہائے چرخ چنبریں ‎ ‎ الحفیظ از فتنہ سازیہائے ایں آفت مکیں
جائے عبرت باشد ایں آشوبگاہ پر فتن ‎ ‎ چشم بکشا و دمے نیرنگ دنیا را ببیں
کآفتاب آسمان شوکت و جاہ و جلال ‎ ‎ ماہ چرخ دولت و اقبال و فیض و داد و دیں
فخر ارباب سلف سرمایۂ ناز خلف ‎ ‎ افتخار اولیں و اعتبار آخریں
حق پرست و حق پذیر و حق پژوہ و حق شنو ‎ ‎ حق شناس و حق پسند و حق گزار و حق گزیں
شاغل ذکر و نماز و عامل حج و زکات ‎ ‎ پیرو شرع حبیب خاص رب العالمیں
خوش مذاق و خوش بیان و خوش خصال و خوش جمال ‎ ‎ خوش خط و خوش گوے و خوش گفتار و خوش رو و حسیں
وارث بے وارثان و چارۂ بے چارگاں ‎ ‎ میہماں پرور مسافر دوست غمخوار حزیں
از در فیضش اعالی چوں ادانی بہرہ یاب ‎ ‎ اغنیا از خرمنش ہم چوں گدایاں خوشہ چیں
دوست و دشمن ہر دو منقاد و مطیع حکم او ‎ ‎ زانکہ را یاتش مظفر بود و آیاتش مبیں
پیش قدرش آسماں انداختے رفعت بخاک ‎ ‎ با وقارش کوہ تمکیں ساختے نذر زمیں
چوں نشستے بر سر تخت از پئے جود و نوال ‎ ‎ جم بدے بر آستان و یم بدے در آستیں
شیر دل کلب علی خان بہادر نامور ‎ ‎ مالک طبل و علم رونق دہ تاج و نگیں
آنکہ با یک کارواں از تابعان خویش گشت ‎ ‎ زائر بیت الحرام و روضۂ سلطان دیں

آنکہ اندر عہد او شد رام پور آرام پور | مصطفےٰ آباد شد در دور او ایں سرزمیں
در ہزار و دو صد و پنجاہ پیدا گشت و شد | در ہزار و دو صد و ہشتاد و یک مسند نشیں
در ہزار و سہ صد و چار از جمادی الآخرہ | بست و ہفتم چار شنبہ بود و ساعت چارمیں
ناگہاں زد کوس رحلت سوئے دار آخرت | ذوق دیں میداشت از دنیا برافشاند آستیں
چشم حق بینش نیفگندے نظر جز سوئے حق | حق چو او را مشتغل با خویشتن دید ایں چنیں
خواند در پیش خودش تا مورد رحمت کند | حق پرستی روح او را برد تا عرش بریں
تیرہ تر شد از فراقش روز روشن ہمچو شب | شد سیہ پوش از دو داغش ہر کہین و ہر مہیں
مہر و مہ بے نور گشت و جان و دل ہا بے سرور | آسماں شد پر غبار و خاک بر سر زد زمیں
رفتہ رفتہ تا حرم چوں رفت ازیں ماتم خبر | در حریم ہر دلے چوں محرمان غم شد مکیں
وائے قسمت ناز بردارم ز دنیا رفت و من | زندہ ام اندر صف ماتم ز سر تا پا غمیں
بد ترم از مردگاں امانمی میرم ازاں | رہ نمی یابد اجل سوئے من اندوہگیں
ہر نفس در سینہ از پژمردگیہائے دلم | میکشد تصویر حیرت چوں نگاہ واپسیں
عہد پیری راحت افزوں خواہد و راحت کجا | می کند راحت رساں آرام در زیر زمیں
تا بکے افسانۂ ایں درد نالیہا امیرؔ | تا کجا اظہار سوز دل بہ آہ آتشیں
دست زن در دامن رحمت بہ اخلاص و نیاز | تا دہد جائے بزرگش حق بفردوس بریں
در پے سال وفات آں شہ خلد آشیاں | محو دیدار جمال رحمۃ للعالمیں

نقش کن از خامۂ حسرت سر لوح مزار
خوابگاہ حامی اسلام امیر المومنیں

۱۳۰۴ھ

اسی سال ۲۹ جمادی الآخرہ (۲۵ مارچ ۱۸۸۹ء) کو تیس سال کی عمر میں نواب محمد مشتاق علی خاں بہادر عرش آشیاں مسند نشین ریاست ہوئے۔ حضرتؒ نے جشن مسند نشینی کے موقع پر قصیدہ پیش کیا۔ چند شعر اس کے یہاں لکھے جاتے ہیں :-

جب سے عالم میں ہے دور آسمان چنبری — کب ہوا مجھ سا کوئی سلطان ملک شاعری
نعمت دنیا سے کیا مطلب مزہ ہے شعر کا — جس طرح اہل ریاضت دشمن تن پروری
بے مشقت کب ہوئی حاصل مجھے مشق سخن — سینہ کاوی سے ملی مثل نگیں نام آوری
ناتواں ہر چند ہوں لیکن ہی ہے زور طبع — سست کب کرتی ہے چیتے کو کمر کی لاغری
حلقۂ اہل معانی میں ہے یوں میری جگہ — ہو نگیں جیسے میان حلقۂ انگشتری

آخر میں تاریخ کہی ہے ؎

جشن کی تاریخ اس مصرع سے ظاہر ہے امیرؔ — صاحب طبل و علم تاج و نگین سروری

۱۳۰۴ھ

عرش آشیاں کو شعر و سخن کا شوق نہ تھا۔ جنرل اعظم الدین خاں مرحوم نے جو مدار المہام تھے انگریزی طریق پر ریاست میں انتظامات شروع کر دیئے تھے۔ حضرتؒ شاد آب مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں " اب ان امور کا پتا کہاں۔ رام پور ہے اور ڈل پاس۔ مدار المہام بہادر ایک بڑے جفاکش اور مدبر و منتظم آدمی ہیں۔ اصول انتظامی کو انگریزی رنگ پر لاتے جاتے ہیں، بے خدمت بنظر استحقاق یا خصوصیت و پرورش کسی کو رکھنا یا تنخواہ دینا اصول انتظامی انگلشیہ کے مخالف ہے۔ میری تنخواہ میں بھی بلا سبب ماعہ۱۱۶ کی کمی ہوگئی۔ نواب مرزا خاں صاحب داغؔ سے کارخانۂ اصطبل پہلے نکل گیا تھا۔ فراش خانے کی موجودات وہ خود سمجھا کر مستعفی ہوئے۔ استعفا نامنظور، اور رخصت دو ماہ کی منظور ہوئی۔ کئی روز ہوئے کہ

وہ بھی چلے گئے۔ احتمال آنے کا ضعیف ہے"۔ (خطوط منشی امیر احمد)۔

خلد آشیاں کے بعد مالی مشکلات بہت بڑھ گئی تھیں۔ شاد آب مرحوم نے حال پوچھا ہے اُن کو لکھتے ہیں "آقا اور محسن شفیق اور عزیز، دوست اور قدر افزا، شاگرد و ہنر شناس (خلد آشیاں) دنیا سے اٹھ گیا۔ ایک تو اس کی مفارقت دائمی کا غم اس پر طرہ افکار و تشویش کی زیادتی اس سے قیاس کر لیجئے۔ میرے ساتھ خاص جوان کا برتاؤ تھا وہ سوا میرے اور اُن کے کسی کو معلوم نہ تھا۔ دو سو سولہا (۲۱۶) روپے ماہوار تو وہ مجکو تنخواہ دیا کرتے تھے اور ہر سال چار پانچ ہزار روپیہ دے دیتے تھے اور اس طرح دیتے تھے کہ وہ جانتے تھے اور میں اور خدا بس اور کسی کو خبر نہ ہوتی تھی۔

فصیح الملک مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں "آپ کی پریشانی اور حیرانی سے جو قلق ہے اس کو دل ہی جانتا ہے میں بھی اس حالت میں ہوں کہ خدا رحم فرمائے تو بیڑا پار ہو پانچ سو (۵۰۰) روپے ماہوار کا خرچ اور دو سو (۲۰۰) کی آمدنی ہے (اس کے بعد سو (۱۰۰) ہی روپے رہ گئے تھے)۔ رحلت خلد آشیاں سے اب تک تین ہزار روپے کے مصارف آمدنی سے علاوہ بڑھ چکے ہیں۔ اپنی بساط کیا تھی انھیں سات مہینے میں حیثیت بھی مٹ گئی قرضداری بھی بڑھ گئی۔ خدا ہی سبکدوشی کا سامان کرے۔ افسوس ہم سب مسافروں کو کیا بے محل شام ہوئی ہے۔

غالباً ۱۸۹۹ء میں بحصول رخصت میں وطن گیا اور حضرتؒ کی قدمبوسی کے لیئے رام پور پہنچا۔ اس وقت پرانی کھنڈسار میں قیام تھا۔ کیونکہ سرکاری مکانات جو پہلے رہنے کو ملے تھے وہ قلعے میں آ گئے تھے اور سرکار سے پرانی کھنڈسار رہنے کو عطا ہوئی تھی یہی جگہ احاطۂ مینائیاں ہوئی۔ کچھ مختصر معمولی مکانات تھے اور بیچ میں ایک چھوٹا دولپیا سایبان جس میں دفتر امیر اللغات تھا۔ اپنے آقائے نامدار موجودہ نواب صاحب بالقابہ کی

مالی امداد سے حضرتؒ تالیف امیر اللغات میں مصروف تھے۔ تائے فوقانی کے لغات لکھے جاتے تھے۔ وہ زمانہ زیادہ مالی پریشانی کا میں نے دیکھا۔ مکان میں آگ لگ جانے سے اسباب کے ساتھ غیر مطبوعہ کلام اور کتابیں جل کر خاک سیاہ ہو گئی تھیں۔ افسوس اور قلق سے حضرتؒ کا دل مٹی ہو رہا تھا۔

۱۸۸۵ء میں سر آلفرڈ لایل صاحب بہادر نے، جو اُس زمانے میں ممالک مغربی وشمالی کے لفٹنٹ گورنر اور اودھ کے چیف کمشنر تھے، خلد آشیاں سے فرمائش کی تھی کہ اردو کا ایک مبسوط اور جامع لغت تالیف کرائیے۔ نواب صاحب نے اس تالیف کیلئے حضرتؒ ہی سے ارشاد فرمایا (اس انتخاب سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ہم عصروں میں امیر کا مرتبہ کس قدر بلند تھا) حضرتؒ کے سینے اور سفینے میں اس وقت تک جو کچھ تھا اُس سے آنکھ کے لفظ کے تقریباً ساڑھے چار سو محاورات وغیرہ مرتب کر کے لغت کا نمونہ پیش کیا اور وہ جنرل اعظم الدین خاں مغفور (اس وقت سفیر ریاست تھے) کی معرفت سر آلفرڈ لایل کی خدمت میں بھیجا گیا۔ صاحب ممدوح نے نمونے کو بہت پسند فرمایا، اس کی تالیف سے متعلق ہدایتیں کیں، امداد کا وعدہ کیا اور یہ بھی فرمایا کہ اور صوبوں کی گورنمنٹوں سے اعانت کرائیں گے اور وائسرائے بہادر کو اس تالیف کا مربی بنائیں گے۔ ۱۸۸۶ء میں ملک کی رائے لینے کی غرض سے وہ نمونہ چھپوایا گیا مگر افسوس کہ اس کے بعد ہی اِدھر خلد آشیاں رحلت فرما گئے اُدھر سر آلفرڈ لایل نے ہندوستان کو خیر باد کہی۔ جب انتقال خلد آشیاں کا صدمہ کچھ کم ہوا تو شوق نے پھر تقاضا کیا۔ ہمت نے کمر بندھوائی اور ۱۸۸۸ء میں مُلک کے خیالات دریافت کرنے کو حضرتؒ نے لکھنؤ بنارس[۱] ہوتے ہوئے پٹنے تک سفر کیا۔ اس

لطیفہ:۔ بنارس میں اپنے عزیز حافظ سید الطاف حسین مرحوم کے مکان پر قیام فرمایا تھا۔ مرحوم کے بھائی سید

سفر میں حضرت ریاضؔ وغیرہ دو چار شاگرد بھی ہمراہ تھے۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ لکھنؤ میں اپنے قدیم دوست میر علی حسن رمّالؔ سے میں نے سوال کیا کہ تالیف لغت کی ضرورت سے میں نے یہ سفر اختیار کیا ہے ذرا بتاؤ تو اس کام کے لیئے کہاں سے مدد ہوگی۔ کہا "جہاں سے آئے ہو وہیں سے امداد ہوگی" میں نے کہا "اب تو تم کچھ سٹھیا سے گئے ہو بھلا وہاں سے امداد کی امید ہوتی تو میں گھر سے کیوں نکلتا۔ ذرا غور کر کے حکم لگاؤ"۔ کہا "میں تو پھر یہی کہتا ہوں کہ وہیں سے امداد ہوگی"۔

اردو کے قدردانوں اور لغت اردو کی ضرورت سے باخبر اصحاب نے جن سے بات چیت ہوئی اپنی تمنا کے اظہار سے اس تالیف کی تشویق دلائی۔ مگر مالی امداد کی کہیں سے کوئی صورت نظر نہ آئی۔ آخر میر صاحب نے جو حکم لگایا تھا وہ صحیح نکلا اور سفر سے واپسی پر عرش آشیاں نے بہ اجلاس کونسل اس کام کے لیے یوں دستگیری فرمائی کہ دو قسطوں میں سولھا ہزار روپے لغت کی تالیف کے لیے ریاست سے قرض دیئے جائیں اور چھپنے کے بعد کتاب کی قیمت سے رفتہ رفتہ یہ قرض منشی صاحبؒ ادا کریں۔ اس طرح دفتر قائم ہو کر امیر اللغات کی تالیف شروع ہوئی۔ اصول تالیف میں ملک کے نامور قابل اصحاب سے رائے لی گئی۔ اور ایک کمیٹی قائم ہوئی جس کے ممبر مولوی حفیظ اللہ صاحب مدرسہ عالیہ عربی کے پروفیسر۔ مولوی فصیح الزماں خاں صاحب فصیحؔ۔ منشی عبدالرحمٰن صاحب تسبلؔ منشی محمد احمد صاحب صریرؔ حکیم نعیم الزماں خاں صاحب نعیمؔ۔ حافظ محمود علی صاحب فداؔ تھے اور حضرتؒ صدر۔

(بقیہ حاشیہ صـ۱۱۲) افتخار حسین بی لے (سابق رجسٹرار عدالت جوڈیشل کمشنر اودھ وحال جج چیف کورٹ جے پور) نے جوانی میں بنارس کالج میں پڑھتے تھے مجھ سے بیان کیا کہ حضرت ریاضؔ کا ایک شعر کسی نے پڑھا۔ منشی صاحب نے جو ہم لوگوں سے کچھ دور بیٹھے تھے شعر سن کر فرمایا کہ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ ایسے شعر کہوں مگر اب اپنے بڑھاپے پر زیب دیتے نہیں معلوم ہوتے۔

تجویز یہ قرار پائی تھی کہ دن میں جس قدر لغت تالیف ہو شب کو اُسے کمیٹی سن لیا کرے۔ دو مہینے تک روزانہ شب کو یہ کمیٹی اپنا کام کرتی رہی مگر بحث و مباحثہ ہی رہا نتیجہ یہ نکلا کہ "آ" کا لفظ بھی ختم نہ ہوا۔ آخر کار یہ رائے قرار پائی کہ مولف اپنے ہی اجتہاد سے کام لے تب جا کے کام چل نکلا۔ حضرت رح مع ارباب دفتر ہمہ تن لغت کی تالیف میں مصروف رہتے تھے اس کے سوا دفتر میں کوئی دوسرا چرچا[1] پسند نہ فرماتے تھے۔ آخر ۱۸۹۱ء میں پہلا حصہ اور ۱۸۹۲ء میں دوسرا حصہ مرتب ہو کر طبع ہوا۔ تیسرا حصہ (بائے عربی کے لغات کا) میری موجودگی ہی میں مرتب ہو چکا تھا لیکن اس کے بعد کوئی اور حصہ چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ افسوس ہے کہ ایسا مبسوط اور جامع لغت کسی طرح تکمیل کو نہ پہنچ سکا جو اپنی نظیر آپ ہے۔ اس لغت کی تعریف اور اس پر مفصل تبصرہ ملک کے مجھ سے کہیں زیادہ قابل و اہل حضرات مثلاً ملک و قوم کے سب سے بڑے خیر خواہ سر سید احمد خاں مرحوم اور اکبر الہ آبادی مغفور وغیرہ کر چکے ہیں اور وہ سب دوسرے حصے کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں اس لیے میرا کچھ لکھنا عبث معلوم ہوتا ہے۔

نواب خلد آشیاں کی رحلت سے حضرت رح کے دل پر جو کاری زخم لگا تھا ابھی وہ اچھی طرح مندمل بھی نہ ہونے پایا تھا کہ پھر آلا ہو گیا۔ دو ہی سال کے اندر حضرت رح کو اپنے جوان آقا نواب عرش آشیاں کی مفارقت دائمی[2] کا داغ اٹھانا پڑا جس سے اُن کا دل اور چور ہو گیا اس حسرت و یاس کے عالم میں یہ قطعۂ تاریخ کہا جس سے دنیا کی بے ثباتی اور اُن کے رنج و غم کی تصویر کھنچ گئی ہے (جنرل صاحب کی فرمائش یہ ہوئی تھی کہ مصرع تاریخ ایسا ہو

[1] مجھے ایک ناول لکھنے کا شوق ہوا کبھی کبھی رات کو کچھ لکھتا تھا۔ ایک دن اتفاق سے حضرت رح کی نظر پڑ گئی کہنے لگے "بیٹا تم تو لغت کو ناول بنا دو"

[2] ۲۴ جمادی الآخرہ ۱۳۰۶ھ مطابق ۲۵ فروری ۱۸۸۹ء بروز دوشنبہ عرش آشیاں نے رحلت فرمائی۔

(جو لوح مزار پر کندہ کرایا جائے)

دنیا ہے عجب مقام عبرت | یہ حسرت و یاس کا مکاں ہے
اس گھر میں کہاں ثبات کو دخل | اس گھر میں جو ہے وہ میہماں ہے
اس گھر میں ہے ایک شب بسیرا | آیا ہے جو آج کل رواں ہے
دروازے ہیں حسرتوں کی بیٹھک | دیواروں سے بیکسی عیاں ہے
ہو اہل زمیں کو خاک راحت | گردش میں ہمیشہ آسماں ہے
فانی ہے یہاں کا عیش و آرام | ہے آج بہار کل خزاں ہے
دیکھو کہ جمادی الآخرہ کی | چوبیسویں کی یہ داستاں ہے
نواب وہ جن کا نام نامی | مشتاق علی کے ساتھ خاں ہے
رحلت فرما ہوئے جہاں سے | بسمل اس غم سے اک جہاں ہے
ہے رنگ جو آسماں کا نیلا | آہوں کا گھٹا ہوا دھواں ہے
مانند زمیں ہے خاک برسر | اس درجہ مکدر آسماں ہے
ہے ماتمیوں کا دود دل وہ | جس پر کہ سحاب کا گماں ہے
بتیس برس کی عمر پائی | مرجانے کی عمر یہ کہاں ہے
انصاف و سخا و خلق سب کا | شاہد ہر پیر و ہر جواں ہے
احساں جو کئے ہیں حد سے باہر | باہر امکان سے بیاں ہے
جاتا ہے سلوک رائگاں کب | اب ساتھ وہ جوہ د اتناں ہے
صبر آئے امیر دل کو کیونکر | یہ ماتم مرگ نوجواں ہے
اس غم میں چلا میں سوئے صحرا | جو خاص مقام وحشیاں ہے

ہر دم تھا یہی مری زباں پر — آقا مرے ہائے تو کہاں ہے
عبرت ہوئی راہبر اُدھر کو — حسرت کا خاص جو مکاں ہے
دکھلا کے بہت سی کہنہ قبریں — بولی یہ نشان رفتگاں ہے
ہیں ملک عدم کے سب مسافر — ہے پیر کوئی کوئی جواں ہے
شیخ ان میں ہے کوئی کوئی سید — کوئی ہے مغل تو کوئی خاں ہے
دارا و سکندر و فریدوں — سب مر مٹوں کا یہی نشاں ہے
پوچھا ان سے کہاں وہ شان و شوکت — پوچھا ان سے کہاں وہ عز و شاں ہے
پوچھا ان سے کہاں ہے وہ چھپر کھٹ — پوچھا ان سے کہاں وہ سائباں ہے
کیوں دھوپ میں خاک پر پڑے ہیں — ہے چتر نہ تخت کا نشاں ہے
یہ دیکھ کے چیخ اٹھا میں بیتاب — ہے ہے یہ عدم کا کارواں ہے
پھرتا تھا اِدھر اُدھر تڑپتا — کہتا ہوا ہائے وہ کہاں ہے
میں جس کی تلاش میں ہوں برباد — جس کے لیے دل مرا تپاں ہے
آیا نظر اک زمیں کا تختہ — سمجھا میں کہ تختۂ جناں ہے
فردوس کے پھول ہیں سر قبر — ابر رحمت کا سائباں ہے
دولھا سا بنا ہے کوئی لیٹا — تربت پہ پر سیج کا گماں ہے
دوڑا اپنے فاتحہ سو قبر — سمجھا کہ یہی وہ آستاں ہے

آئی یہ ندا ادب سے آنا
یہ مرقد عرش آشیاں ہے

۱۳۰۶ھ

عرش آشیاں کے انتقال پر ملال کے بعد عالی جناب معلےٰ القاب نواب سید محمد حامد علی خاں بہادر دام ملکہم و اقبالہم ۲۶، جمادی الآخرہ سنہ ۱۳۰۶ھ (۲۰، فروری سنہ ۱۸۸۹ء کو) مسند آرا ہوئے۔ حضرتؒ نے حسب ذیل قطعہ تاریخ کہا اور پیش کیا ؎

بارک اللہ جلوہ گر شد بر سریر سروری　　نامور حامد علی خاں سروری را مستحق
آنکہ باشد حق پرست و حق پسند و حق پژوہ　　آنکہ باشد حق شناسی قدر یاں را احق
فیض باشد از کتاب خُلق او یک صفحۂ　　خلق از مجموعۂ اوصافِ ذاتش یک ورق
ابر جودش گر نبارد بر سر کشت امل　　تخم ہر امید را باشد چو گندم سینہ شق
غازہ مالد در طرب گاہش فلک بر روئے خویش　　مردم از ناآگہی خوانندش از نام شفق
گر پر پروانہ را سوزد شبے در بزم او　　داغ گردد شمع و سر تا پا شود غرق عرق
پیش دست ہمتش آساں شود ہر مشکلے　　ناخن فکرش کند حل ہر معمائے ادق
در میان گز رہائے گاؤ سر خصمش بود　　صورت لامیکہ باشد در دو ایں تا قلق
ملک و دولت یافت از تا زنگاہ لطف او　　رشتۂ شیرازہ بہر دفتر نظم و نسق

سال ہجری و مسیحی زد رقم کلکِ امیر
گوہر تاج ریاست۔ ابر رحمت ظلِ حق

۱۳۰۶ھ　　۱۸۸۹ء

اس کے علاوہ ایک قصیدہ بھی تہنیت میں لکھا جس کی تشبیب میں معرکہ بہار و خزاں[1] ہے اور جس کا مطلع یہ ہے ؎

سلطان شرق نے جو بصد عز و افتخار　　برج حمل کو آکے کیا تخت زرنگار

---

[1] تشبیب دوسرے حصے میں ملاحظہ ہو۔

چونکہ عمر شریف (انگریزی قواعد جہاں بانی کی رو سے) کم تھی اس لیے نینی تال میں عربی فارسی اور انگریزی وغیرہ میں ایک انگریز گورنر کی زیر نگرانی آپ کی تعلیم ہوتی رہی۔ عید میں یا اور کسی تقریب سے حضور رام پور تشریف لاتے تھے۔ ریاست میں انتظامی کونسل قائم تھی۔ تجربے اور حالات زمانہ سے واقف ہونے کے لیے دنیا کے مختلف ملکوں کی حضور پرنور کو سیر کرائی گئی۔ اس سفر وسیلۃ الظفر سے ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۴ء) میں آپ اپنی ریاست میں واپس تشریف لائے تو نزول اجلال سے ہر ادنیٰ و اعلیٰ باغ باغ ہو گیا۔ شعرا نے قطعات تاریخ لکھکر پیش کئے۔ حضرتؒ نے بھی ایک قصیدہ اور چند قطعات تاریخ نذر گزرانے یہاں صرف قصیدے کے چند شعر لکھے جاتے ہیں جس میں مصرع تاریخ بھی ہے۔

کس کی آمد ہے بہار روح پرور کیطرح — فرش ہیں آنکھیں جو نرگس کی مشجر کی طرح
کس کی آمد ہے کہ ہر موج نسیم رام پور — مشک بیزی کرتی ہے زلف معنبر کی طرح
کس کی آمد ہے کہ اڑ کر ذرہ ہائے خاک ہند — تل بنے رخسارۂ گردوں کے اختر کی طرح
کس کی آمد کا یہ مشتاقوں میں چرچا ہے کہ آج — بات بھی کانوں میں پڑتی ہو تو گوہر کیطرح
اسکی آمد ہے کہ جو اٹھا تھا دورے کیلئے — نور برساتا ہوا خورشید خاور کی طرح
اس کی آمد ہے کہ جس کا سایۂ بخت بلند — خلق پر چھایا ہوا ہے چرخ اخضر کی طرح
اس کی آمد ہے کہ جس کے ابر فیض مدح سے — جوشن زن طبع سخنور ہے سمندر کی طرح
کون وہ حامد علی خان بہادر نامور — وا تھی چشم منتظر جس کے لیے در کی طرح
جس کے جھنڈے کے پھریرے اڑتے ہیں ملک میں — جسکے سکے بیٹھے ہیں خاقان و قیصر کیطرح
جسکی تاب حسن سے ہر ہفت ہفت اقلیم ہے — جسکی خاک پا حسین ملتے ہیں پوڈر کیطرح
آفریں اس حوصلے پر مرحبا اس عزم پر — کیسی کیسی منزلیں کیں قطع خنجر کی طرح

دہنے بائیں شوکت و اجلال ہمراہ رکاب | آگے آگے دولت و اقبال رہبر کی طرح
کیسے کیسے اونچے اونچے بادشاہوں سے ملے | شان و شوکت میں بڑھے اپنے مقدر کی طرح
اللہ اللہ میہماں جس بزم دعوت میں ہوئے | دور میں آنکھیں رہیں پریوں کی ساغر کی طرح

اس اولوالعزمی کی میں نے یہ کہی تاریخ امیرؔ
بارک اللہ سیر عالم کی سکندر کی طرح

۱۳۱۱ھ

کونسل کے انتظام میں ۲۶ فروری ۱۸۹۴ء (۱۳۱۱ھ) کو نواب صاحب جاورہ کی صاحبزادی کے ساتھ حضور پرنور کی شادی ہوئی۔ اس مسرت بار تقریب کی خوشی میں حضرتؒ نے کئی سہرے کہے۔ زیادہ تر سہرے محلات کی فرمائش کے موافق سیدھے سیدھے ارباب نشاط کے گانے کے قابل کہے تھے۔ ایک سہرے کے چند شعر یہ ہیں :۔

نہ ہو کس طرح محو دیدار سہرا | کہ نوشہ ہے یوسف خریدار سہرا
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن ہیں | دلھن کا نہ ہو کیوں طلب گار سہرا
یہ ہر رنگ کی دون اللہ رکھے | طرحدار نوشہ طرحدار سہرا
جوانی کے نشئے سے ہے چور نوشہ | چلے کیوں نہ مستوں کی رفتار سہرا
یہ کیوں ٹوٹے پڑتے ہیں تارے یہاں تو | نزاکت سے پھولوں کا ہے بار سہرا
چھپائے ہے منھ کو جھکائے ہے سر کو | حیادار نوشہ حیادار سہرا

مبارک امیرؔ اس کو نوشاہ بننا
دلھن ہو ہمایوں سزاوار سہرا

یہ سب کچھ ہوا لیکن ؎ گو کہ دیکھے خواب اچھے سب نے تعبیریں کہیں ٭ وصل کی منتی ہیں

ان باتوں سے تدبیریں کہیں (آمیر)۔ مالی مشکلات چین نہ لینے دیتے تھے اور چین آتا کیونکر جس کے گھر کا خرچ کفایت شعاری پر بھی چار پانچ سو روپے ماہوار ہو اور آمدنی صرف ~~سو~~ ۱۰۰ سو روپے (تنخواہ کے) وہ کس طرح اپنی بسر کرے۔

سنا ہے کہ حیدر آباد فرخندہ بنیاد میں میز مبارک کے خانساماں محمد ابراہیم مرحوم بہت اچھے آدمی تھے اور امکان بھر لوگوں کی بھلائی سے دریغ نہ کرتے تھے۔ داغ مرحوم کا بھی پہلے وہی وسیلہ ہوئے تھے۔ اُن کے خطوط سے بھی جو حضرتؒ کے نام آتے تھے اُن کے اس قسم کے صفات حمیدہ کا پتا چلتا تھا۔ خانساماں مرحوم کے شاید بھتیجے بھی حضرتؒ کے شاگرد تھے اُن کے اشتیاق نے بھی خانساماں مرحوم کو ابھارا اور خط وکتابت شروع ہوئی۔ اُن کے لکھنے پر حضرتؒ نے اپنا مطبوعہ کلام بھیج دیا۔ وہ حضور میں پیش ہوا اور پسند بھی آیا۔ احباب و تلامذہ نے حیدر آباد آنے کا تقاضا شروع کیا۔ میں نے بھی عرض کی کہ چلنا چاہیئے۔ فرمایا "بیٹا مجھ سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ناخواندہ مہمان بنوں وہاں جا کر دھونی دوں اور برسوں امیدواری کی کڑیاں جھیلوں۔ ہاں خود حضور کا اشارہ پاؤں تو سر آنکھوں سے جاؤں۔ (جاتے کیونکر ابھی موت کو بہت دن باقی تھے!) اور امیر اللغات کی تالیف کے لیے کافی سرمایہ منظور کرا کے واپس آؤں"۔

ایک بار خانساماں مرحوم نے لکھا "حضور پر نور کی زبان مبارک سے یہ مصرع نکلا ہے یہ چوٹی کس لیے پیچھے پڑی ہے۔ جناب داغ نے غزل کہی ہے۔ آپ بھی کہیئے"۔ مگر اُس وقت حضرتؒ نے کچھ خیال نہ فرمایا۔ میرے اور حافظ جلیل حسن صاحب (جلیل القدر نواب فصاحت جنگ) کے دل میں دلولہ پیدا ہوا اور غزل کہی۔ چند ہی روز کے بعد نواب فصیح الملک مرحوم کا خط آیا تو اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ حضور کے مصرع پر غزل تو

ضرور کہی ہوگی مگر ہم کو دیکھنے کو کاہے کو ملے گی وہ تو گنجی کی طرح سرکار ہی میں پہنچے گی۔ خط کے ساتھ اپنی غزل بھی بھیجی تھی۔ حضرتؒ نے جواب میں لکھا کہ "میں نے تو اب تک غزل کہی نہیں ورنہ ضرور آپ کو بھیجتا۔ جلیل و آہ نے البتہ غزل کہی ہے۔ دونوں کی غزلیں آپ کے ملاحظے کو بھیجی جاتی ہیں"۔ اُن کی رسید میں جو خط آیا اس میں فصیح الملک مرحوم نے لکھا "جلیل و آہ کی غزلیں دیکھیں۔ کیوں نہ ہو آخر کس کے شاگرد ہیں! مگر ایک بات کی کسر ہے جو عند الملاقات بتائی جا سکتی ہے۔ نسیم (تلمیذ داغ مرحوم) نے ایک غزل حال میں کہی ہے وہ میں آپ کے ملاحظے کو بھیجتا ہوں" (شعر تو کوئی یاد نہیں مگر غزل اس زمین میں تھی۔ جان بڑی مشکل ہے۔ ایمان بڑی مشکل ہے۔ معلوم نہیں اس سے مرحوم کا مقصد کیا تھا) اس کے بعد حضرتؒ نے بھی اس زمین میں شعر کہے۔ اور خانساماں مرحوم کے ذریعے حضور نظام اور نواب فصیح الملک مرحوم دونوں کی خدمت میں وہ دو غزلہ بھیجا۔ وہ غزلیں بھی حضور پر نور کے ملاحظے سے گزریں اُس وقت سے حضرتؒ کی طرف زیادہ رجحان خاطر ہوا اور شعر و سخن کا چرچا جب ہوتا تو حضرتؒ کو ضرور یاد فرماتے۔

دونوں استادوں کے دو غزلے یہ ہیں۔

داغ	امیر
نظر کعبے میں اس بت پر پڑی ہے	جب آنکھ اُس شاہ خوباں پر پڑی ہے
کہاں جا کر مری قسمت لڑی ہے	نگہ تقدیر بن بن کر لڑی ہے
غزل اک اور بھی اے داغ لکھو	غضب کی پھوٹ الفت میں پڑی ہے
طبیعت اس زمین میں کچھ لڑی ہے	ملا ہے دل جو آنکھ اس سے لڑی ہے
	شب وصل آنکھ جب مجھ پر پڑی ہے

امیرؔ

تو کیا کیا شرم شوخی سے لڑی ہے
نظر جس دن سے اُس رُخ پر پڑی ہے

کرن سورج کی اشکوں کی لڑی ہے
لیا ہے بوسۂ قاتل لپٹ کر
لڑادی جان تب قسمت لڑی ہے

لہو میں تر ہے کیوں اے چشم خونبار
بتا تو آج تو کس سے لڑی ہے

لب جاناں پہ مسی کی دھڑی ہے
تو سوسن کس لیے پھولی کھڑی ہے

شب غم مجھ سے بیٹھا جائے کیونکر
تری تصویر تو آگے کھڑی ہے

نگاہ ناز ہوتی ہے برآمد
سلامی کو صف مژگاں کھڑی ہے

وہ بیٹھے ہیں مگر تیوری چڑھائے
مسیحا پاس اجل سر پر کھڑی ہے

نکل سکتی نہیں حسرت شب وصل
کہ وہ چتون چھری کھینچے کھڑی ہے

داغؔ

قیامت[۱] میں قیامت کر گیا کون
کہ دل تھامے صف محشر کھڑی ہے

ترے در پر تڑپتے کس کو دیکھا
کہ ہر دیوار سکتے میں کھڑی ہے

جنازہ دیکھ لو عاشق کا در پر
سواری اس مسافر کی کھڑی ہے

۱؎ سبحان اللہ قیامت کر دی ہے۔

امیرؔ

نہیں پلکوں کی اوجھل میں وہ پُتلی
دلھن چلمن میں شرمائی کھڑی ہے

پہنتے ہیں وہ بیٹھے گھر میں چھاگل
قیامت در پہ گھبرائی کھڑی ہے

نہ توڑو نرگس بیمار کی آس
عصا ٹیکے ہوئے کب سے کھڑی ہے

مسی پر چھوٹ افشاں کی پڑی ہے
کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے

قضا ہی نے تڑپ دیکھی تھی میری
اسی نے جا کے قاتل سے جڑی ہے

مرے گھر ہجر کے دن دھوپ یارب
جمی ہے یا گڑی ہے یا جڑی ہے

ہنسے ہیں جب دہان زخم بسمل
تو اک تلوار اور اُس نے جڑی ہے

نظر کس چشم فتاں سے لڑی ہے
کہ آنکھوں کو لئے نرگس پڑی ہے

زمانے بھر کی آنکھ اس سے لڑی ہے
جدھر دیکھو یہی آفت پڑی ہے

داغؔ

بنا ہے مدعی بینا مسر بھی
جڑی ہے جب مری کھوٹی جڑی ہے

نگاہ شوخ جب اس سے لڑی ہے
تو بجلی تھرتھرا کر گر پڑی ہے

وہاں مشق تغافل ہر گھڑی ہے
پرائے دل کی اُن کو کیا پڑی ہے

امیرؔ

پھبی کیوں ہے جو پسلی سے لڑی ہے
یہ چوٹی[1] کس لئے پیچھے پڑی ہے

کلی کو باغ میں چھیڑا ہے کس نے
صبا یہ منہ لپیٹے کیوں پڑی ہے

ادا گاہک قضا گاہک کدھر جائے
عجب جھگڑے میں جان اپنی پڑی ہے

ملا کر خاک میں آئے ہو کس کو
یہ کیسی گرد دامن پر پڑی ہے

ہوا ہے کس بلاکش سے وہ برہم
کہ زلف یار قدموں پر پڑی ہے

اجل آئی ہے نذر اس کی کریں کیا
ہماری جان تو تم میں پڑی ہے

اُدھر عکس اور اِدھر تنتا ہے وہ شوخ
یہ دو بانکوں میں کیا بحث آ پڑی ہے

گرہ بند قبا کی کھل رہے گی
وہ کھولو جو گرہ دل میں پڑی ہے

مری میت کو ٹھکرا کر وہ بولے
کہاں کی نیند تم کو پھٹ پڑی ہے

داغؔ

کریں کیا رند توبہ مے سے واعظ
کہ یہ تو اُن کی گھٹی میں پڑی ہے

عدو بھی تنگ ہے اُن کے ستم سے
اُسے اپنی مجھے اپنی پڑی ہے

وہ روٹھیں غیر سے تو ہم منائیں
پرائی آفت اپنے سر پڑی ہے

بگڑ کر ہم نے سو الزام پائے
اب ان کی ہر طرح سے بن پڑی ہے

پرائے مال پر اتنا تقاضا
تمھیں دل دینگے کیا جلدی پڑی ہے

نہ میٹھی تیغ عشق اس سنگدل پر
اچٹ کر چوٹ مجھ پر ہی پڑی ہے

حسینوں کو بُرا کہتا ہے ناصح
انھیں باتوں پہ مجھ سے ہو پڑی ہے

خدا سے التجا ہے ناخدا کیا
مری کشتی بھنور میں جا پڑی ہے

ہمارا دم ہے خنجر میں دم ذبح
ہماری جان قاتل میں پڑی ہے

[1] مصرع حضور نظام طاب ثراہ

امیرؔ

لپٹ کر سوتی ہے روز اُس سے چوٹی
یہ میری جان کے پیچھے پڑی ہے

ادا قاتل ہے الزام اس کے سر پر
قضا کیا مفت میں ماری پڑی ہے

امیرؔ اتنا نہ چھیڑ اس کو سر شام
کہ شب بھر پیار کرنے کو پڑی ہے

پہنچتی ہے یہ گردن ہی تک اسکی
صراحی دختِ رز سے کچھ بڑی ہے

خدا اس زلف و کاکل سے بچائے
بلائے جاں ہے جو چھوٹی بڑی ہے

شبِ غم کیسی ہی چھوٹی ہو واعظ
مگر تیری قیامت سے بڑی ہے

فلک کو پھونکتی ہے آہ دل کی
ذرا سی شمع لو اتنی بڑی ہے

زباں دی بھر وصل اور خود ہی بولے
میں سچ کہتا ہوں یہ جھوٹی بڑی ہے

خضر بھی عمر میں دنیا سے ہیں کم
یہ بڑھیا ساری دنیا سے بڑی ہے

داغؔ

اُسے بھی مجھکو بھی ضد آ پڑی ہے
خرابی بیچ والوں کی بڑی ہے

ابھی میں نے کیا تھا یاد اس کو
وہ آیا عمر قاصد کی بڑی ہے

تجھے دیتا ہوں اپنی جان بھی میں
مرے دل سے مری ہمت بڑی ہے

مروت بھی ہو تیری آنکھ میں کاش
نشیلی ہے رسیلی ہے بڑی ہے

جفائے آسماں کی انتہا ہے
بڑوں کی بات جو چھوٹے بڑی ہے

امانت رکھ تو لوں داغِ محبت
مگر ڈرتا ہوں یہ جوکھوں بڑی ہے

امیرؔ

نکیلی بھی سجیلی بھی ہے وہ آنکھ
مگر دیکھا تو شرمیلی بڑی ہے

بہت جلدی نہ کر قاتل دم ذبح
یہی تو حاصل عمر اک گھڑی ہے

نہیں رکتی چلی جاتی ہے دن رات
مری عمر رواں بھی اک گھڑی ہے

نہیں کھلتی گرہ بند قبا کی
یہ ظالم اس کے دل سے بھی کڑی ہے

مژہ اس کی نگہ سے بھی ہے کٹر
چھری خنجر سے بھی منہ کی کڑی ہے

پہنچتے ہیں سب اس منزل پہ مرکر
عدم کی راہ بھی کتنی کڑی ہے

تمہارے لب ہیں باغ حسن کے پھول
تبسم اُن کی نازک پنکھڑی ہے

گرے ہیں جو لگن میں شمع سے پھول
پر پروانہ اُن کی پنکھڑی ہے

داغؔ

ملازم شاہ آصف جاہ کے ہیں
جناب داغؔ کی قسمت بڑی ہے

مجھے انجام الفت کی پڑی ہے
یہ غم آٹھوں پہر چونسٹھ گھڑی ہے

الٰہی کب سحر ہوگی شب ہجر
قیامت کی گھڑی ہے جو گھڑی ہے

ادھر وحشت لیئے جاتی ہے مجکو
اُدھر حداد نے بیڑی گھڑی ہے

وہی اک بات ہے لیکن تری بات
عدو سے نرم ہے مجھ سے کڑی ہے

لہو کی بوند مژگاں سے جھڑی ہے
یہی گلزار دل کی پنکھڑی ہے

امیرؔ

نگاہ مست ساقی نے دکھا کر
کہا لو پھول کی جا پہ نکھڑی ہے

نکلتے ہی نہیں مسجد سے واعظ
خدا کے گھر میں نال ان کی گڑی ہے

نگہ جائے کہاں سینے سے اٹھ کر
یہیں تو حسن کی دولت گڑی ہے

ابھاران جو بنوں کا کہہ رہا ہے
جوانی خود نمائی پر اڑی ہے

امیر اپنی نظر میں قصر شاہی
فقیروں کی سی ٹوٹی جھوپڑی ہے

داغؔ

قدم جمتا نہیں تیری گلی میں
کسی بیتاب کی میت گڑی ہے

کیا ہے میں نے ضبط آہ جس دم
انی برچھی کی سینے میں گڑی ہے

ٹلیں وہ کب جو دل لینے پہ اڑ جائیں
یہ کیا کچھ کھیل چوسر کی اڑی ہے

زباں تک آ سکے کب حرف مطلب
ہماری آہ سینے میں اڑی ہے

ڈبونا چاہتا ہے قلزم عشق
کنارے پر مری کشتی اڑی ہے

گل بستر ستارے بن گئے ہیں
ترے ماتھے سے جب افشاں جھڑی ہے

خزاں سے ہے بہار حسن محفوظ
گل عارض کی کب پتی جھڑی ہے

یہ کہتا ہے مرا شوق شہادت
تری تلوار پھولوں کی چھڑی ہے

داغ

گھری ہے سو بلاؤں میں مری جاں
یہ تنہا ہے اکیلی ہے چھڑی ہے
دل اپنا بیچتے پھرتے ہیں لاکھوں
محبت آج کل پیسے دھڑی ہے

آخر مالی مشکلات سے گھبرا کر غالباً ۱۸۹۶ء میں بحصول رخصت حیدرآباد کا قصد کیا۔ نواب بنیاد حسین خاں جاہ نے بہت اصرار سے لکھا تھا کہ کانپور ضرور آیئے۔ ان کی خاطر سے کانپور میں چار پانچ دن قیام فرمایا۔

نواب عالمگیر محمد خاں رئیس بھوپال سے بہت دنوں سے خط و کتابت جاری تھی اور دوستانہ مراسم تھے۔ حضرتؒ نے امیر اللغات کی دونوں جلدیں نواب شاہ جہاں بیگم والیہ بھوپال نور اللہ مرقدہا کے حضور میں بھیجی تھیں جس کی بیگم صاحبہ نے بہت قدردانی فرمائی اور اپنا دیوان تحفۃً حضرتؒ کو بھیجا تھا۔ اور اعزہ و احباب کا جو بھوپال میں تھے اصرار کے ساتھ تقاضا ہوا کہ بھوپال ضرور تشریف لایئے۔ حضرتؒ نے کانپور سے اپنی روانگی کا تار دیا۔ بیگم صاحبہ نے اپنی خوشنودی مزاج کا اظہار فرمایا۔ سرکاری سواریاں اور ارکان دولت پیشوائی کو پہلے سے اسٹیشن پر موجود تھے۔ اعزہ و احباب و شعرا کا ہجوم تھا۔ حضرتؒ کے پہنچنے پر سرکار عالیہ نے باغ فرحت افزا میں اپنا مہمان کیا۔ سرکار عالیہ کی طرف سے عبدالجبار خاں بہادر، وزیر ریاست حضرتؒ کی ملاقات اور پرسش احوال کو برابر آتے رہے۔ اور رئیسانہ سیرچشمی کے ساتھ نہایت خاطر و مدارات ہوتی رہی جس کا شکریہ حضرتؒ نے اس

رباعی میں ادا کیا ہے

پامالوں نے کب یہ سرفرازی دیکھی بیچاروں نے کب یہ چارہ سازی دیکھی
مجھ سے تو ملا کے آنکھ کہدے کوئی کس آنکھ نے یہ بندہ نوازی دیکھی

وہاں سے ایک خط میں مجھے تحریر فرماتے ہیں "بحرکت اضطراری مجبوری و ناچاری بے وقت میرے سفر کرنے کا حال اور بھوپال پہنچنا اور منجانب اللہ سرکار سے عزت افزائی ہونا یہ سب تم کو مکرم و معظم برادران جناب دیوان[1] صاحب سے معلوم ہوا ہوگا اس کے تفاصیل لکھنے کی حاجت نہیں۔ ضرورت اس بات کے لکھنے کی ہے کہ میں نے تم کو ابھارا اور ہمسفر ہونے کے واسطے وعدہ لیا اور میرے مخدوم دیوان صاحب نے تمھاری رخصت منظور کرنے سے مجھے مطمئن کیا اور بااین ہمہ میں نے اب تک تم کو تکلیف نہ دی اس کا کیا سبب ہے۔ سنو پیارے ممتاز میں نے جہاں تک ممکن ہوا رام پور میں کوشش کی کہ زادراہ بقدر سفر و اقامت حیدرآباد مہیا ہو کسی طرح ممکن نہ ہوا۔ رخصت کی عرضی دے چکا تھا اور بڑے جھگڑوں سے بہت دنوں کے بعد اس کی منظوری ہوئی تھی۔ اگرچہ موسم سفر کا نہ رہا تھا مگر اپنی جگہ سے حرکت کرنا پڑا۔ قلیل سے زادراہ پر قناعت کر کے گھر سے گھبرا کر نکل کھڑا ہوا لطیف و مسعود و جلیل و رزاز اور ایک کمپاؤنڈر اور دو تین خدمتگار ساتھ لے کر کانپور پہنچا اور دو چار دن جاہ کا مہمان رہکر یہاں آیا۔ اب تک سرکار عالیہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ حیدرآباد کے سفر کا سامان بظاہر معلوم نہیں ہوتا اس لیے کہ اُدھر رخصت کا زمانہ گھٹتا جاتا ہے ادھر یہ نہیں معلوم کہ یہاں سے کب رخصت ہوگی۔ یہ بھی میری تقدیر کہ سفر بھی ہوا تو تمھاری

[1] خان بہادر مولوی سید محمد حسین رضوی دیوان کھیراگڑھ فیوڈیٹری اسٹیٹ صوبہ متوسط جن کے بڑے صاحبزادے سید محسن حسین صاحب کے ساتھ حضرتؒ کی چھوٹی صاحبزادی کی شادی ہوئی۔

ملاقات کی حسرت بر نہ آئی۔ بھوپال میں جب سے آیا ہوں ہر طبقے کے آدمیوں کا عموماً اور شعرا کا خصوصاً ہجوم رہتا ہے اور یہاں سب لوہا مانے ہوئے ہیں"۔

دوران قیام میں مشغلۂ شعر و سخن بھی رہا اور حسب موقع قطعات و رباعیات وغیرہ لکھکر حضور میں گزرانے۔ قیام فرمانے کے بعد ہی یہ قطعہ کہا ؎

پا ز سر کردہ بہ طوفِ حرمت آمدہ ام جاں بکف بہرِ نثارِ قدمت آمدہ ام

من ہم اے ابرِ کرم ہیچو صدف بر درِ تو باُمیدِ رشحاتِ کرمت آمدہ ام

عید الضحےٰ آئی تو یہ رباعی کہی ؎

عید قربان تھی سال بھر سے بعید تھی زیست سے قطعاً اُسے قطع اُمید
عیدی اُسے دی گلے لگا کر شہ نے کہنے لگی عید آج ہوئی میری عید

سرکار عالیہ سے جب رخصت چاہی تو یہی ارشاد ہوا کہ ابھی میری خوشی یہی ہے کہ آپ اور چند روز قیام کیجئے آخر ایسی جلدی کیا ہے۔ اُدھر سرکار عالیہ اس خیال سے کہ امیر ابھی اور قیام کریں شرف ملازمت کو ٹالتی رہتی تھیں اِدھر چھٹی کا زمانہ گزرتا جاتا تھا حضرتؒ رخصت ہونا چاہتے تھے حصول باریابی کی آرزو میں یہ رباعی لکھکر بھیجی ؎

محرومیٔ بخت کی شکایت نہ رہے آئینۂ دل میں گرد کلفت نہ رہے

حاضر ہو سلام کو درِ دولت پر ہے عمر اخیر یہ بھی حسرت نہ رہے

باریاب ہونے پر سرکار عالیہ کی مدح میں ایک تازہ مسدس پڑھا جس کو سن کر بیگم صاحبہ نہایت خوش ہوئیں بہت تعریف کی اور ارشاد فرمایا "پہلے تو میں یہی جانتی تھی کہ آپ شاعر کامل الفن ہیں مگر اب آپ کی نورانی صورت آپ کی سیرت اور دلکش بیان سے یہ ثابت ہوا کہ آپ اہل اللہ اور بے شک ولی زادے ہیں۔ آپکے قدر دان

نواب کلب علی خاں تو اب رہے نہیں اگر آپ منظور کریں تو میں تین سو روپے ماہوار آپ کو دوں گی اور جیسا جیسا موقع ملے گا آپ کے بیٹوں کو بھی اچھے عہدوں پر مقرر کردوں گی۔ اب آپ اسی ریاست میں آرہیئے"۔ حضرتؒ نے جواب میں بہت بہت شکریے کے ساتھ حسب موقع اور مناسب وقت الفاظ میں اس وقت معذوری ظاہر کی اور رخصت ہوئے

افسوس ہے کہ اس مسدس کا ایک بند بھی ہم کو نہ مل سکا۔ حصول باریابی کے بعد بھی اجازت نہ ملتی تھی تو حضرتؒ نے حضور میں یہ رباعی گزرانی ؎

اس در پہ مسافر جو پہنچ جاتا ہے — بھولے سے بھی گھر یاد نہیں آتا ہے

مہمان جو دیکھتا ہے یہ شان کرم — رخصت کا نام لیتے شرماتا ہے

تب جا کے اجازت ملی اور بہ اعزاز تمام رخصت کیے گئے۔ غرض رخصت کا زمانہ وہیں ختم ہو گیا اور حضرتؒ رام پور واپس تشریف لائے۔

یوں تو احباب اور اراکین حیدرآباد کا تقاضا حیدرآباد آنے کے لیے چلا ہی جاتا تھا مگر اتفاق سے آغاز ۱۹۰۰ء (۱۳۱۷ھ) میں نواب میر محبوب علی خاں طاب ثراہ نے کلکتے کا سفر کیا اور حضور ممدوح کا کچھ ایسا اشارہ پایا گیا کہ امیرؒ بنارس میں شرف ملاقات حاصل کریں۔ اس پر حیدرآباد سے نہایت اصرار اور تاکید کے ساتھ خطوط آئے۔ اب حضرتؒ کے دل میں بھی قدم بوسی کا ولولہ پیدا ہوا اور ہمت کر کے بنارس پہنچے۔ حضور نظام طاب ثراہ مہاراجہ بنارس کی کوٹھی میں فروکش تھے۔ حضرتؒ قدم بوسی کے لیے وہیں حاضر ہوئے۔ جیسے ہی حضور میں اطلاع ہوئی فوراً خود بہ نفس نفیس باہر تشریف لے آئے۔ حضرتؒ آداب بجا لائے اور نذر پیش کی۔ قبول فرمائی، اور ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے۔ جو مسدس راہ میں مرتب کیا تھا حضرتؒ نے پڑھ کر سنایا جس کے چند بند یہاں لکھے جاتے ہیں؎

اللہ اللہ نیا رنگ ہوا عالم کا پرتو مہر سے ذرے کا ستارہ چمکا
بڑھ کے قطرے سے ملا بحر کرم حاتم کا آئنہ دل کا بنا جام جہاں بین جم کا
آسمانوں نے در فتح و ظفر کھولدیئے
سر پہ نسرین ہما بن گئے پر کھولدیئے

یہ وہ دن ہے کہ کنول دل کے کھلے جاتے ہیں غیب سے گوہر مقصود ملے جاتے ہیں
شکر آتا ہے مرے لب پہ گلے جاتے ہیں حسرتیں دل سے یہ کہتی ہیں کہ لے جاتے ہیں
دل بڑھا جاتا ہے سرکار کی ہمت کیطرح
غم گھٹا جاتا ہے بدخواہ کی قسمت کیطرح

چتر اقبال نے پامال پہ سایا ڈالا فخر کا تاج ہوا پائے طلب کا چھالا
ہوگئے داغ جگر پھول کھلا گل لالا بن گیا نالۂ موزوں قد سرد بالا
شہ جو پائی نگہ شاہ ظفر پیکر کی
آبرو چھین لی اشکوں نے مرے گوہر کی

گل کھلاتی ہوئی آئی کسی دامن کی ہوا لے اڑی بلبل ناشاد کو گلشن کی ہوا
غیرت باد صبا بن گئی ہے بن کی ہوا کہتی ہے ملکے گلے وادی ایمن کی ہوا
ہو ہرا باغ سخن طبع کا بہرا کھل جائے
سبز بختی کا ترے سر پہ پھریرا کھل جائے

کچھ عجب رنگ ہے زیر فلک مینائی جھومتی آتی ہے مستی ہے گھٹا برچھائی
غنچۂ دل جو کھلا پھول کی خوشبو آئی ڈوب کر عطر مسرت میں صبا اترائی
خم بھرے شیشے کھلے دور میں ساغر آیا

چرخ کہتا ہے کہ لینا مجھے چکر آیا

اٹھ گئے آج در دل سے وہ پڑے گھرے — جم کے ہر طرح کی امید کے بیٹھے پہرے
موجیں آہوں کی نہیں ساز طرب کے لہرے — بات سننے کی یہ ہے کان عدو کے بہرے

کھل گیا غیب سے در طالع مسعود کا آج
سامنا ہو ہی گیا شاہد مقصود کا آج

رنگ امید مرا داغ تمنا لایا — جوش دل تشنہ دہن کو لب دریا لایا
دلنوازی جو سنی دل کا تقاضا لایا — شجر اخلاص کا آخر کو پھل اچھا لایا

طائر شوق کہاں کھولتے ہی پر پہنچا
کیا تڑپ تھی کہ زمیں سے میں فلک پر پہنچا

داغ مرہم سے ملا درد دوا تک پہنچا — ذرہ اس درجہ بڑھا اوج سما تک پہنچا
دامن عجز گدا دست عطا تک پہنچا — تھا جو ناکام وہ اب کام روا تک پہنچا

لب پر آتے ہی دعا باب اثر تک پہنچی
نخل سے پھوٹتے ہی شاخ ثمر تک پہنچی

کس کی جانب ہے الٰہی یہ مرا روئے سخن — آج کچھ اور ہی ہے رنگ سخن بوئے سخن
بن گئی فکر رسا شانۂ گیسوئے سخن — بات جب ہے کہ نہ چھوٹے کوئی پہلوئے سخن

شعر جو اونچے سے اونچا ہو زباں پر آئے
تو سہی عرش سے مضمون اتر کر آئے

سامنے کون ہے سلطان سلاطین جہاں — سامنے کون ہے تاج سر تمکین جہاں
دانش آموز جہاں موجد آئین جہاں — رونق بزم جہاں مایۂ تزئین جہاں

حامئ دین نبی ظل خدا خلق پناہ
میر محبوب علی خان بہادر جم جاہ

حضور نظام نے نہایت التفات اور رغبت سے یہ نظم سنی۔ ہر مصرع پر داد سخن دی۔ نہایت محظوظ ہوئے اور بہت شوق سے خود ہاتھ بڑھا کر مسدس لے لیا۔ اور ارشاد ہوا کہ اب آپ ہمارے ساتھ حیدر آباد چلیے۔ عرض کی کہ میں قدیم نمک خوار ریاست رام پور کا ہوں وہاں سے اجازت نہیں لی ہے اور ہمرکاب سعادت چلنے کے لیے تیار ہو کر نہیں آیا ہوں انشاء اللہ جلد حاضر ہوں گا۔ ارکین دولت نے جو ہمرکاب تھے نذر کے مقبول ہونے کی مبارکباد دی اور سب کہنے لگے کہ یہ اعزاز اور اس طرح کی ملاقات ہم نے آج تک کسی کے ساتھ نہیں دیکھی۔ حیدر آباد آج سے آپ کا گھر ہو گیا۔ اور ان سب نے بھی اصرار کیا کہ بس اب ساتھ ہی چلئے۔ حضرتؒ نے اُن سے بھی وہی عذر کیا۔ اور کہا انشاء اللہ شروع موسم گرما میں آؤں گا۔

مشیت ایزدی تو کچھ اور ہی تھی۔ گرمیاں بھی ارادے ہی ارادے میں گزر گئیں۔ آخر وقت آیا اور برسات میں حیدر آباد کا سفر کیا جو درحقیقت سفر آخرت کا پیش خیمہ تھا۔ حضرتؒ پہلے ہی سے مکرر سہ کرر کہہ چکے تھے ؎

اب کے سفر وہ ہے کہ نہ دیکھوں گا پھر وطن — یوں تو میں لاکھ بار غریب الوطن ہوا
کیسی گھڑی تھی گھر سے جو نکلا تھا غم یہ ہے — پھر دیکھنا نصیب نہ مجکو وطن ہوا

چونکہ احباب و اراکین دارالاقبال بھوپال کو خبر مل گئی تھی اور اُن سب کا بہت اصرار تھا۔ بر سر راہ پہلے وہیں اتر پڑے۔ سرکار عالیہ نے فرحت افزا باغ میں فروکش کیا اور پہلے سے بھی زیادہ اعزاز و اکرام فرمایا۔ اور اس قدر اصرار اور قدردانی کی کہ کم و بیش

ایک مہینا بھوپال ہی میں آپ کا قیام رہا۔

۲۳ ربیع الآخر ۱۳۱۸ھ کو نواب فصیح الملک کے نوازشنامۂ مورخۂ ۱ اگست ۱۹۰۰ء کے جواب میں لکھتے ہیں "آپ نے لکھا ہے کہ قیام میرے پاس لابد ہوگا اگرچہ مکان اس قابل نہیں مگر شاد باید زیستن۔ میرے پیارے داغ غربت میں میری راحت کے سہارے داغ۔ اس سے زیادہ مجھے کیا خوشی ہوگی کہ غریب الوطن ہو کر آپ سے مانوس الطبع ہمدرد کے پاس ٹھہروں مگر میرے حالات باعتبار عوارض کے ہرگز اس قابل نہیں کہ تنگ مکان میں تھوڑی دیر بھی بسر کر سکوں۔ اشد ضرورت یہ ہے کہ ایک درجہ مکان جس کی راہ سکونت گاہ سے اندر ہی اندر ہو اور آدمیوں سے وہاں قریب بھی نہ ہو مجھے خاص اپنے واسطے چوکی لگانے کو چاہیئے۔ مرض کی وجہ سے گھڑی گھڑی چوکی پر جانا ہوتا ہے تب زندہ رہ سکتا ہوں ناشاد باید زیستن اگر ممکن ہوتا تو میں تمھاری یکجائی سے اس کو شاد باید زیستن سمجھتا۔ میرے ساتھ جو میرے فرزند ہیں وہ بھی بسبب عادات کے تکلیفات شاقہ تنگئی مکان کے متحمل نہیں۔ اور سب تکلیفیں چند روز گوارا ہو سکتی ہیں مگر جس طرح ممکن ہو کوئی وسیع مکان جس میں متعدد درجات ہوں میرے واسطے پہلے سے مرتب کر رکھیئے کہ جب تک مہمان سرکاری ہونے کی صورت نہ نکلے وہاں رہوں اور زندہ رہوں۔ اور کسی قسم کی تکلیف زاید از مکان تم کو دینا نہیں چاہتا۔ یار شاطر ہو کر رہنا چاہتا ہوں نہ بار خاطر خصوصاً ایسی حالت میں کہ آپ کا دل و دماغ عوارض و امراض اور کثرت فکر سخن سے ضعیف ہو رہا ہے۔ میرے ہمراہی یہ ہیں"۔

"لطیف احمد۔ مسعود احمد[۱]۔ لیاقت حسین برادر زادہ و داماد بندہ۔ ثابت علی فرزند خواہرزادہ حقیقی۔ حافظ جلیل حسن جلیل۔ خان علی برادر مہدی علی خاں۔ ان کے علاوہ تین خدمتگار"۔

---

[۱] دونوں صاحبزادے ہیں۔

"آپ نے حضور میں میرے آنے کی خبر کر دی بہت اچھا کیا۔ میں ممنون ہوا اور مسرور خداوند تعالےٰ آپ کو اس مرض تبخیر و ضعف دماغ و دوران سر سے نجات اور پرہیز کامل کی توفیق دے۔ آج میں نے پھر درخواست رخصت کی سرکار عالیہ کو بھیجی ہے۔ خدا کرے جلد ملازمت و رخصت حاصل ہو جائے"۔ (خطوط منشی امیر احمدؒ)

حضرتؒ کی جو سوانح عمری جناب مکیش نے لکھی ہے اور اگست ۱۹۰۳ء میں مطبع رحمانی دہلی میں طبع ہوئی ہے اس میں لکھتے ہیں "ایک روز راقم الحروف حضرت داغؔ مدظلہٗ کی خدمت میں حاضر تھا۔ آپ نے فرمایا میاں مکیش امیر صاحب تشریف لا رہے ہیں میں نے عرض کی کب آئیں گے فرمانے لگے دیکھئے ابھی تو بھوپال ہی میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ کوئی تار یا خط آئے تو معلوم ہو۔ پھر نیازمند دو چار روز کے بعد حاضر خدمت ہوا تو کیا دیکھا کہ حضرت داغؔ نہایت اشاش بشاش ہیں اور ایک مکان آراستہ کر رہے ہیں میں نے سلام کیا دیکھتے ہی فرمانے لگے، لو بھئی منشی صاحب وہاں سے چل دیئے یقین ہے کہ کل کی ریل میں بلدے میں داخل ہو جائیں گے۔ دیکھو یہ مکان ان کے واسطے آراستہ کیا گیا ہے تم بھی ذرا اوپر جا کے دیکھ آؤ"۔

پھر اس کے بعد لکھتے ہیں "آخر گلبرگہ شریف میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کی زیارت سے مشرف ہو کر ۱۰ جمادی الاول ۱۳۱۸ھ کو وارد حیدر آباد فرخندہ بنیاد ہوئے اور حضرت داغؔ مدظلہٗ کے مکان پر رونق افروز ہوئے"۔

حیدر آباد میں حضرتؒ کے ورود کی شان اور حیدر آباد کے لوگوں کا اشتیاق اور ولولہ اور مرض میں افاقہ وغیرہ نواب اختر یار جنگ منشی لطیف احمد صاحب اخترؔ (حضرتؒ کے سنجھلے صاحبزادے) کے اُس خط سے ظاہر ہے جو حیدر آباد سے ۲۹ ستمبر ۱۹۰۰ء کو مجھے لکھا تھا:

دولت کدہ فصیح الملک بہادر
حیدرآباد دکن

بھائی صاحب۔ تسلیم و تکریم۔ مکرمت صحیفہ ابھی مجھے ملا۔ ادراک خیریت سے اطمینان اور مجمل طور سے آپ کا متردد ہونا معلوم کرکے افسوس ہوا۔ اللہ تعالےٰ آپ کو مسرور اور مطمئن رکھے اور آپ کی دعائیں میرے حق میں اور میری دعائیں جو آپ کے لیے بلا قصد نکلتی ہیں مستجاب فرمائے۔ منجملہ اور دعاؤں کے باطمینان آپ سے یکجائی کی بھی تمنا ہے۔

بھائی صاحب۔ ۵ ستمبر کو پانچ بجے شام کے ہم لوگ حیدرآباد پہنچے۔ یہاں پیشتر سے بذریعۂ اشتہار وقت ورود کی اطلاع ہوگئی تھی۔ تمام اسٹیشن استقبال کرنے والوں سے بھرا ہوا تھا جن میں علما۔ مشائخ اور بہت سے امراء اراکین ریاست تھے۔ گاڑی رکتے ہی سکرٹری صاحب اسٹیٹ کلب نے دست بستہ التجا کی کہ میری خواہش چند منٹ کلب میں توقف فرمانے کی ہے جو یہاں سے بہت قریب ہے۔ ان کی درخواست منظور کی گئی۔ پلیٹ فارم پر قبلہ و کعبہ کا قدم رکھنا تھا کہ مصافحہ کرنے والوں کے غول میں گھر گئے۔ بہت سے آدمی جو مصافحے کے لیئے مجمع کی وجہ سے قریب نہیں پہنچ سکتے تھے وہ عبا کے دامن ہی کو بوسہ دے کر ہٹ جاتے تھے۔ مختصر یہ کہ عجب سماں تھا۔ اس درجہ عام مقبولیت کا ہرگز خیال نہ تھا جو ثابت ہوئی۔ مہاراجہ بہادر پیش کار و وزیر افواج کی گاڑیاں لئے ہوئے پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار موجود تھے۔ اسٹیشن سے کلب میں آنا ہوا۔ کلب میں بھی بہت سے عمائد اور لائق لوگ مجتمع تھے اور ٹی پارٹی کا سامان میزوں پر چنا ہوا تھا۔ اکثر شعرا نے ورود دکن کی تاریخیں اور قطعات پڑھے۔ کچھ آدمیوں نے کھڑے ہو کر اظہار سرور کیا۔ آخر میں قبلہ و کعبہ نے سب کی عنایت کا شکریہ ادا کیا۔ کلب سے نواب فصیح الملک بہادر کے دولتکدے پر آنا ہوا۔

جن قطعات میں فصیح الملک رہتے ہیں وہ اگرچہ چنداں مختصر نہیں ہیں مگر چونکہ اصطبل بھی اسی مکان میں ہے اس وجہ سے کسی آدمی کے قیام کا موقع نہیں۔ اسی کے متصل دو مکان اور کرائے پر لے کر سامان ضروری سے مرتب کر دیئے گئے ہیں انھیں میں ہم لوگ رہتے ہیں۔ بہت جی چاہتا ہے کہ کسی طرح چند ہی روز کے لئے سہی آپ بھی تشریف لاتے۔ عجب نہیں کہ کسی مشاعرے میں شرکت کے لئے آپ بذریعہ تار بلائے جائیں۔ میں نے احتیاطاً عرض کر دیا ہے کہ آپ تیار ہو رہیں۔"

حضرت مسکین نے لکھا ہے "ابھی دو دن بھی پورے نہیں گزرے تھے کہ آپ کو غثیان صفراوی شروع ہوا اور حکیم نظر علی خاں رام پوری جو حضرت داغ کے مکان کے قریب رہتے ہیں آپ کے معالج ہوئے اور اُن کے علاج سے مرض میں کسی قدر افاقہ ہوا۔"

نواب اختر یار جنگ نے بھی اپنے اسی ۲۹ ستمبر کے خط میں مجھے لکھا تھا "حضرت قبلہ و کعبہ کی علالت نہایت سخت اور اندیشہ ناک تھی۔ اللہ تعالےٰ کا جس قدر شکر کیا جائے کم ہے کہ اب بہت افاقہ بلکہ صحت ہے۔ صرف ضعف اور بواسیر مکلف ہے۔ بواسیر تو کمبخت حالت ضعف میں بہت ایذا رساں ہوتی ہے ضعف کی یہ حالت ہے کہ کروٹ بھی دوسرے آدمی کے سہارے سے لے سکتے ہیں۔ چوکی پر بیٹھنا ممکن نہیں اور بغیر بار بار چوکی پر جانے کے پیشاب سے فراغ تو حالت صحت میں بھی نہیں ہوتا تھا مجبوراً چھ سات گھنٹے کے بعد قاثاطیر سے کام لیا جاتا ہے یہی بہت غنیمت ہے کہ عمل قاثاطیر پر خود قدرت ہے ورنہ بڑی دشواری ہوتی۔"

حسب ارشاد اعلےٰ حضرت نواب میر محبوب علی خاں طاب ثراہٗ عالی جناب سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر شاد اور نواب افسر جنگ وغیرہ حضرتؒ کی بیماری میں برابر عیادت کو آتے رہے جس کے شکریے میں حضرتؒ نے بستر رنجوری پر پڑے پڑے حسرت کے عالم میں چند

باعیاں کہی تھیں جو یقیناً ان کا آخری کلام ہے۔ دو ایک رباعیاں یہاں لکھی جاتی ہیں ؎

مشتاق کو ملنے کی تمنا ہی ملی
غنچہ ہی رہی طبیعت اب تک نہ کھلی
امراض نے دم بھر کو نکلنے نہ دیا
گھٹ گھٹ کے رہی دل میں تمنائے دلی

دیگر

ہے آپ کے اخلاق سے دل رشک چمن
صد شکر کہ غربت میں ملا لطف وطن
ہر موئے بدن زباں ہے پر ہوں خاموش
میں شکر کی تصویر بنا ہوں ہمہ تن

دیگر

ہے آپ کا اخلاق جو ہمدرد مرا
رشک دم عیسےٰ ہے دم سرد مرا
فرماتے ہیں ہر روز عیادت میری
درماں مرے حق میں ہو گیا درد مرا

حضور نظام طاب ثراہ کی خدمت میں پیش کرنے کو ایک مسدس بھی تصنیف فرمایا تھا۔ جس کے چند بند دوسرے حصے میں ملاحظہ ہوں۔

مگر من درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال! افسوس کہ وہ افاقہ ایک دھوکا ہی دھوکا اور گویا موت کا سنبھالا تھا۔ حضرت مسکین لکھتے ہیں کہ "اس کے بعد ڈاکٹری علاج شروع ہوا اُس سے پیچش ہو گئی اور نفع نہ ہوا۔ آخر پھر حکیم نظر علی خاں کا علاج شروع کیا۔ مگر یہ مرض الموت تھا اس کا علاج کسی سے ہوا نہ ہو۔ پھر یہ تجویز ٹھہری کہ نقل مکان کیا جائے۔ یہاں کی آب و ہوا ٹھیک نہیں ہے۔ چنانچہ نواب تہور جنگ بہادر کا ایک بنگلا جو توپ کے سانچے کے قریب واقع ہے آپ کی فرودگاہ کے واسطے قرار دیا گیا اور ۱۲؍ جمادی الثانی کو عصر کے وقت آپ کو حضرت داغ کے میانے میں سوار کرکے اس مکان میں لے گئے وہاں جا کر بھی بہت کچھ علاج و معالجہ کیا گیا مگر کیا ہوتا ہے تقدیر خدا چل چکی تھی روز بروز حالت ردی ہوتی گئی

اور ضعف بڑھتا گیا۔ دو چار روز کے بعد اور بھی سکت نہ رہی یہاں تک کہ بات کا جواب بھی نہ دے سکتے تھے اور دن بھر خاموش پڑے رہتے تھے۔ غذا سے بھی تعلق چھوٹ گیا تھا۔ شب یکشنبہ ۱۹ر جمادی الثانی کو (یعنی ۱۸ر اور ۱۹ر جمادی الثانی کی درمیانی شب) جب نصف شب گزر چکی آپ نے سنبھالا لیا اور اپنے دونوں بیٹوں یعنی منشی لطیف احمد صاحب و منشی مسعود احمد صاحب اور اپنے داماد منشی لیاقت حسین صاحب اور حافظ جلیل حسن صاحب جو آپ کے دفتر کے سکرٹیری تھے سب کو قرآن شریف و کلمہ پڑھنے کے واسطے حکم دیا۔ یہ سب لوگ قرآن شریف اور کلمہ طیبہ پڑھنے لگے اور آپ اپنے اُس کام میں مصروف ہو گئے جو حضرت امیر شاہ صاحبؒ سے پہنچا تھا۔

جس وقت رات کے دو بجے آپ نے اپنی زبان مبارک سے جہر کے ساتھ کلمہ پڑھا[1] اور جان بحق تسلیم کی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ؎

انسوس تجھ کو رحم نہ آیا کچھ اے اجل مارا کہاں امیر غریب الدیار کو"

حضور نظام طاب ثراہ کو جب اس حادثے کی خبر ہوئی تو نہایت رنجیدہ ہوئے۔ بار بار افسوس فرماتے رہے۔

۱۹ر جمادی الآخرہ ۱۳۱۸ھ روز یکشنبہ کو آپ کا غسل میت ہوا اور حضرت شاہ خاموشؒ کی درگاہ والی مسجد کے احاطے میں مولوی فضل حق صاحب خلف مولوی عنایت علی صاحب دہلوی نے نماز جنازہ پڑھائی ؎

[1] یاد آتا ہے کہ حضرتؒ کی رحلت کے بعد کسی خط میں نواب فصاحت جنگ جلیل القدر حافظ جلیل حسن صاحب جلیل نے یہ واقعہ مجھے لکھا تھا جس کو جناب مسکین نے بھی سوانح عمری میں یوں لکھا ہے "یہ بھی سنا گیا ہے کہ جس کمرے میں آپ کا پلنگ تھا وہاں ایک لیمپ روشن تھا جب آپ کی روح پرواز کرنے لگی اس کی بھی روشنی دھیمی ہوتی گئی اور جس وقت آپ کا دم نکلا لیمپ بالکل گل ہو گیا اور ایک نورانی روشنی خود بخود اس کمرے میں پھیل گئی۔ واللہ اعلم بالصواب"۔

ہمراہ ہے جو حسرت و ارماں کی بھیڑ بھاڑ　　تابوت اٹھا امیر غریب الدیار کا

حضرت شاہ یوسف اور حضرت شاہ شریف رحمہا اللہ تعالےٰ کی درگاہ میں دفن کئے گئے۔

قبر ہی وادی غربت میں بنے گی اک دن　　اور کوئی نظر آتی نہیں گھر کی صورت (امیرؒ)

افسوس! آفتاب شاعری غروب ہو گیا!! دنیائے سخن میں اندھیرا چھا گیا!!! وہ نورانی صورت زیر زمیں آرام میں ہے اور عزیز و تلامذہ خاک بر سر بے چین اور بے قرار۔

اے سرزمین دکن! تو نہایت ہی خوش نصیب ہے کہ اردو شاعری کی ابتدا کرنے والے شعرا تیری ہی فضا میں پیدا ہوئے اور اردو کا خاتم الشعرا امیر مینائیؒ بھی تیرے ہی آغوش میں ہمیشہ کے لیئے آرام کر رہا ہے ؎ امیر

ہوا جو پیوند زمیں کا تو دل ہوا شاد مجھ حزیں کا　　بس ارادہ نہیں کہیں کا کہ رہنے والا ہوں میں یہیں کا

یوں تو بیسیوں شعر غربت میں قضا آنے سے متعلق کہے جن میں سے بعض لکھے جا چکے مگر اس نعتیہ غزل میں (دیوان نعتیہ "محامد خاتم النبیین" میں ہے) اب کہاں چین خبر دی مرے جی نے مجکو ؛ کہ مدینے میں بلایا ہے نبی نے مجکو۔ یہ شعر کہا تھا ؎ اب نہ ٹھہروں جو خوشامد بھی کرے میری وطن ؛ کہ پکارا ہے غریب الوطنی نے مجکو۔ اس میں "غریب الوطنی" سے ۱۳۱۸ھ نکلتے ہیں جس طرح اور اشعار میں غربت میں موت آنے کی پیشین گوئی تھی گویا سال رحلت کی پیشین گوئی بھی پوری ہو کے رہی۔

جس نے سیکڑوں آدمیوں کی تاریخ وفات کہی اب اسی کی رحلت کی تاریخیں صدہا لوگوں نے کہیں میں صرف دو چار تاریخوں پر اکتفا کرتا ہوں جو عالی جناب سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر شاد بالقابہ اور حضرتؒ کے معزز ہم عصروں نواب فصیح الملک مغفور اور جناب جلال مرحوم نے کہی تھیں۔

شاؔد

از دارِ جہاں امیرؔ رفتہ فریاد — گفتہ رضواں کہ گشت فردوس آباد
گفتیم دعائیہ چنیں سالِ وفات — محمود بود آخرت او۔ اے شاؔد
۱۳۱۸ھ

داؔغ

وائے ویلا چل بسا دنیا سے وہ — جو مرا ہم فن تھا میرا ہم صفیر
گو بظاہر تھا امیر احمد لقب — درحقیقت باطناً پایا فقیر
شاہ مینا سے ہے نسلی سلسلہ — شاعری میں خاص تلمیذ اسیرؔ
مصطفےٰ آباد سے آیا دکن — یہ سفر تھا اس مسافر کو اخیر
کیا لکھوں کیا کیا ہوئیں بیماریاں — کیا لکھوں تفصیل امراض کثیر
مبتلائے حدت صفرا و تپ — موردِ آزارِ اسہال و زحیر
ہے دعا بھی داغؔ کی تاریخ بھی — قصرِ عالی پائے جنت میں امیرؔ
۱۳۱۸ھ

ولہ

کر گئے رحلت امیر احمد امیرؔ — اب نشاطِ زندگی جاتا رہا
مل گئی تاریخ دل سے داغؔ کے — آہ لطفِ شاعری جاتا رہا
۱+۱۳۱۷=۱۳۱۸ھ

ولہ

چل بسے داغؔ کے بہت احباب — رات دن جن کے غم میں ہے دلگیر
آج اس غم کی یہ کہی تاریخ — اب ہوا دل پہ آہ داغ امیرؔ
۱۳۱۸ھ

ع؎ رام پور۔

جلال

کجا امیر کجا سر زمین ملک دکن　　　کہاں قیام تھا مدفن کہاں ہوا ہے نصیب
جلال لکھدو یہ تاریخ ان کی رحلت کی　　　امیر ہو گئے صد وائے ایک مرد غریب
۱۹۰۰ء

حضرتؒ نے ہجری سن کے حساب سے تہتر برس دس مہینے (دو یا تین دن اوپر) کی عمر پائی۔ آپ کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق برگزیدہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ غرض حضرتؒ عربی میں فاضل اجل، فارسی میں ماہر کامل، اردو کے اہل زبان، علم دین کے محقق اور علوم حکمت و نجوم و عروض وغیرہ پر پوری طرح قادر تھے۔ اخلاق حسنہ کا مجسمہ تھے اور شعر فہمی و سخن سنجی کے متعلق تو اتنا کہدینا غالباً کافی ہے کہ خاتم الشعرا تھے۔ مذہباً حنفی تھے مگر مقلد جامد نہیں بلکہ محقق۔ خاندان چشتیہ صابریہ میں میاں امیر شاہ صاحب رام پوری قدس سرہٗ سے بیعت تھی۔ ریاضات کئے اور خلافت[1] پائی تھی۔ بعض لوگوں کو ان کی خواہش اور اصرار بیجد پر مرید بھی کیا مگر یہ سلسلہ بڑھایا نہیں۔

واجد علی شاہ طاب ثراہ کا ساعہد عیش و عشرت پایا۔ فردوس مکاں اور خلد آشیاں کے زمانے کی دلچسپیاں دیکھیں ہمیشہ مشغلۂ شعر و سخن رہا مگر اللہ رے پرہیز گاری دامن اتقا کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ تمام عمر نماز روزے کا التزام رہا اور صرف فرض ہی نہیں بلکہ تہجد۔ اشراق اور چاشت کی نمازیں اور ایام بیض۔ ذی الحجہ اور عاشورہ وغیرہ کے روزے بھی

---

[1] سنا ہے کہ جس زمانے میں حضرتؒ مدارج سلوک طے کر رہے تھے آپ پر ایک عجیب حالت محویت و استغراق طاری رہتی۔ دنیا کے ہر کام سے کنارہ کشی اختیار فرمائی تھی۔ آپ کی والدہ ماجدہ متردد ہوئیں اور حضرت امیر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کہلا بھیجا کہ یہ اگر ایک ہی طرف کے ہو کر رہ گئے تو میرا اور خود ان کا کام کیوں کر چلے گا۔ شاہ صاحب موصوف نے اپنی ٹوپی مرحمت فرمائی جس سے اس حالت میں سکون ہوا مگر حضرتؒ کو اس کیف و لذت میں کمی سے تردد و انتشار رہا۔ امیر شاہ صاحبؒ نے تسکین فرمائی۔ اور کہا یہ دولت تم سے چھینی نہیں جاتی بلکہ مناسب طور پر تم اس سے فیضیاب ہوتے رہو گے۔

نہ چھوٹے۔ وہ ظاہر میں امیر و شاعر کامل فن تھے مگر دل سے فقیر او رچھپے ہوئے درویش صاحب باطن۔ البتہ آخر میں تصوف کا رنگ نمایاں ہو چلا تھا۔ فقر کی خوشبو کچھ پھیل چلی تھی جناب مولنا سید محمد شاہ صاحب محدث اور حضرت شاہ محمد معصوم صاحب نقشبندی مجددی سے قلبی تعلقات اور خصوصیات بہت بڑھ گئے تھے اکثر ایسے ہی بزرگوں سے صحبت رہتی تھی۔

۱۸۹۹ء میں میں نے دیکھا ایک صاحب جو خوش گلو تھے روز آتے اور عارفانہ و نعتیہ غزلیں وغیرہ حضرتؒ کے سامنے گاتے تھے۔ اور آپ پر ایک حالت طاری ہو ہو جاتی تھی۔

حضرتؒ کے سات صاحبزادے اور چھ صاحبزادیاں تھیں (جن کا علم مجھے ہے)۔ جن میں سے پانچ صاحبزادے بفضلہ اب تک بقید حیات[1] ہیں جن کے نام نامی بہ ترتیب حسب ذیل ہیں:۔

منشی محمد احمد صاحب صریرؔ مینائی (استاد والی ریاست رام پور) منشی خورشید احمد صاحب مینائی (میشکار ریاست رام پور) منشی لطیف احمد صاحب اخترؔ مینائی المخاطب بہ نواب اختر یار جنگ بہادر (ناظم و معتمد امور مذہبی سرکار نظام)۔ منشی ممتاز احمد صاحب آرزوؔ مینائی (نائب منصرم کتب خانہ ریاست رام پور) منشی مسعود احمد صاحب ضمیرؔ مینائی (پہلے ملک متوسط میں بعہدۂ تحصیلداری گورنمنٹ ہند کے ملازم تھے اب ریاست جے پور میں ملازم ہیں)۔ دو صاحبزادے حضور احمد اور ظہور احمد صغرسنی ہی میں انتقال فرما گئے۔ چھ صاحبزادیوں میں چار انتقال فرما چکی ہیں۔ دو خدا کی عنایت سے موجود ہیں (اللہ سب کو تا دیر زندہ و سلامت رکھے)۔

تلامذۂ امیرؒ کی تعداد اس قدر کثیر ہے کہ سب کو احاطۂ تحریر میں لانا دشوار ہے۔

---

[1] منشی محمد احمد صاحب صریرؔ مینائی، منشی لطیف احمد صاحب اخترؔ مینائی اور منشی ممتاز احمد صاحب آرزوؔ مینائی کا اب انتقال ہو چکا ہے۔

چند مخصوص شاگردوں کے اسمائے گرامی مختصر کیفیت کے ساتھ ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔

نمبر شمار	تخلص	نام	کیفیت
۱	آبر	منشی واحد علی صاحب قدوائی	منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی کے چھوٹے بھائی۔ صاحب دیوان۔ دیوان غیر مطبوعہ ہے۔
۲	برہم	حکیم محمد عبدالکریم خاں صاحب فتحپوری	ایڈیٹر "مشرق" اور "فتنہ عطر فتنہ"۔ غالباً دیوان بھر کا کلام ہو مگر چھپا نہیں۔
۳	بسمل	منشی عبدالرحمن صاحب	حضرت کے عزیز قریب اور شاگرد خاص۔
۴	"	منشی واحد علی صاحب کاکوروی	قدیم اور عقیدت مند شاگردوں میں۔ بہت اچھا کہنے والے۔ دیوان کی بابت علم نہیں۔
۵	"	منشی محمد حسین صاحب خیرآبادی	مضطر خیرآبادی کے بڑے بھائی۔ ذی علم اور بڑے خوشگو۔ کلام تصوف آمیز ہوتا تھا۔ اکثر غزلیں گائی جاتی ہیں۔ انتقال کو ایک مدت ہوئی۔ خدا جانے کلام کیا ہوا۔
۶	بےنظیر	بےنظیر شاہ صاحب وارثی	الہ آباد کڑے کے رہنے والے۔ بڑے مثنوی گو اور بہت خوش فکر۔ بعض مثنویاں شائع بھی ہو چکی ہیں۔
۷	ثاقب	مولوی احسن اللہ خاں صاحب	مدیر "قند پارسی"۔ زبان فارسی کے فاضل اجل اور ماہر کامل۔ اردو کلام بھی ہے مگر غالباً کم۔ مؤلف "خطوط منشی امیر احمد"
۸	جاہ	نواب سید بنیاد حسین خاں صاحب	ایک دیوان طبع ہو چکا ہے اور غالباً دوسرا بھی۔
۹	جگر	حکیم محمد افتخار علی صاحب بسوانی	شاگرد قدیم و کہنہ مشق۔ صاحب فن بہت خوش فکر اور استاد سے خاص عقیدت رکھنے والے۔ کلام بہت ہے مگر غالباً دیوان چھپا نہیں۔
۱۰	جلیل	حافظ جلیل حسن صاحب مانکپوری	المخاطب بہ جلیل القدر نواب فصاحت جنگ۔ استاد حضور نظام دکن۔ غالباً تین دیوان شائع ہو چکے ہیں۔

نمبر شمار	تخلص	نام	کیفیت
۱۱	حسرت	مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی	المخاطب بہ نواب صدر یار جنگ بہادر سابق صدر الصدور امور مذہبی سرکار نظام۔ صاحب تالیف و تصنیف مستغنی عن التعریف
۱۲	حسن	منشی محمد حسین صاحب فیض آبادی	بہت خوش گو۔ دیوان مرتب ہے چھپا نہیں۔
۱۳	حفیظ	حافظ محمد علی صاحب جونپوری	دیوان چھپ چکا ہے۔ کہنہ مشق و قدیم شاگرد۔
۱۴	خلیل	حافظ خلیل حسن صاحب مانکپوری	برادر جناب جلیل۔ صاحب دیوان اور آٹھ دس مثنویوں کے مصنف حضرت رح کے فیض صحبت سے بھی فیضیاب ہوئے ہیں۔
۱۵	خیال و دانش	مولوی محمد ریاض حسن خاں صاحب	رئیس رسول پور ضلع مظفر پور۔ بہت ذی استعداد شاگرد ہیں۔ ریختہ میں خیال اور فارسی میں دانش تخلص کرتے تھے۔
۱۶	دل	منشی ضمیر حسن خاں صاحب شاہجہاں پوری	آج کل بھی آپ کے کلام سے اردو رسائل مالامال رہتے ہیں دیوان شاید ابھی تک کوئی شائع نہیں ہوا۔
۱۷	راز	منشی امتیاز احمد خاں صاحب رام پوری	حضرت رح کا فیض صحبت بہت اٹھایا۔ آخر آخر میں بہت مشاق ہو گئے اور اچھا کہنے لگے تھے۔ کلام پر تاثیر ہوتا تھا۔
۱۸	رضا	مولنا برکت اللہ صاحب فرنگی محلی	صاحب دیوان۔ صاحب استعداد۔ مضامین بلند پسند کرتے اور کہتے تھے۔
۱۹	ریاض	سید ریاض احمد صاحب خیر آبادی	تعارف کے محتاج نہیں۔ کلام تو اتنا ہوگا کہ دو دیوان چھپیں مگر اب تک ایک بھی نہ چھپا[1]۔ مشاق منتظر ہیں۔
۲۰	زاہد	سید زاہد حسین صاحب سہارن پوری	اردو۔ فارسی۔ عربی تینوں زبانوں میں بہت ذی استعداد۔ تلمیذ رشید سرمایہ کلام بہت۔ معلوم نہیں دیوان کیوں نہیں چھپا۔ غالباً زمانے کا مذاق دیکھ کر۔
۲۱	سحر	سراج میر خاں صاحب بھوپالی	بہت ہی خوش گو۔ انتقال فرما چکے ہیں۔ کلام کا کچھ حصہ "مخزن لاہور" میں شایع ہو چکا ہے۔

[1] اب چھپ گیا ہے جس کا نام "ریاض رضواں" ہے۔

کیفیت	نام	تخلص	نمبر شمار
مصنف "فسانۂ آزاد" "جام سرشار" وغیرہ۔	پنڈت رتن ناتھ صاحب	سرشار	۲۲
رئیس رسول پور ضلع مظفر پور۔ بہت ہی ذی استعداد۔ اہل نظر	مولوی مہدی حسن خاں صاحب	شاداب	۲۳
مشہور ناول نویس۔ ایڈیٹر "دلگداز" نثر کی طرف زیادہ متوجہ رہے۔	مولوی عبدالحلیم صاحب	شرر	۲۴
دیوان چھپنا معلوم نہیں مگر کلام اکثر رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ غالبًا فن عروض میں بھی ایک کتاب لکھی ہے اور شائع ہو چکی ہے۔	سید حسن مرتضےٰ صاحب عماد پوری	شفق	۲۵
حضرت ریاض کے چچا۔ کلام بہت اچھا ہوتا تھا۔ مگر دیوان شائع نہیں ہوا۔	سید ولایت احمد صاحب خیر آبادی	شمیم	۲۶
آپ پہلے حضرت اسیر کے شاگرد تھے۔ پھر حضرت امیرؒ سے بھی اصلاح لی ہے۔ دیوان چھپ چکا ہے۔ "ترانۂ شوق" اور "عالم خیال" یہ دو مشہور مثنویاں بھی چھپ چکی ہیں۔	منشی احمد علی صاحب قدوائی	شوق	۲۷
عربی کے فاضل اور صاحب دل۔ حیدر آباد میں کئی سال تک مختلف عہدوں پر رہے۔ دیوان تھا مگر تلف ہو گیا۔	مولوی محمد مظفر حسین صاحب امیٹھوی	صبا	۲۸
پہلے دارالعلوم کالج حیدر آباد میں علم ہیئت کے پروفیسر رہے۔ پھر عثمانیہ یونیورسٹی میں دینیات و حدیث کے پروفیسر رہے۔ دیوان موجود ہے مگر طبع نہیں ہوا۔	مولوی عبدالواسع صاحب امیٹھوی	صفا	۲۹
صاحب دیوان جو چھپ چکا ہے۔	نواب صفدر علی خاں صاحب رام پوری	صفدر	۳۰
قدیم اور خاص شاگرد۔ دیوان جہاں تک مجھے علم ہے نہیں چھپا	سید عابد حسین صاحب سہسوانی	عابد	۳۱
حضرت کے عزیز اور شاگرد خاص ذی استعداد۔ عرصہ ہوا انتقال فرمایا اور کلام تلف ہو گیا۔ (خاکسار مولف کے حقیقی ماموں تھے)	حافظ شاہ محمود علی صاحب امیٹھوی (سجادہ نشین حضرت مخدوم شاہ خداؒ)	فدا	۳۲

نمبر شمار	تخلص	نام	کیفیت
۳۳	نصیح	مولوی نصیح الزماں خانصاحب	حضرتؒ کے عزیز خاص۔ ذی استعداد و خوش گو۔
۳۴	قرار	سید تصدق حسین صاحب شاہجہاں پوری	قدیم شاگردوں میں۔ دیوان نہیں چھپا۔ مؤلف قرار اللغات قرار المحاورات۔
۳۵	قمر	منشی قمر الدین صاحب سندیلوی	اچھا کہنے والوں میں تھے۔ گلچیں میں برابر کلام چھپتا تھا۔ استاد کے ساتھ بڑی عقیدت رکھنے والے۔
۳۶	"	منشی بال کرشن صاحب لکھنوی	بی۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل۔ اچھے اور ممتاز شاگردوں میں ہیں۔
۳۷	کوثر	حکیم عابد علیصاحب خیرآبادی	شاگرد قدیم کہنہ مشق شاعر مگر دیوان غالباً نہیں چھپا۔
۳۸	مذاق	نواب محمد حسین خاں صاحب تعلقدار پریانواں	بہت ذی استعداد و خوش فکر۔ شاگرد قدیم۔
۳۹	ناظم	نواب یوسف علی خاں بہادر والی رام پور	مومن۔ غالب اور امیر کے بعد حضرتؒ سے مشورہ سخن کرتے رہے صاحب دیوان جو مطبوعہ ہے۔
۴۰	نایاب	(نام یاد نہیں آتا)	رئیس رسول پور ضلع مظفر پور صاحب دیوان جو چھپ چکا ہے
۴۱	نثار	منشی نثار حسین صاحب	مالک "پیام یار" خوش گو اور عقیدت مند شاگردوں میں۔
۴۲	نعیم	حکیم نعیم الزماں خاں صاحب	حضرتؒ کے عزیز خاص۔ ذی استعداد و خوش فکر۔ ؎ نہ تھے تیرے مرنے کے یہ دن نعیم؛ خدا جانے کس کی نظر کھا گئی (امیر) میں انھیں کی طرف اشارہ ہے۔
۴۳	نواب	نواب کلب علی خاں بہادر والی ریاست رام پور	تین دیوان اردو کے ہیں اور دو فارسی کے۔
۴۴	نیر	مولوی نور الحسن صاحب کاکوروی	خلف مولنا محسن کاکورویؒ۔ مؤلف "نور اللغات"۔
۴۵	وسیم	سید محمد عسکری صاحب خیرآبادی	بہت ہی کہنہ مشق صاحب فن، ذی استعداد اور قدیم و خاص شاگرد۔ کلام بہت ہے مگر دیوان چھپا نہیں خاکسار سے پہلے دفتر امیر اللغات کے سکریٹری بھی رہے۔

حضرت رح کے تصنیفات وتالیفات کی فہرست حسب ذیل ہے

نمبر شمار	نام کتاب	زبان	نظم یا نثر	مطبوعہ یا غیر مطبوعہ	کیفیت
۱	محامد خاتم النبیین	اردو	نظم	مطبوعہ	نعتیہ دیوان
۲	نور تجلّے	"	"	"	مثنوی پیدائش نور سراپا سرور حضرت محمد رسول اللہ صلعم
۳	ذکر شاہ انبیا	"	"	"	مسدس ذکر ولادت معراج ووفات حضرت محمد رسول اللہ صلعم
۴	صبح ازل	"	"	"	مسدس ذکر ولادت حضرت محمد رسول اللہ صلعم
۵	لیلة القدر	"	"	"	مسدس ذکر معراج حضرت محمد رسول اللہ صلعم
۶	شام ابد	"	"	"	مسدس ذکر وفات حضرت محمد رسول اللہ صلعم
۷	ابر کرم	"	"	"	مثنوی حکایات اولیاء اللہ
۸	شیدائے رسول	"	"	غیر مطبوعہ	مثنوی۔ ایک عاشق رسول کا قصہ
۹	قصۂ اویس قرنی رضہ	"	"	"	"
۱۰	مرآة الغیب	"	"	مطبوعہ	دیوان عاشقانہ (اول)
۱۱	صنم خانۂ عشق	"	"	"	" (دوم)
۱۲	گوہر انتخاب	"	"	"	" مفردات
۱۳	جوہر انتخاب	"	"	"	" "
۱۴	مثنوی عاشقانہ	"	"	غیر مطبوعہ	مثنوی میر حسن کی بحر میں ایک دلچسپ افسانہ ہے۔
۱۵	مضامین دل آشوب	"	"	مطبوعہ	چھ واسوختوں کا مجموعہ ہے۔
۱۶	واسوخت	"	"	غیر مطبوعہ	یہ ساتواں واسوخت ہے۔
۱۷	دیوان فارسی	فارسی	"	"	
۱۸	کبوتر نامہ	اردو	"	"	مثنوی واجد علی شاہ طاب ثراہ کے کبوتروں کی تعریف میں۔
۱۹	خیابان آفرینش	"	نثر	مطبوعہ	ذکر پیغمبر آخر الزماں محمد رسول اللہ صلعم صحاح ستہ وغیرہ معتبر کتب سے
۲۰	نماز کے اسرار	"	"	"	نام سے ظاہر ہے۔
۲۱	زاد الامیر	"	"	"	ہر مطلب اور ہر کام کے لیے دعائیں (احادیث سے)

نمبر شمار	نام کتاب	زبان	نظم یا نثر	مطبوعہ یا غیر مطبوعہ	کیفیت
۲۲	وظیفۂ جلیلہ	اردو	نثر	مطبوعہ	صبح و شام کی ادعیہ مسنونہ موافق احادیث۔
۲۳	ہدایۃ السلطان	فارسی	”	”	واجد علی شاہ طاب ثراہ کے ایک متن کی شرح۔
۲۴	ارشاد السلطان	”	”	”	ایضاً
۲۵	نغمۂ قدسی	”	”	غیر مطبوعہ	شرح صوت المبارک مولفۂ واجد علی شاہ (فن موسیقی میں)
۲۶	بہار ہند	”	”	”	اردو کا لغت فارسی زبان میں۔
۲۷	امیر اللغات	اردو	”	مطبوعہ	اردو کا لغت حصۂ اول و دوم (لغات الف ممدودہ و مقصورہ الف)
۲۸	امیر اللغات	”	”	غیر مطبوعہ	حصۂ سوم (لغات بائے عربی)
۲۹	سرمۂ بصیرت	فارسی	”	”	اس لغت میں عربی فارسی اور اردو کے ان الفاظ سے بحث کی گئی ہے جو غلط مستعمل ہیں یا مختلف فیہ ہیں
۳۰	انتخاب یادگار	اردو	”	مطبوعہ	شعرا کا تذکرہ (حسب ارشاد نواب خلد آشیاں لکھا تھا جس کی بابت ایک خط میں حضرت ثاقب کو لکھا ہے مجکو حالات تاریخی در انتخاب اشعار میں ایسی مداخلت تھی جیسے قلم کو دست کاتبین
۳۱	جان تاریخ	”	”	غیر مطبوعہ	عربی۔ فارسی اور اردو کے ہم عدد الفاظ اسمیں مجتمع کئے گئے ہیں
۳۲	گنجینۂ قوافی	”	”	”	الف سے یا تک قوافی مجتمع کئے ہیں
۳۳	رمز الغیب	فارسی	”	”	علم جفر میں ایک رسالہ ہے
۳۴	رموز غیبیہ	”	”	”	ایضاً
۳۵	رسالہ بحث اعداد حروف تہجی	”	”	”	تاریخ گوئی سے متعلق جن حروف کے اعداد میں اختلاف ہے۔ اُن کی تحقیق ہے۔
۳۶	محاورات مصادر اردو	اردو	”	”	نام سے ظاہر ہے
۳۷	ست سیا بہاری	”	”	”	سات سو ہندی اشعار کا ترجمہ

ان کے علاوہ بہت سے قصاید، قطعات، مسدسات، غزلیں، رباعیاں، مثنویاں سہرے، سلام اور تاریخیں وغیرہ غیر مطبوعہ ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حصۂ دُوم

آج کل اردو کے شعرائے متقدمین اور متاخرین عموماً اور ناسخ و آتش، امیر و رشک خصوصاً مورد عتاب و ہدف ملامت ہو رہے ہیں۔ ایسے زمانے میں امیر مینائی کی شاعری پر اپنی رائے ظاہر کرنے کی ہمت تو نہ پڑتی تھی مگر ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ اُن کی شاعری ہے اور اسی فن میں وہ روشناس خلق ہو کر مشہور زمانہ ہوئے تو انصاف پسند طبائع کے سامنے جن کے دل میں متقدمین و متاخرین شعراے اردو کے خون جگر کھانے اور ان کی جاں کاہی کا درد ہے امیرؔ کی شاعری کو پیش کرنا ہی پڑا۔

امیرؔ کو ہر صنف شاعری پر یکساں پوری قدرت تھی۔ قدما میں مصحفی مرحوم اور متقدمین متاخرین میں سے ذوقؔ مغفور کے بعد یہ قدرت مبدا، فیاض نے اسی ذات گرامی کو عطا فرمائی بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ اپنے ارشاد "فضلنا بعضکم علیٰ بعض" کی عمدہ مثال طبقۂ شعرا میں امیرؔ سے قایم کر دی۔

امیرؔ کبھی میرؔ تھے تو کبھی میرزاؔ۔ کبھی جرأتؔ تھے کبھی ناسخؔ و آتشؔ۔ کہیں صباؔ و سحرؔ کہیں رندؔ و وزیرؔ۔ الفاظ کی شوکت متانت کے ساتھ بندش کی صفائی اور خوش اسلوبی، عمدہ صفات، نادر تشبیہات، دل نشین استعارات مصطلحات و محاورات (جن کو زبردستی اور بے موقع موزوں کر دینے کی کوشش نہیں کرتے تھے) اخلاق و اصول کی باتیں، تصوف، روزمرہ، شوخی، درد، معاملہ، ادابندی اور اُن میں نزاکت خیال تمام شاعرانہ لطائف سے ان کا بیش بہا کلام مالا مال ہے۔ قافیہ جس طرح کا مضمون چاہتا تھا ان کی لطافت طبع اسی طرح کا مضمون اُسے عطا کرتی تھی۔ وہ شعر میں ایک نہ ایک لفظ ایسا رکھدیتے تھے کہ بلاغت کا دریا بہنے لگتا تھا اور فصاحت کا سمندر موجیں مارتا تھا۔ غرض مشاطۂ طبع نے عروس سخن کو بیش بہا لباس اور خوشنما زیور سے جس میں قیمتی جواہر جڑے ہیں آراستہ پیراستہ

کرکے ہر صفت بنا دیا ہے۔ یہ اوصاف شاعری اُن کے کلام کو بالاستیعاب دیکھنے سے نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان عالم واجد علی شاہ طاب ثراہ کے عہد تک لکھنؤ میں امیرؔ کو شعر وسخن کے لیے کافی وقت ملتا تھا۔ ذوق وشوق اس فن کی طرف بڑھا ہوا اور یہی مشغلہ زیادہ رہتا تھا مگر رام پور میں بعہد نواب فردوس مکاں اس میں کمی ہوئی اور نواب خلد آشیاں کے عہد میں سرکاری کاموں میں زیادہ مصروفیت رہنے لگی۔ اس کے بعد خلد آشیانی گلزار سخن میں خزاں آگئی۔ عنادل خوشنوا اپنی اپنی طرف اڑ گئے۔ مالی مشکلات بڑھ گئیں تندرستی گھٹ گئی۔ امیر اللغات کی تالیف میں انہماک ہوا۔ اپنے خاندانی مشاغل کی طرف رجحان ہو گیا۔ شعر وسخن سے شوق ورغبت کے بجائے نفرت سی ہو گئی۔ ان سب باتوں پر اگر خیال کیا جائے تو اُن کے کلام کی قدر انصاف کے دل میں دوچند[1] ہو جاتی ہے۔ یہ کہدینا کہ "تاہم صنم خانۂ عشق کی جلوہ آرائی گلزار داغ کی شادابی کو نہیں پہنچی" شاید ایک نادانستہ بے انصافی ہے۔

اسی طرح یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ امیرؔ شاعر پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ انھوں نے اپنے آپ کو اپنے علم وفضل کے زور سے شاعر بنا لیا تھا۔ اول تو یہ دعوے ہی نہایت کمزور ہے۔ جو شخص قدرتاً شاعرانہ طبیعت لے کر نہیں آیا وہ کبھی اپنے آپ کو ایسا قادر الکلام شاعر بنا ہی نہیں سکتا۔ دنیا میں ایک سے ایک بڑھ کر عالم وفاضل ہستیاں گزری ہیں مگر ان میں سے بہت سی ایسی ہیں جنھوں نے ایک بھی شعر نہیں کہا برخلاف اس کے بہت سی نظریں ایسی ملیں گی جو شاعر ہیں مگر علم وفضل کے اعتبار سے ناقص۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شاعرانہ دل ودماغ اور طبیعت کی موزونی صرف قدرتی عطیہ ہے اور کسی کے بس کی بات نہیں جس کو خدا نے یہ نعمت عطا کی ہے وہی شاعر ہو سکتا ہے۔ خود حضرتؔ کے دو بڑے بھائی جو کسی طرح اُن سے علم وفضل میں کم نہ تھے شاعر نہیں ہوئے حالانکہ جس ماحول میں امیرؔ کی پرورش ہوئی اُسی میں اُن دونوں کی بھی۔ پھر آخر وہ کون بات تھی جس نے صرف امیرؔ ہی کو شعر وسخن کی طرف متوجہ کر دیا۔ اس کے علاوہ

---

[1] میری ایک غزل پر اصلاح دی اور فرمایا "ممتاز۔ تم میں وہی عیب ہے جو تمھارے استاد میں ہے" "استاد میں عیب" میں نے سنتے ہی پوچھا "حضرت وہ کیا؟" فرمایا "بے مشقی"۔

واقعات شاہد ہیں کہ حضرت امیرؒ نے بچپن سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ ابر آتا ہے ہر بار برستا نہیں پانی ؛ اس غم سے مرے آنسوؤں کی ہے یہ روانی ۔ یہ شعر اس وقت کا ہے جب امیرؒ کا نواں سال تھا اور بحیثیت طالب علم ابتدائی کتابیں پڑھ رہے تھے ۔ اس پر بھی کوئی یہ کہے کہ امیرؒ فطرتاً شاعر نہ تھے تو اس کا کیا علاج ۔

اسی ضمن میں یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ امیرؒ بہت سے کمالات رکھتے تھے اور انھیں بحیثیت شاعر نمایاں نہ ہونا چاہیئے تھا اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو شخص اپنے اندر علم و فضل کے اور خصوصیات رکھتا ہو اُسے شاعر نہ ہونا چاہیئے اور یہ کمالات شاعری کے منافی ہیں ۔ مجھے یہ بھی ایک بے تکی سی بات معلوم ہوتی ہے اس لیئے کہ صرف امیرؒ پر کیا منحصر ہے بہت سی ایسی مقتدر اور مقدس ہستیاں گزری ہیں جو علم و فضل اور تقدس و بزرگی میں امیرؒ سے بھی زیادہ بلند مرتبہ رکھتی ہیں لیکن اتنا ہی نہیں ہوا کہ انھوں نے شعر و سخن کی طرف توجہ کی بلکہ اس فن میں نمایاں حیثیت حاصل کی اور ان کا یہی کمال زباں زد عوام و خواص ہوا ۔ مثال کے طور پر مولنائے رومؒ اور حضرت خسروؒ کو لے لیجیئے ۔ خواص جانتے ہیں کہ یہ بزرگ ہستیاں صرف شاعر نہ تھیں بلکہ اور بہت سے اوصاف کی حامل تھیں لیکن عوام سے پوچھیئے تو وہ یہی کہیں گے کہ ایک نے مثنوی خوب لکھی ہے دوسرے کا کلام بہت مزیدار ہے اور دونوں بہت بڑے شاعر تھے ۔ امیرؒ بھی بہت سے کمالات کے جامع تھے اور خواص ان کے اس جوہر سے واقف ہیں لیکن اس کو کیا کیجیئے کہ وہ فطرتاً شاعر پیدا ہوئے ، ازل سے انھیں اور تحائف کے ساتھ یہ عطیہ بھی ملا ، وہ اپنی طبیعت کی مناسبت سے شعر کہنے پر مجبور ہوئے اور عوام میں اسی حیثیت سے ان کی شہرت مقدر ہو چکی تھی ۔ اخلاق و روحانیت کے اُس دور انحطاط میں ان کے اور کمالات کی اتنی قدر نہ ہو سکی جتنی شاعرانہ کمال کی ۔ پھر بھی جو لوگ اس کے اہل باقی تھے انھوں نے ان کے اور کمالات کی بھی داد دی اور اپنی قدر شناسی کا ثبوت دیا ۔

اسی اعتراض کے سلسلے کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ امیرؒ کے یہاں آمد نہیں ہے آورد ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ امیرؒ کے عشق مجازی کا ثبوت نہیں ملتا اور بغیر اس کے واردات اور جذبات محبت کی صحیح تصویر کھینچنا ناممکن ہے ۔ اول تو یہ دعوے ہی صحیح نہیں ۔

دنیا کی ہر زبان میں ایسے شاعر گزرے ہیں جنھوں نے جذبات نگاری میں کمال دکھایا ہے اور واردات کی ایسی سچی تصویریں کھینچی ہیں کہ ہر صاحب حال بھی نہ کھینچ سکتا اس لئے کہ دل پر کسی کیفیت کا گزر جانا اور بات ہے اور الفاظ کے جامے میں اس کی تصویر کشی اور اظہار دوسری چیز ہے۔ اس کے لیے قابلیت، استعداد اور قدرت بیان کی ضرورت ہے۔ ان میں سے اکثر شعرا ایسے نکلیں گے جنھوں نے اپنے ذاتی جذبات کی ترجمانی نہیں کی ہے یا ان کے عشق مجازی کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔ مولانائے رومؒ ہی کو لیجئے اپنی مثنوی میں عشق و محبت کے کیسے کیسے فسانے بیان فرمائے ہیں اور کس خوبی سے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ کیا یہ سب ان کے ذاتی واقعات ہیں؟ فردوسی کو دیکھئے رزم و بزم کی کیسی کیسی تصویریں کھینچی ہیں حالانکہ واقعات ذاتی کیسے چشم دید بھی نہیں شیکسپیر کے ڈراموں کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں حالانکہ سب میں دوسروں کے واقعات ہیں اور دوسروں کے جذبات و کردار کی مصوری ہے دور کیوں جایئے مولانا حالی کی "مناجات بیوہ" دیکھئے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایک بیوہ اپنے جذبات کی اس سے زیادہ صحیح مکمل اور پُر اثر ترجمانی کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر اقبال تو یہ تو یہ خدا تو نہیں لیکن جب وہ "جواب شکوہ" میں خدا کی طرف سے جواب دیتے ہیں تو ماننا پڑتا ہے کہ اللہ میاں اگر خود بھی جواب دیتے تو یہی سب کچھ کہتے۔ بات یہ ہے کہ اس کا انحصار شاعرانہ قوت پر ہے جس کو خدا کی طرف سے یہ قدرت ودیعت ہوئی ہے اس کے لئے یہ بات دشوار نہیں، چاہے ہم کو آپ کو اپنی نااہلی کے باعث محال ہی کیوں نہ معلوم ہو۔ دوسرے ہم کو آپ کو امیرؒ کے عشق مجازی کا ثبوت نہ ملنا یہ اس کے عدم وجود کی قطعی دلیل نہیں۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو ۔ ظرف عالی ہے امیر احمد مینائی کا۔ کیونکہ خود فرماتے ہیں ۔ ان شوخ حسینوں پہ جو مائل نہیں ہوتا ٭ کچھ اور بلا ہوتی ہے وہ دل نہیں ہوتا۔ اور اس قسم کے سیکڑوں اشعار ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ حسن و عشق کی کارفرمائیوں کی حقیقت خوب جانتے تھے۔ پھر کم سے کم اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ امیرؒ درد دل سے آشنا تھے اگر عشق مجازی نہیں رکھتے تھے تو عشق حقیقی رکھتے تھے۔ ان کی قوت متخیلہ و شاعرانہ پر یہ بات سونے پر سہاگے کا کام کرتی تھی۔

غلط فہمی اور لاعلمی سے کہیے یا بے انصافی سے عام طور پر یہ بھی خیال کر لیا گیا ہے کہ امیرؔ کی شاعری صرف ناسخ ورشک وغیرہ کے رنگ کی ہے۔ تشبیہات و استعارات اور رعایت لفظی وغیرہ کے سوا اس میں جدت اور سوز و گداز کا نام نہیں۔ آخر زمانے میں انھوں نے داغ کا رنگ مقبول دیکھ کر اس کی تقلید کی۔ ان غلط فہمیوں کا ازالہ میں آگے چل کر کروں گا اور حسب موقع تفصیل سے لکھوں گا۔ یہاں صرف اتنی گزارش ہے کہ فارسی ترکیبوں کو چھوڑ کر جہاں تک تشبیہات و استعارات، مضامین و تخیل اور انداز بیان وغیرہ کا تعلق ہے امیرؔ نے بہت سی جدتیں کی ہیں اور فرسودہ مضامین میں نئی جان ڈالی ہے۔ اسی طرح تصوف اور درد و تاثیر وغیرہ سے بھی ان کا کلام خالی نہیں البتہ ان جواہر پاروں کو نظر غور سے دیکھنے اور ڈھونڈھنے کی ضرورت ہے۔

اب میں ان کے کلام سے ہر صنف شاعری کے نمونے علیحدہ علیحدہ لکھوں گا۔

غزل

امیرؔ کے نعتیہ کلام سے مجھے ابتدا کرنا چاہیئے۔ جہاں تک مجھے علم ہے امیرؔ کے معاصرین نے نعت میں دو دو چار چار قصیدے یا غزلیں کہی ہیں مگر اُن کا پورا دیوان "محامد خاتم النبیین" موجود ہے جس میں قصیدے، غزلیں، رباعیاں، مسدس، مخمس سبھی اصناف سخن ہیں۔ نعتیہ غزلوں میں امیرؔ نے شاعری سے گو بہت کم کام لیا ہے۔ لیکن پھر بھی نازک خیالی اور شاعرانہ لطافت کے بیش بہا نمونے جابجا نظر آتے ہیں۔ وہ اکثر نماز کے بعد جا نماز ہی پر بیٹھے بیٹھے نعت کہتے تھے اور اسی ذوق و شوق میں درد دل سے جو کچھ موزوں ہو جاتا اس کو سعادت و ثواب سمجھتے تھے۔ میلاد کی محفلوں اور سماع کی مجلسوں میں ان کے اشعار سن کر محبوب خدا سے عشق رکھنے والے تڑپتے رہتے ہیں۔ سچ ہے ؎

درد دل درد آشنا جانے ۔۔۔ کوئی بے درد ہو تو کیا جانے

(از محامد خاتم النبیین)

ساجد وہ ہیں اللہ ثنا خواں ہے ہمارا ۔۔۔ ابروئے نبی قبلۂ ایماں ہے ہمارا
بیاں کیا ہو شہنشاہ عرب کی شان شوکت کا ۔۔۔ فلک جس کے در دولت پہ نقارہ ہے نوبت کا

اسی پردے میں حسرت گرد بھرنے کی نکل جاتی — کہ میری خاک سے بنتا حظیرہ تیری تربت کا
نہ رکھ محروم زخم عشق سے اس نیم بسمل کو — ادھر بھی اک نظر صدقہ شہیدان محبت کا
تری تیغ ادا پر اس ادا سے جان دیتا ہے — قضا منہ دیکھنے لگتی ہے مشتاق شہادت کا
کیسگی حشر میں زلف مسلسل آپ کی بڑھ کر — کہ میں ہوں سلسلہ عفو سیہ کاران امت کا
ترے جلوے کی حسرت رہ گئی مشتاق کو تیرے — نقاب اُلٹی تو پردہ پڑ گیا آنکھوں پہ حیرت کا

جھونکا جو کوئی آئے مدینے کی ہوا کا — ٹھنڈا ہو کلیجا ترے مشتاق لقا کا
بیمار ہوں میں الفت محبوب خدا کا — اس درد میں ملتا ہے مزا مجکو دوا کا
ہو عشق نبی میں جو شہادت مجھے حاصل — دے آب دم تیغ مزا آب بقا کا
بے جام پیے ہو گئے ہم حشر کے دن مست — کوثر پہ ہمیں ساقی کوثر نے جو تاکا

دونوں عالم کے بکھیڑوں سے چھڑا دے یا رب — اپنے محبوب کو اک بار دکھا دے یا رب
لاکھوں مشتاق ہیں جی بھر کے نظارہ کریں — پردہ جو بیچ میں حائل ہے اٹھا دے یا رب
خلش درد محبت میں بڑی لذت ہے — اور اس درد کو پہلو میں بڑھا دے یا رب
زندگی ہند میں حسرت سے ہوئی ہے آخر — اب تو وہ روضۂ پر نور دکھا دے یا رب

مر جاؤں تو مرنا مجھے راس آئے الٰہی — مرقد ہو تہ سایۂ دیوار محمدؐ
اس درد میں لذت ہے حیات ابدی کی — یا رب کبھی اچھا نہ ہو بیمار محمدؐ

جب مدینے کا مسافر کوئی پا جاتا ہوں — حسرت آتی ہے یہ پہنچا میں رہا جاتا ہوں
قافلے والے چلے جاتے ہیں آگے آگے — مددا اے شوق کہ پیچھے میں رہا جاتا ہوں

یا رب ترے محبوب کا دامن ہاتھ آئے — اس سایے میں محشر کا تماشا دیکھوں
دل کہتا ہے جاتا ہوں مدینے کی طرف — رو کے تو کوئی راہ میں اچھا دیکھوں
جن آنکھوں سے دیکھا ہے وہ روئے گلگوں — ان آنکھوں سے کیا خون تمنا دیکھوں

مدینے میں دل پر داغ اپنا لے کے جاتا ہوں — بڑی سرکار کے دربار کی ڈالی لگاتا ہوں
کچھ ایسا ولولہ ہے راہ میں شوق زیارت کا — کہ دل بڑھتا ہے ہاتھوں جب قدم آگے بڑھاتا ہوں
تصدق اس عنایت پر میں اس اعجاز کے صدقے — کہیں ہوں آپ لیکن میں تو اپنے دل میں پاتا ہوں

بسی ہے یاد ان رخسار ہائے پاک کی دل میں | میں ان پھولوں سے اپنا جامۂ ہستی بساتا ہوں
الٰہی وہ بھی دن آئے کہ اس در تک پہنچ جاؤں | کہیں ممدوح الا میں تم آؤ میں پردہ اٹھاتا ہوں

آنکھوں میں ہے گھر دلمیں مرے جائے مدینہ | ان تین مدینوں میں ہے ماوائے مدینہ
یہ بس گئی ہے دل میں تمنائے مدینہ | ہر سانس سے آتی ہے صدا ہائے مدینہ
آنکھیں ہوں یہ محو رخ زیبائے مدینہ | کعبے کو بھی دیکھوں تو نظر آئے مدینہ
ہے وصل میں بھی شوق نہی وصل کا باقی | کہتا ہوں مدینے میں بھی میں ہائے مدینہ
سو جان سے اس بیخودی شوق کے صدقے | جب آپ سے باہر ہوے دیکھ آئے مدینہ

وہ گردش کرا ے آسمان مدینہ | کہ یہ سر ہو اور آستان مدینہ
مدینے میں اک اک سے میں پوچھتا ہوں | کہاں ہے وہ بانکا جوان مدینہ
یہ ہے رشک دلکو کہ قاصد جو بھیجوں | بتاؤں نہ ہرگز نشان مدینہ
فصاحت ہے صدقے بلاغت ہے قرباں | کچھ ایسی ہے پیاری زبان مدینہ
امیر اس پہ کیونکر نہ ہو جان صدقے | کہ جان دو عالم ہے جان مدینہ

مدینے جاؤں پھر آؤں دوبارہ پھر جاؤں | تمام عمر اسی میں تمام ہو جائے
شکستہ لاکھ ہو دل بادۂ ولا نہ گرے | یہ شیشہ ٹوٹ بھی جائے تو جام ہو جائے

یا خدا جسم میں جب تک کہ مری جان رہے | تجھ پہ صدقے ترے محبوب پہ قربان رہے
دین و دنیا میں جو پایا وہ وہیں سے پایا | ہم تو جس گھر میں رہے آپکے مہمان رہے
ماعرفناک سے مقصود یہ تھا حضرتؐ کا | بیخبر اپنی حقیقت سے نہ انسان رہے
قامت سرور کونین کے کشتوں میں اٹھوں | یا خدا ہاتھ مرے حشر کا میدان رہے
ناامیدی سے بچانا مرے دل کو یارب | وصل ممکن نہیں تو وصل کا ارمان رہے
ہم گنہ کر کے بھی شرمندہ نہیں کیا تھے وہ لوگ | کہ گنہ بھی نہ کیا اور پشیمان رہے
شامیانہ پر جبریل کا ہو تربت پر | کشتۂ عشق محمدؐ کی یہ پہچان رہے
کچھ رہے یا نہ رہے پر یہ دعا ہے کہ امیر | نزع کے وقت سلامت مرا ایمان رہے لہ

لہ لطیفہ:- ایک مجلس میں قوال نے یہ غزل گائی۔ مقطع کو سنکر مولانا عابد حسینؒ بولے سب کچھ تو کہہ چکے پھر ایمان کیا ہے۔

یوں تو حسن ابرو میں ہے مژگاں میں ہے گیسو میں ہے
حسن کا اعجاز لیکن نرگس جادو میں ہے

ہجر حضرت میں یہ کافی ہے مری تسکین کو
آپ کی تصویر دل میں دل مرے پہلو میں ہے

واہ رے خلق نبی بالوں میں بھی ہے میل جول
ہے یہی تو وجہ جو پیوستگی ابرو میں ہے

آپ ہو یا تم ہو دونوں میں ہیں تکلف کے خطاب
مشرب عشاق میں تو جو مزہ ہے تو میں ہے

دھیان رہتا ہے اسی کا یاد رہتا ہے وہی
بڑھ کے سب ذکروں سے لذت مجکو ذکر ہو میں ہے

امیرؔ کی عاشقانہ[۱] غزل رنگ رنگ کے خوشبو پھولوں کا ایک گلدستہ ہے۔ اور بیش قیمت جواہر کا ایک گنجینہ۔ "گلستاں کا" "بیاباں کا" اس زمین میں ایک گریباں ہی کے قافیے کو لیجئے۔ کیسے کیسے گل کھلائے ہیں۔ ہر رنگ کے شعر ہیں ؎

نہیں سودا فقط یوسفؑ کو اسکے دور داماں کا
گدا ادریسؑ بھی ہے کوچۂ چاک گریباں کا

جنوں ہے مجکو اک پردہ نشیں کے دور داماں کا
گلا کاٹوں جو پردہ فاش ہو چاک گریباں کا

چھپا ہے عیب عریانی سے رخت جسم عریاں کا
مرا داغ جنوں پیوند ہے میرے گریباں کا

ستمگر تونے[۲] نہیں کنٹھے میں اپنے گوکھرو ٹانکا
نکل آیا ہے جوہر صاف شمشیر گریباں کا

مرے ہی سامنے دامن اٹھا کر ناز سے چلنا
مجھی سے پھر گلہ الٹا مرے چاک گریباں کا

نہ ہوگا بند جب تک نقد جاں باقی ہے قالب میں
سخی کے گھر کا دروازہ ہے چاک اپنے گریباں کا

معاف اے شیخ دھوکے میں اڑائیں دھجیاں میں نے
ترے خرقے پہ مجکو شک ہوا اپنے گریباں کا

دھواں اٹھتا ہے داغ آتشیں سینہ سے ایسا
کہ چھپ جاتا ہے بدلی میں ہلال اپنے گریباں کا

---

۱ ان کا ارشاد تھا کہ سنگلاخ اور مشکل زمینوں میں غزل کہنے سے گریز کرنا چاہیئے۔ کوہ کندن و کاہ بر آوردن سے کیا فائدہ۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی مجبوری سے آپ بھی ایسی زمین میں غزل کہتے تھے جیسے ؎

باتیں حکمت کی کہیں سب کو ملے پھول سے پھول
آج کچھ ہم نے سوا ابکی جو معمول سے پھول

کہیں کوتاہ بھی ہو جا صفت عمر بہار
تنگ اے قصۂ بلبل ہیں ترے طول سے پھول

پندرہ شعر ہیں اور قریب قریب سبھی قافیے کہے ہیں۔

۲ وہ زمانہ آتا جاتا ہے کہ لوگ پوچھیں گے "کنٹھا کسے کہتے ہیں؟" "گوکھرو کیا چیز ہے اور ٹانکنے کے کیا معنی؟" جیسے اب مجھ سے ایک صاحب نے دریافت کیا "قبا عبا اور چپکن میں کیا فرق ہے؟"

نظر آیا وہ چہرہ ہوتے ہوتے رہ گئی وحشت — اٹھائی اُس نے چلمن رہ گیا پردہ گریباں کا
کہاں ساماں تھا وحشت میں کہ نامہ یار کو لکھتا — دیا قاصد کو پُرزہ پھاڑ کر میں نے گریباں کا
تردد کیا ہے تم کو یہ تو دو ٹانکوں میں اچھا ہے — عدو کا زخم دل کیا چاک ہے میرے گریباں کا

(مرآۃ الغیب)

ایک روز مفتی طالب حسن صاحب مرحوم نے فرمایا "میاں امیر سب کے رنگ میں شعر کہا کرتے ہو کبھی وزیر کے رنگ میں کچھ کہہ کے دکھاؤ تو جانیں" عرض کی "بھائی جان کبھی اس کا موقع اور وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا" اتفاق دیکھئے کہ چند روز کے بعد مشاعرے کے لیے ایسی طرح ہوئی جس میں وزیر کی غزل ہے۔ یہاں دونوں کی غزلیں لکھی جاتی ہیں۔ جس سے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ امیر نے وزیر کے رنگ کو کس قدر اپنا کر لیا ہے۔

امیر

کبھی تو بھول کے رکھدے قدم مرے سر پر — پڑا ہوں صورت نقش قدم ترے در پر
جو ذبح بھی ہو تو احساں نہ رکھ ستمگر پر — یہ ذکر خیر رہے گا زبانِ خنجر پر
وہ مست جب کبھی گزرا ہے میکدے کیطرف — بہک کے دست سبو جا پڑا ہے ساغر پر
دل شکستہ نے اُس بت کے دلکو نرم کیا — کیا ہے ٹوٹ کے شیشے نے زور پتھر پر
بزنگ سایہ رہا پائمال ساری عمر — میں جس کے پانو پڑا پانو رکھ دیا سر پر
ہوائے بوسۂ لب ہے یہی تو مرگ کے بعد — حباب بن کے رہونگا میں آب کوثر پر
ازل سے طبع ملاحت پسند رکھتا ہوں — چھڑک لیا تھا نمک میں نے شیر مادر پر
پھڑک رہا ہے مرا مرغ روح اے قاتل — کہ جوہروں نے بچھایا ہے جال خنجر پر
نگہ کو دیتے ہیں گردش جو آئنے میں یہ ترک — چھری کو کرتے ہیں در پردہ تیز پتھر پر
جو آبرو کا ہے خواہاں تو خاکساری کر — یہ قول گر دیتیمی ہے روئے گوہر پر
صف مژہ کو بھی ہے تاک چشم ساقی کی — گرے ہیں سیکڑوں مینوا ایک ساغر پر
چلا ہے نامہ مرا لیکے نامہ بر یارب — ترے حبیب کا سایہ مرے پیمبر پر
سوال سے ہے یہ نفرت نہ ہاتھ اٹھاؤں امیر — پڑھوں جو فاتحہ میں تربت تو انگر پر

دیگر

وہ ناتواں ہوں جو لیٹا کبھی میں بستر پر
گماں ہوا کہ شکن پڑ گئی ہے چادر پر
پھر ینگے حشر میں کھولے ہوئے وہ زلف دراز
بڑی بلا تو پڑے گی یہ اہل محشر پر
کچھ اس میں شان نکلتی ہے تیری مژگاں کی
نثار سو رگ جاں ایک نوک نشتر پر
ہوا تلون اہل دول سے یہ ثابت
قدم ٹھہر نہیں سکتے ہیں آب گوہر پر
میں سخت جاں ہوں وہ کرتا ہے سنگسار مجھے
خطر ہے ضرب نہ آ جائے اسکے پتھر پر
ملے جو خدمت آئینہ داری خوباں
چڑھاؤں آئینہ میں تربت سکندر پر
لئے ہے دفتر عصیاں کو کاتب اعمال
مرے گناہوں کی گٹھری ہے غیر کے سر پر
یہ مجکو حسرت دیدار یار تھی دم قتل
پس فنا نہ چڑھا خون بھی مرا سر پر
جو ایکدم کو بھی غرفے میں آپ آ بیٹھے
ہجوم خلق سے دیوار اٹھ گئی در پر
وہ ناتواں ہوں نکالے جو گھر سے یار مجھے
چلوں وہ چال کہ پہنچوں نہ حشر تک در پر
ہجوم اشک سر دانتوں کے عشق میں یہ کھلا
بندھا ہے موتیوں کا پل یہ آب گوہر پر
وہ ناتواں ہوں کہ آئے جو نیند کا جھونکا
تو اڑ کے مثل پر کاہ جاؤں بستر پر

امیر ظلمت عصیاں سے رہ گیا پردہ
عجب نقاب پڑی روئے اہل محشر پر

وزیر

وصال میں تو کرو رحم مجھ سے لاغر پر
کہو تو لیٹ رہوں ایک تار بستر پر
دہان زخم گلو سے اگر ذرا چوسوں
سمٹ کے آب ہو قطرہ زبان خنجر پر
فقیر خانے میں جو آئے بس وہیں بیٹھے
گلیم سایۂ دیوار ہے یہی در پر
تمہارے یوسف رخسار کو اگر دیکھے
درود آئینہ پڑھنے لگے پیمبر پر
ادھر ادھر رہے گھر سے ترے کبھی نہ گئے
برنگ سایہ ہیں دیوار پر کبھی در پر
پری کیطرح جو شیشے سے نکلی دختر رز
گمان بد سے دکھا ہاتھ چشم ساغر پر
وہ گرم خون ہے میرا اگر ذرا ابھر جائے
پسینا بن کے نکل آئے آب خنجر پر
جو آیا جانہ سکا ہے یہ گھر ترا دلچسپ
پڑی ہے سایے کے مانند چاندنی در پر

کیا یہ صرف تواضع قد خمیدہ نے
کہ اپنے پانو کو جا دی ہے آنکھوں پر سر پر

خطاب شاہ شہیداں عطا کرا و ظالم
ہمائے تیغ کا سایہ پڑا مرے سر پر

تری مژہ کی صفت خط میں لکھ کے چھپائے
پھری اجل کی چھری گردن کبوتر پر

اٹھی جو موج دم خندہ آب دنداں سے
بنی ہے چادر آب اس رخ منور پر

عیاں جبیں سے رگ گل ہو مثل چین جبیں
جو پانو رکھو تم اے جان جاں گل تر پر

غضب ہوا کہ بت سنگدل پہ دل آیا
خدا بچائے کہ شیشہ گرا ہے پتھر پر

خدا پرست سے کہد و ہوا میں سنگ پرست
نشان پائے نبی پڑ گئے ہیں پتھر پر

یہی سمجھ کے گلے کاٹو سخت جانوں کے
ہم اپنی تیغ کو کرتے ہیں تیز پتھر پر

نہ توڑ پانو سے مینائے مے کو اے زاہد
فلک کو دیکھ کہ شیشہ ہے کاسہ سر پر

گلوری کھاؤ کہ ہو جائیں سرخ دانت سفید
دکھاؤ آتش یاقوت آب گوہر پر

نثار کرتے ہیں آ دیکھو جان نثار کے پاس
گلے کو آپ کے خنجر پہ سر کو ٹھوکر پر

نمود خط پہ وہی ہے صفائے عارض یار
غبار آئینہ ہے خاطر سکندر پر

بنا ہے خواب اجل ان کو نام سونے کا
ہمیشہ طالب زر جان دیتے ہیں زر پر

لڑیں نہ بہر خدا مجھ سے منکر دیدار
یہ فیصلہ تو ہے موقوف روز محشر پر

نہ پوچھو وحشیوں سے کیوں کھلی ہے فصد یہ فصد
یہ خوں چکاں ہے حکایت زبان نشتر پر

تمہارے قصر مصفا کی واہ کیا ہے صفا
پھسل کے سایۂ دیوار گر پڑا در پر

نیاز نامہ چلا لے کے ناز پروردہ
کہ منتوں کی ہے چوٹی سر کبوتر پر

زمیں پہ دوڑ کے اتنا بھی آدمی نہ چلے
یہ شوخیاں نہیں اچھی ہیں دوش مادر پر

لگائی دانت پہ محبوب سبزہ رنگ نے تیغ
خضر نے ناؤ چڑھائی ہے آب گوہر پر

وزیر بعد نبی مرتضٰے نبی ہوتے
نہ ہوتی ختم نبوت اگر پیمبر پر

اسی طرح آتش مرحوم کی مشہور غزل پر جو غزلہ کہا ہے۔ ان کی پوری غزل اور امیرؔ کے جو غزلے میں سے کچھ اشعار لکھے جاتے ہیں۔ نہ جاننے والا کب یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ اشعار بھی

آتش مغفور کے نتائج فکر میں سے نہیں ہیں۔

آتش

خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری
خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری

یقیں ہے اٹکے گی جان اپنی آکے گردن میں
سنا ہے جا ہے قریب رگ گلو تیری

وہ گل ہوں میں کہ ترا رنگ جس سے ظاہر ہے
وہ غنچہ ہوں کہ بغل میں ہے جسکی بو تیری

پھرے ہیں مشرق و مغرب سے تا جنوب و شمال
تلاش کی ہے صنم ہم نے چار سو تیری

شب فراق میں اک دن نہیں قرار آیا
خدا گواہ ہے شاہد ہے آرزو تیری

دماغ اپنا بھی اے گل بدن معطر ہے
صبا ہی کے نہیں حصے میں آئی بو تیری

پڑھا ہے ہم نے بھی قرآں قسم ہے قرآں کی
جواب ہی نہیں رکھتی ہے گفتگو تیری

مری طرف سے صبا کہیو میرے یوسف سے
نکل چلی ہے بہت پیرہن سے بو تیری

فرشتے بھی تجھے کہتے ہیں بیشتر شاعر
یقیں ہوا ملک الموت میں ہے خو تیری

یہ گردش فلک پیر سے ہوا ثابت
قوی ضعیف کو کرتی ہے جستجو تیری

شراب شرم و حیا و حجاب کھو دے گی
دکھائے گا ہمیں کیفیتیں سبو تیری

رہا نہ شبہ ہمیں اسکے حلقہ ہونے سے
یہ عقدہ ناف نے کھولا کمر ہے مو تیری

ہوا جو دسترس اسکا بھی پائے قاتل تک
حنا بھلائے گا شوخی مرا لہو تیری

شب فراق میں اے روز وصل تا دم صبح
چراغ ہاتھ میں ہے اور جستجو تیری

جو ابر گریہ کناں ہے تو برق خندہ زناں
کسی میں خو ہے ہماری کسی میں خو تیری

یہ چاک جیب کے حق میں دعائے مجنوں ہے
نہو وہ دن کہ درستی کرے رفو تیری

کسی طرف سے تو نکلے گا آخر اے شہ حسن
فقیر دیکھتے ہیں راہ کو بکو تیری

چمن میں صبح کو جاکر نہ منہ دکھانا تھا
برنگ آئینہ حیراں ہے آبجو تیری

زمانے میں کوئی تجھ سا نہیں ہے سیف زباں
رہے گی معرکے میں آتش آبرو تیری

امیرؔ

گلی میں کی رگ ہر گل کی جستجو تیری
ملا نہ رنگ ہی تیرا کہیں نہ بو تیری

مہک کہاں نہیں پہنچی ہے خوبرو تیری
لباس حور میں بھی چھن رہی ہے بو تیری

قضا یہ تیغ ادا سے کسی کی کہہ آئی
کہ راہ تکتی ہے کب سے رگ گلو تیری

ہجوم یاس بہت دل میں ہے میں ڈرتا ہوں
کہ پس نہ جائے کہیں دب کے آرزو تیری

مہک رہے ہیں چمن خوب مصر کنعان کے
بسی ہے دامن یوسف میں جیسے بو تیری

نہیں ہے کچھ مجھے دھڑکا لحد کی وحشت کا
کہ ساتھ لے کے چلا ہوں میں آرزو تیری

یہیں سے طور کو جھک کر سلام کر لیتے
کلیم نے نہ سنی ہائے گفتگو تیری

کسی کا اور کوئی نام بھی نہیں لیتا
پکار میری پڑی ہے کہ چار سو تیری

اڑے ہیں بال و پر بیخودی سے ہم وحشی
تلاش کرتے ہوئے تا مقام ہو تیری

تراہی چور ہے کانٹا تراہی چور ہے پھول
اڑائی اسنے تری بو تو اس نے خو تیری

وصال سے بھی تو مٹتا نہیں ہے شوق وصال
بغل میں تو ہے مگر پھر ہے جستجو تیری

کلی کلی چمن حسن کی میں سونگھ آیا
جدا ہے رنگ میں اپنے ہر اک سے بو تیری

قدح قدح تجھے کرتا ہے یاد او ساقی
ادھر پکار پڑی ہے سبو سبو تیری

ٹپک نہ آنکھ سے اے اشک اسکی محفل میں
ملے نہ خاک میں موتی سی آبرو تیری

یہ اس کی تیغ سے کہتی ہیں حسرتیں میری
کہ ہم ہیں دل میں رسائی ہے تا گلو تیری

نہ گدگدائے بہت میرے دلکو شوق وصال
نکل کھڑی ہو نہ پردے سے آرزو تیری

چھپی ہوئی تھی تو آغوش تاک میں جب سے
لگے تھے تاک میں اے دخت رز سبو تیری

بلائیں لینے کو اس رخ کی دست شوق ہے تو
حقیقت اب کھلی اے زلف موبمو تیری

جما رہا ہوں تصور کو تیرے رو رو کر
میں یاد بھی نہیں کرتا ہوں بے وضو تیری

نہا کے اس میں نکھرتا ہے روز اس کی طرح
وہ آرسی ہے کہ اے عکس آبجو تیری

گرایا اس کو نظر سے تو آئنے نے کہا
ہے آبرو مری در پردہ آبرو تیری

صبا جولائی عروس بہار لوٹ گئی
چمن میں خوب پھلی پھولی آج بو تیری

نگاہ ناز ستم کر رہی ہے چار طرف — چمک رہی ہے یہ تلوار چار سو تیری
ترا شکار ہوں میں اور مرا شکار ہے یہ — نکل کے جائے تو اب دل سے آرزو تیری
لحد میں چھیڑ کی باتیں فرشتے کیا کرتے — یہ سب سکھائی پڑھائی ہے گفتگو تیری
یہ بار بار غش آتا نہیں مجھے شب ہجر — نکل کے آپ سے کرتا ہوں جستجو تیری
اٹھا اٹھا کے سوئے چرخ ہاتھ اے ساقی — دعائیں مانگ رہا ہے سبو سبو تیری
برنگ سایہ ترے پیچھے پیچھے پھرتا ہوں — ترے ہی پاؤں سے کرتا ہوں جستجو تیری

امیر سنتے جو آتش بھی یہ غزل کہتے
جواب ہی نہیں رکھتی ہے گفتگو تیری

یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ مرآۃ الغیب ناسخ و اسیر کے رنگ میں ہے۔ نہیں اس میں ہر رنگ کے شعر موجود ہیں۔ اس دیوان سے اشعار آگے لکھے جائیں گے۔ بات یہ ہے کہ ناسخ اور رشک وغیرہ کا جو رنگ انگشت نما ہے وہ قدما کے یہاں بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ مثال کے طور پر کچھ کچھ شعر قدما کے لکھے جاتے ہیں۔

ولی

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہونگا — جادو ہیں ترے نین غزالاں سے کہوں گا
دی حق نے تجھے بادشہی حسن نگر کی — یہ کشور ایراں میں سلیماں سے کہوں گا
مت جا چمن موں لالہ بلبل پہ مت ستم کر — گرمی سوں تجھ نگہ کی گل گل گلاب ہوگا
گلرخاں کیوں نہ کہیں تجکو سکندر طالع — جلوہ گر بر میں ترے جامۂ دارائی ہے
یاد کرتا ہے سدا مصرع زنجیر جنوں — دل بیتاب جو تجھ زلف کا سودائی ہے
مجکو ترشی کا ہے پرہیز صنم — چین ابرو کون دکھایا نہ کرو

آبرو

کم مت گنو یہ بخت سیاہوں کا رنگ زرد — سونا وہ ہے کہ ہووے کسوٹی کسا ہوا
لب شیریں پہ سر بجن کے نہیں خط سیاہ — ڈاڑھ چھوٹی ہے مٹھائی پہ شکر خوروں کی
عارض کے آئینے پر تمنا کے سبز خط ہے — طوطی اگر جو دیکھے گلزار بھول جاوے

مضمون

خط آگیا ہے اسکے مری ہے سفید ریش   کرتا ہے اب تلک بھی وہ ملنے میں شام صبح
کریں کیوں نہ شکر لبوں کو مرید   کہ دادا ہمارا ہے بابا فرید[1]

ناجی

زلف کے حلقے میں دیکھا جب سے دانہ خال کا   مرغ دل عاشق کا تب سے صید ہے اس جال کا
گندمی چہرے کو اپنے زلف میں پنہاں نکر   ہندوان سنکر مبادا شور ڈالیں کال کا

احسن

لام نستعلیق کا ہے اس بت خوشخط کی زلف   ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہوں اسلام کے

یکرنگ

جدائی سے تری اے صندلی رنگ   مجھے یہ زندگانی درد سر ہے
اس زلف کا یہ دل ہے گرفتار بال بال   یکرنگ کے سخن میں خلاف ایک مو نہیں

حاتم

دیکھ سرو چمن ترے قد کو   ہے خجل پا بگل ہے بے بر ہے
حق میں عاشق کے تجھ لباں کا بچن   قند ہے نیشکر ہے شکر ہے
خال اس کے نے دل لیا میرا   تل میں اُن نے لہو پیا میرا

آرزو

رکھے سیپارۂ دل کھول آگے عندلیبوں کے   چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے[2]
دریائے اشک اپنا جب سر پہ اوج مارے   طوفان نوح بیٹھا گوشے میں موج مارے

تاباں

بیمار ہے زمیں سے اٹھتی نہیں عصا بن   نرگس کو تم نے شاید آنکھیں دکھائیاں ہیں
جب پان کھا کے پیارا گلشن میں جا ہنسا ہے   بے اختیار کلیاں تب کھل کھلائیاں ہیں

---

[1] حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ خلیفۂ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ۔
[2] اگرچہ مطلع ہے تو اس زمانے میں شاید ایطا بھی کوئی عیب نہ تھا۔

سودا

کیونکر نہ چاک چاک گریبان دل کروں
دیکھوں جو تیری زلف کو میں دست شانہ میں

زینت دلیل مفلسی ہے ٹک کماں کو دیکھ
نقش و نگار چھٹ نہیں کچھ اسکے خانے میں

اے مرغ دل سمجھ کے تو چشم طمع کو کھول
تو نے سنا ہے دام جسے وہ ہے دانے میں

دست گرہ کشا کو نہ تزئیں کرے فلک
مہندی بندھی نہ دیکھی ہیں انگشت شانہ میں

میں بھی ہوں ضعیف اسقدر اے مور کہ وہ آب
گر ڈالے مرے سر سے جو تمے تا کمر آوے

دیتا ہے کوئی مرغ دل اُس شوخ کو سودا
کیا قہر کیا تو نے غضب تیرے پر آوے

اب لے تو گیا ہے پر اسے دیکھیو نادان
پل میں نہ اُڑا نا وہ اگر بال دے[1] پر آوے

میر

مت ممتحن باغ ہو اے غیرت گلزار
گل کیا کہ جسے آگے ترے بات کر آوے

کیا خوبی اسکے منہ کی اے غنچہ نقل کریے
تو تو نہ بول ظالم بو آتی ہے دہاں سے

کی شست و شو بدن کی جسدن بہت سی اُنّے
دھوئے ہیں ہاتھ میں نے اُسدن سے اپنی جاں سے

کیا کم ہے ہولناکی صحرائے عاشقی کی
شیروں کو اس جگہ پر ہوتا ہے قشعریرا[2]

اس کے خیال خط میں کسے یاں دماغ حرف
کرتی ہے بے مزہ جو قلم کی صریر ہو

یک بیاباں برنگ صوت جرس
مجھ پہ ہے بیکسی و تنہائی

حسن

زلف ستمگراں کا سراسر نہ ہوگا وصف
دل مت شمار کر تو غلط تار تار کا

---

[1] ایک "پر" کی رعایت سے دل کا استعارہ مرغ کے ساتھ کیا ہے۔ اور یہ قطعہ کہا ہے۔

[2] اردو میں اس جگہ رونگٹے کھڑے ہونا بولتے ہیں۔ بجرے رونگٹے تن پہ کھڑے ہوتے ہیں کانٹوں کی طرح ٭ شیر بن جاتے ہیں ساہی میرا صحرا دیکھ کر۔ ذوق ہے جسکی آواز سے ہوں رونگٹے سو ہاں کے کھڑے ٭ وہ محبت نے دیا سلسلۂ پا ہم کو۔ میر صاحب کی سادگی اور فصاحت نے یہ قافیہ بھی نچھوڑا او لغت کی رُو سے لفظ کے حرکات پر خیال کرو تو مصرع موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ قشعریرہ بضم قاف و فتح شین معجمہ و سکون عین مہملہ و کسر راء مہملہ و سکون تحتانی و فتح راء مہملہ دہا۔ ناگاہ مو بر بدن خاستن از دیدن یا تصور مکروہ (غیاث اللغات)

اس کے بعد دہلی میں شاہ نصیر مرحوم اور ان کے تتبع میں ذوق مغفور نے، لکھنؤ میں زیادہ تر ناسخ مرحوم اور ان کے مقابلے میں آتش مغفور نے اور اس زمانے میں اسی رنگ کو مقبول دیکھکر اسیر مرحوم نے بھی تشبیہات و بلند استعارات سے اسی قدیم رنگ کو گہرا بلکہ خوب گہرا کرکے اردو میں صائب وغیرہ کا رنگ دکھا دیا۔ اور بندش میں پستی، صفائی اور روانی سے نظم کو نثر سے ملا دیا۔

غالب مرحوم نے زیادہ اور مومن مغفور نے کم فارسی زبان فارسی ترکیبوں اور پیچ در پیچ خیالات سے اردو شاعری کو خواص کے لئے معمہ اور عوام کے واسطے گورکھ دھندا بنا دیا۔ اشعار کے معنی سمجھانے کی ضرورت پڑی۔ شرحیں لکھی گئیں۔ پھر بھی بعض بعض اشعار کے معانی اور مطالب میں اختلاف ہی رہا ؎ مطلب میں صفا ہو یہ تکلف ہے زباں کا ؛ دقت ہوئی معنی میں تو کیا لطف بیاں کا (زند) میرا خیال ہے کہ اسی زمانے سے معنی بند کلام دلی کے لئے باعث فخر ہوا اور لکھنؤ نے اسے پسند نہیں کیا الا ماشاء اللہ۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن اس کے باوجود غالب و مومن کے مختصر دیوان بھی لکھنؤ کے اس انگشت نما رنگ سے خالی نہیں ہیں۔ مومن مرحوم کے یہاں ایسے اشعار بکثرت ہیں۔ غالب مرحوم کا دیوان اس سے بھی زیادہ مختصر اور انتخاب کیا ہوا ہے اس لئے ان کے یہاں ایسے شعر کم ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

غالب

دل نہیں تجکو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار ؛ اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا ؛ یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا

بیاں کیا کیجئے بیداد کاوشہائے مژگاں کا ؛ کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

ہنوز اک پرتو نقش خیال یار باقی ہے ؛ دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

یک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا ؛ یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا

واں کرم کو عذر بارش تھا عناں گیر خرام ؛ گریہ سے یاں پنبۂ بالش کف سیلاب تھا

ضعف سے گریہ مبدل بہ دم سرد ہوا ؛ باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

لکھتا ہوں اسدؔ سوزش دل سے سخن گرم ؛ تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے ؛ سرگرم نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

نہ چھوڑی حضرت یوسفؑ نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوبؑ کی پھرتی ہے زنداں پر

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ
نظارے کا مقدمہ پھر روبکار ہے

یہی نہیں بلکہ یہ رنگ بھی ہے:-

کافی ہے نشانی تری چھلے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقت سفر انگشت

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پانو

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پانو داب تو دے

کیوں بولتے ہیں باغبان تونبی
گر باغ گدائے مے نہیں ہے

اگر لکھوائے کوئی اسکو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

مومن

نہ کیونکر مطلع دیواں ہو مطلع مہر وحدت کا
کہ ہاتھ آیا ہے روشن مصرع انگشت شہادت کا

ندے تیغ زباں کیونکر شکست رنگ کو طعنے
کہ صفہائے خرد پر حملہ ہے فوج خجالت کا

لے اڑی لاشہ ہوا لاغر بس تن ہو گیا
ذرۂ ریگ بیاباں اپنا مدفن ہو گیا

بن ترے اے شعلہ رو آتشکدہ تن ہو گیا
شمع قد پر میرے پروانہ برہمن ہو گیا

پانو زنداں سے اٹھے کیا سر اٹھا سکتے نہیں
حلقۂ زنجیر آخر طوق گردن ہو گیا

میرے جلنے پر جو رو دیا غیر تیری بزم میں
سوز دل کو آب اشک آتش پہ روغن ہو گیا

کیا روؤں خیرہ چشمی بخت سیاہ کو
واں شغل سرمہ ہے ابھی یاں نیل ڈھل گیا

کی مجکو ہاتھ ملنے کی تعلیم ورنہ کیوں
غیروں کو آکے بزم میں وہ عطر مل گیا

بوسہ ہائے لب شیریں کے مضامیں ہیں نہ کیوں
لفظ سے لفظ مرے شعر کا چسپاں ہوگا

دیدۂ منتظر آتا نہیں تجھ تک شاید
کہ مرے خواب کا بھی کوئی نگہباں ہوگا

بے سبب کیونکہ لب زخم پہ افغاں ہوگا
شور محشر سے بھرا اس کا نمکداں ہوگا

کچھ بھی بن آتی نہیں کیا کیجئے | اس کے بگڑنے نے کچھ ایسا کیا
جائے بھی تیری اُرے دل میں سو ہے | غیر سے کیوں شکوہ بے جا کیا

رقیبوں پر ہوئی کیا آج فرمائش جواہر کی | کہ ہیرا عاشق خط زمرد نام لیتا تھا
آہ پر دود اپنی کب زیب فلک تھی رات کو | دیدۂ مہتاب میں سرمے کا یہ دنبالہ تھا
آگ کیا ہم کو لگائی ابر نے تیرے بغیر | وقت بارش اخگر خورشید تف ہر ژالہ تھا[1]

بہر حال شاہ نصیر اور ذوق وغیرہ کا وہ رنگ نہ دہلی میں عام تھا اور نہ لکھنؤ میں ناسخ و اسیر وغیرہ کا۔ ان بزرگوں کے یہاں بھی ہر رنگ کے شعر موجود ہیں۔ جس زمانے میں شاہ نصیر اور ذوق دہلی میں یہ کہہ رہے تھے۔

نصیر

آج اگر تو نہ مکدر ہو تو یہ حیرت ہے | آئینہ صاف یہ آئین دگر گھور گیا
گھڑ بہل میں لئے وہ طفل فرنگی بوتل | سیر وگلگشت کو گلشن میں جو مخمور گیا
برق بھی تھی یہ تمامی کا نشاں لیکر ساتھ | ق رعد کا ابر بھی چھیڑے ہوئے طنبور گیا

فسانہ گر کروں اظہار اپنی شام غربت کا | گریباں تا بدامن چاک ہو صبح قیامت کا
نہیں ہے مرقد عاشق پہ حاجت شمع گریاں کی | چراغ چشم آہو ہے دیا مجنوں کی تربت کا
کٹاری کیوں نہ برگ تاک ہردم سر پہ کھینچے | چمن میں کام کیا ہے ساقیا انگشت حیرت کا

ہوا اس دہن سے رد کش سیلی صبا کی کھائی | غنچے کے آہ منہ سے کس دن لہو نہ آیا
دنداں دکھا کے مت ہنس اے بخیہ گریباں | چاک جگر کا ہم کو طور رفو نہ آیا
کیا جانے یہ گیا تھا کس منہ سے رو کشی کو | آئینہ واں سے لے کر خاک آبرو نہ آیا
موج سرشک سے ہے رونق قبائے تن کی | کیونکر کہوں کہ اس کو کارا تو نہ آیا
آخر کو کہکشاں ہی یکسر وہ مانگ نکلی | اس بات میں ہماری فرق ایک مو نہ آیا
کشتی دل تو دائم موج خطر میں ڈوبی | چیں بر جبیں ہو کس دن وہ رد برو نہ آیا

[1] ان اشعار کے لکھنے سے غالب مغفور اور مومن مرحوم پر اعتراض یا ان کی اہانت مقصود نہیں۔ ان کا مرتبہ شاعری اپنی جگہ پر مسلمہ ہے۔ صرف عرض یہ کرنا ہے کہ ایسے حضرات بھی رنگ زمانہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

اپنی بھی بعد مجنوں یارو ہوا بندھی ہے — لے گرد باد خیمہ کب کو بکو نہ آیا
نامحرموں سے تم نے کھلوائے بند محرم — میں تو بھی آہ لے کر کچھ آرزو نہ آیا

ذوق

یاں تک عدو زمانہ ہے مرد دلیر کا — چھلکے ہیں منہ شکار کیے پر بھی شیر کا
مجنوں کی روح دشت میں مانند گرد باد — کرتی طواف تھی ترے مجنوں کے ڈھیر کا
چھوڑا نہ ایک دانۂ اختر سحر تلک — گردوں کو لگ گیا جو مزہ شب ٹھنگیر کا
کوٹھے پہ اُن کے خوب بجے آج رات کو — تھا ہاتھ آگیا جو سہارا منڈیر کا
تجکو یوسف سے کیا حسن میں برتر پیدا — گر کیا اس کو پیمبر تجھے کافر پیدا
ہو جہاں کشتۂ مژگاں کا تمہارے مدفن — عوض سبزہ ہو واں خاک سے نشتر پیدا
خط ترے شعلہ رخسار پہ ہے معجز حسن — ورنہ ہو سبزہ بھلا آگ پہ کیونکر پیدا
خاک دل سوختہ یک مشت ہو گر صرف چمن — ہو ویں غنچوں کی جگہ باغ میں اخگر پیدا
درفشاں وقت سخن ہیں لب رنگیں تیرے — ہوتے گویا ہیں یہاں لعل سے گوہر پیدا
تیرہ بختی بھی اسی دن اپنی روشن ہو گئی — روئے تاباں پر تمہارے جب تھا تل پیدا ہوا
غیر کے چھلے سے واں تو نے جو گل کھائے تو یاں — داغ تازہ داغ دل کے متصل پیدا ہوا
اس لب لعلیں پہ ہے یہ جلوہ گر رنگ مسی — یا کہ نافرمان و لالہ مشتمل پیدا ہوا
رشک سے اس زلف کے کیا مشک ہی یکسر ہے خوں — بلکہ جلکر سوختہ عنبر بھی سارا ہو گیا
تھا تو یہاں ہیچ پر اس لب کے سامنے — سب مول تیرا لعل بدخشاں پہ گیا
سادہ رخوں سے کی جو محبت تیری تھی یہ ادہ لی — منہ چڑھکر اُس شوخ کے اپنا کالا منہ اے خال کیا
آگئیں تم کو لگانی انگلیوں پر فندقیں — نوک مژگاں پر مرے اشک جگر گوں دیکھکر
کہیں فلک پہ نہ چڑھ جائے چاند جھومر کا — کہ دور آپ کو کھینچے ہے تیرے سر چڑھکر
کیونکہ نکلے تیر اسکا دلمیں پیکاں چھوڑکر — جائے بیٹھے کو کہاں یہ مرغ پراں چھوڑکر
صید دل کو کیونکہ چھوڑے جبکہ دکھلائے ہے تو — مچھلیاں دست حنائی میں مری جاں چھوڑکر
سرخی پاں دیکھ لے زاہد جو دنداں پر ترے — اٹھ کھڑا ہو ہاتھ سے تسبیح مرجاں چھوڑکر

سایۂ سرو چمن تجھ بن ڈراتا ہے مجھے   سانپ سا پانی میں لے سرو خراماں چھوڑ کر
ہوگیا طفلی ہی سے دلمیں ترازو تیر عشق   بھاگے ہیں مکتب سے ہم اوراق میزاں چھوڑ کر
شوق ہے اسکو بھی طرز نالۂ عشاق سے   دمبدم دیکھے ہے منہ سے دود قلیاں چھوڑ کر

جب وہ پوچھے کہ ہے غش کون مری چتون پہ   میں کہوں میں۔ تو کہے میں کے چھری گردن پر
تیرے دنداں مسی زیب کی دیکھی جو بہار   پڑ گئی اوس سی گلشن میں گل سوسن پر [۱]

اسی زمانے میں لکھنؤ میں آتش و ناسخ و آسیر یہ کہہ رہے تھے۔

آتش

حسن پری اک جلوۂ مستانہ ہے اس کا   ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اس کا
گل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش   بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اس کا
گریاں ہے اگر شمع تو سر دھنتا ہے شعلہ   معلوم ہوا سوختہ پروانہ ہے اس کا
جو چشم کہ حیراں ہوئی آئینہ ہے اسکی   جو سینہ کہ صد چاک ہوا شانہ ہے اس کا
دل قصر شہنشہ ہے وہ شوخ اسمیں شہنشاہ   عرصہ یہ دو عالم کا جلوخانہ ہے اس کا
یوسف نہیں جو ہاتھ لگے چند درم سے   قیمت جو دو عالم کی ہے بیعانہ ہے اس کا
آوارگی نکہت گل ہے یہ اشارہ   جامے سے وہ باہر ہے جو دیوانہ ہے اس کا

دہن پر ہیں اُن کے گماں کیسے کیسے   کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے
زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا   بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا   مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے
نہ مڑ کر بھی بیدرد قاتل نے دیکھا   تڑپتے رہے نیمجاں کیسے کیسے
ترے کلک قدرت کے قربان آنکھیں   دکھائے ہیں خوش رو جواں کیسے کیسے
کرے جس قدر شکر نعمت وہ کم ہے   مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

ناسخ

پونچھتا اشک اگر گوشۂ داماں ہوتا   چاک کرتا میں جنوں میں جو گریباں ہوتا

[۱] ذوق کا مختصر دیوان میں نے دیکھا صدہا شعر اسی رنگ کے ہیں۔

اپنی صورت کا وہ دیوانہ نہوتا تو کیوں
پانوں میں سلسلۂ گیسوئے پیچاں ہوتا

ایک دم یار کو بوسوں سے نہ ملتی فرصت
گر دہن دیدۂ عالم سے نہ پنہاں ہوتا

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے
آج آتی شب فرقت میں تو احساں ہوتا

کیا قوی ہے یہ دلیل اسکی پریزادی کی
ربط انسان سے کرتا جو وہ انساں ہوتا

کہہ رہا ہے جرس قلب بآواز بلند
گم ہو رہبر تو ابھی راہ خدا پیدا ہو

ہم ہیں بیمار محبت یہ دعا مانگتے ہیں
مثل اکسیر نہ دنیا میں دوا پیدا ہو

یاں کچھ اسباب کے ہم بندے ہی محتاج نہیں
نہ زباں ہو تو کہاں نام خدا پیدا ہو

بوسہ مانگا جو دہن کا تو وہ کیا کہنے لگے
تو بھی مانند دہن اب کہیں نا پیدا ہو

ابھی خورشید جو چھپ جائے تو ذرات کہاں
تو ہی پنہاں ہو تو پھر کون بھلا پیدا ہو

اسیر

جلوہ دکھلا ہمیں اے دختر رز جوش میں آ
کنج خم سے نکل جام کے آغوش میں آ

کس سے کہتا ہے یہ اے دل مرے آغوش میں آ
نحن اقرب بھی ہے کچھ یاد تجھے ہوش میں آ

شمع مہتاب ہوئی رونق فانوس فلک
تو بھی اے ماہ مرے ہالۂ آغوش میں آ

محتسب دیکھ کہ یہ دل ہے ہمارا وہ لہو
چور شیشے کو نکر مے نہ گرا ہوش میں آ

صاف دل گوشۂ عزلت میں نہوگا زاہد
ایک دن حلقۂ زندان قدح نوش میں آ

ہجو مے کرتا ہے زاہد یہ کہو پینے سے
منہ سے شیشے کے نکل جلد مرے گوش میں آ

گناہ غیر مجھے باعث حجاب ہوا
شراب پی جو کسی نے میں آب آب ہوا

جو نامہ یار کا انکار وصل میں آیا
ہماری شان میں وہ آیۂ عذاب ہوا

دہان یار کا مضمون نشے میں سوجھا
چراغ راہ عدم ساغر شراب ہوا

جواب خط نہ لکھا اس صنم نے تو نہ لکھا
خدا کے گھر سے تو قاصد ہمیں جواب ہوا

گلہ نہیں مجھے صیاد نے جو قدر نہ کی
چھٹا قفس سے جو میں باغباں کو خواب ہوا

خانۂ عیش مرا کلبۂ احزاں نہ ہوا
خواب کب آنکھوں میں آیا کہ پریشاں نہوا

پھیر لائے در واعظ سے ہمیں حضرت عشق
خیر گزری کہ دماغ اپنا پریشاں نہوا

نفرت خلق جو مجھ سے ہے یہی درباں ہے — غم نہیں ہے جو میسر مجھے درباں نہوا
دل ہمارا ہے کہ جسمیں ہے نہاں لغت زنفت — ورنہ آئینے سے اک تل بھی پنہاں نہوا
اسکے دامن سے مرے خون کا دھبا دھوتا — تجھ سے اتنا بھی تو اے دیدۂ گریاں نہوا

اسی زمانے میں (جسے آج کچھ کم سو برس ہوئے) روزمرہ اور کلام میں شوخی و بے تکلفی معاملات۔ ادابندی۔ تیور۔ بانکپن وغیرہ ناسخ اور آتش کے شاگردوں کا حصہ ہو گیا تھا جس طرح باہم باتیں کرتے ہیں وہ اسی طرح شعر کہتے تھے اور محاورات تو گویا برستے تھے۔

صبا تلمیذ آتش

دلمیں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے — بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیئے کیا یاد آیا
بوسہ دے کر وہ صبا کہتے ہیں — یاد رکھیئے گا یہ احساں میرا
واعظ کے میں ضرور ڈرانے سے ڈر گیا — جام شراب لائے بھی ساقی کدھر گیا
بلبل کہاں بہار کہاں باغباں کہاں — وہ دن گزر گئے وہ زمانہ گزر گیا
جھوٹوں کا بادشاہ کہوں اے صنم تجھے — یہ حال ہے کہ بات کہی اور مکر گیا
وار ہر دم جو یونہی تیغ جفا کا ہوگا — یہ تو کہیئے کوئی مرجائے گا تو کیا ہوگا
جم گیا زنگ جو ساقی کا بہار گل میں — در یہ میخانے کے زاہد کا مصلا ہوگا
نقد دل ہائے چرا کر بت پرفن کیسا — چپکا بیٹھا ہے جھکائے ہوئے گردن کیسا
نالے کرتا ہوں تو شرما کے وہ فرماتے ہیں — یہ بھی کچھ بات ہے چپ بھی رہو شیون کیسا
یہ نہ سمجھے ہم کہ یہ بیگانہ ہے — جان کھوئی دل کو اپنا جان کر
شامیانہ منعموں کو چاہیئے — ہم بسر کرلیں گے کمل تان کر
گلشن بھی ہے شراب بھی ہے ابر تر بھی ہے — یادش بخیر یار کو لائیں کہاں سے ہم
باقی رہے نہ فرق زمین آسمان میں — اپنا قدم اٹھالیں اگر درمیاں سے ہم
واعظ ترے بیاں کو ہمارا سلام ہے — سن لیں گے چار شعر کسی کی زباں سے ہم
یارب وہ دور مے ہو کہ زاہد بھی یہ کہیں — باہر نہیں ہیں بیعت پیر مغاں سے ہم
فصل گل ہے زاہدوں کو غم ہے میکش شاد ہیں — مسجدیں سونی پڑی ہیں بھٹیاں آباد ہیں

چپ نہ ہو جایئے شکوہ مرا کرتے کرتے
کیا ہوا کچھ تو بیاں کیجئے کیونکر کس دن؟

جفا و جور کا شکوہ نہیں کیا جاتا
نہیں نہیں مجھے کچھ آپ سے ملال نہیں

بھر دیا مجھ فقیر مست کا جام
ساقیا تو ہو اور دنیا ہو

معلوم ہیں واعظوں کی باتیں
اس سے کہیں جو نہ جانتا ہو

ابر آیا ہے دل تڑپتا ہے
کہیں بھٹی کلال کی ہوتی

حیف میں ان کا آئنہ نہ ہوا
خوب ہی دیکھ بھال کی ہوتی

عشق کہتے ہیں جسے وہ موت کا پیغام ہے
اونگھتے کو کچھ نہیں ہے دیر سو جاتے ہوئے

ہائے اب کیا کیجئے سمجھائیں دل ناکام کو
ان سے ہم کہتے رہے کہ جاؤ کچھ جاتے ہوئے

نزع میں ہم ہیں وہ کیوں ایسے میں آجاتے نہیں
فائدہ پھر قبر پر آئے جو پچھتاتے ہوئے

ہمت خدا جو دے تو محبت کا لطف ہے
کیا بات ہے جو ناز کسی کا اٹھایئے

کس طرح ہجر صنم میں کوئی دل کو سمجھائے
یہ کہاں سے کوئی پتھر کا کلیجا لائے

زہر لگتی ہیں شب وصل میں شر کی باتیں
کچھ تمہیں خیر ہے لو اور بکھیڑا لائے

ہم اسے قاتل نہایت سخت جاں ہیں
چھری جاتی رہے گی باڑھ پر سے

منہ چھپانے سے ترے دم مرا گھبراتا ہے
چپ نہ ہو جا مرے باتوں کے بنانے والے

حال دل شب کو جو کہنے کو گئے فرمایا
لیجئے آئے مری نیند اڑانے والے

دیکھئے تیوری چڑھائی ہے تو تقصیر معاف
گدگدا کر بھی ہنساتے ہیں ہنسانے والے

نشۂ مے میں کبابوں کا مزہ کیا جانیں
بدمزہ لوگ غم حشر کے کھانے والے

سحر تلمیذ ناسخ

بو کبابوں کی[1] غضب آتی ہے میخانے سے
اک بھگت ہوتا ہے ہر روز مسلمان نیا

حور بھی خلد میں ہوگی تو بس ایسی ہوگی
آج ان پریوں میں دیکھا ہے اک انسان نیا

ہنس کے کچھ بات جو کی دید یئے لاکھوں گویا
ہے ان احسان فراموشوں کا احسان نیا

کب ہاتھ سرھانے سے ہٹایا نہیں جاتا
کب ہم پہ شب وصل میں تکیا نہیں اٹھتا

[1] اسکو اب ہوٹلوں میں دیکھئے۔

اب نہ وہ تم ہو نہ وہ ہم ہیں نہ وہ دل نہ وہ آنکھ[ل] — آپ بھی چوک گئے ہم نے بھی دھوکا کھایا[لے]
من و سلوے بھی ملے روز تو نفرت ہو جائے — آج بھی کھائیں گے کل بھی غم زدا کھایا

دل نے پھر دل سے راہ پیدا کی — چھپ کے جانے کا راستا نکلا
دل سے نکلے دعا وہ بات کرو — کیا جو منہ سے بُرا بھلا نکلا
سڑی سودائی ہوں ہمیشہ کا — آج اس کوچے میں بھی آ نکلا

استخارہ جو سحر وصل پہ واجب آیا — مسکرا کر وہی کنٹھا مرے منہ پر مارا

دونوں گیسو ہیں پریشاں سچ کہو دل کیا ہوا — آپ نے مجھ سے بھی کھویا اس سے حاصل کیا ہوا
سچ ہے مرتا ہوں کہ جنت میں ملیں حوریں مجھے — سب کا دیوانہ بنا اک تم پہ مائل کیا ہوا
بے بلائے کوئے جاناں میں چلے آئے سحر — یہ تو دیوانے ہیں لیکن تجھکو اے دل کیا ہوا

گو کہ آہو کی بھی آنکھیں ہیں بڑی — ہائے یہ چتون کہاں سے لائے گا
آنکھیں دی ہیں دیکھنے کے واسطے — دیکھیں گے جو کچھ خدا دکھلائے گا
کہدو ناصح سے سحر گھر میں نہیں — مفت میں بک بک کے سر کھا جائے گا

قرض پیر مغاں ادا کرنا — میرا قاتل جو خوں بہا دے گا

بتوں کی ہے خداوندا شکایت — یہاں ہے شکر در پردا شکایت

اُتر کے کاسۂ مے عرش سے ہوا موجود — فقیر مست نے جس دم کہا کہ یا موجود
دل آپ لیجئے حاضر میں کچھ نہیں حجت — ہمیشہ دیدیا سائل کو جو ہوا موجود

بتیس دانتوں میں ہے مقید اسی لئے — آئے نہ جس میں تیری شکایت زبان پر

بن گئے انجان کیسے جان کر — جان کھوئی دل کا کہنا مان کر
چشم میگوں نے انھیں نادم کیا — محتسب دوڑے شرابی جان کر

شب وصال میں جو سر اٹھے تو رنگ جمے — چلو یہی سہی تم جیتے اور ہارے ہم

چار اگر ہیں متفق باہم تو دیں ہے نفاق — دل ملے آنکھیں ملیں مرضی مگر ملتی نہیں
چار آنکھیں جب ہوئیں چو رنگ دل کا ہو گیا — بس جبھی تک خیر ہے جبتک نظر ملتی نہیں

ل یہ اس زمانے تک جائز تھا۔

مرتے ہیں آؤ بہر عیادت تو دیکھ لیں ۔۔۔ پھر کیا کرینگے لیکے تمھیں جب ہمیں نہیں

عرش کے تارے تو یہ ہیں سامنے ۔۔۔ اے قمر جس وقت جو ارشاد ہو

کوئی کہتا نہیں وہاں کا حال ۔۔۔ گو ملی ہے زبان کہنے کو

قید کے ساتھ ہے یہ آزادی ۔۔۔ گھر بنایا ہے بیٹھ رہنے کو

سچ کہو گریۂ شبنم پہ بھی روئے ہو کبھی ۔۔۔ باغ میں خندۂ گل پر تو ہنسا کرتے ہو

یہ نہ کہئے گا کہ دھوکے سے لیا ہے دلکو ۔۔۔ ہم کہے رکھتے ہیں پہلے سے دغا کرتے ہو

دل دیا اللہ نے صدمے اٹھانے کے لئے ۔۔۔ ہم فقط پیدا ہوئے تھے آزمانے کے لئے

شور محشر کم نہ تھا کچھ نیند اڑانے کے لئے ۔۔۔ آپ بھی آئے لحد پر غل مچانے کے لئے

جیتے جی کوئی ہوا پرساں نہ میرے حال کا ۔۔۔ قبر میں آئے ملک باتیں بنانے کے لئے

خوبصورت کے مرض بھی خوبصورت ہوتے ہیں ۔۔۔ درد سر پیدا ہوا صندل لگانے کے لئے

سچ تو یہ ہے ہر کسے را بہر کارے ساختند ۔۔۔ دل تو آنے کیلئے ہے جان جانے کے لئے

پردۂ غیب بھی چلمن ہے کسی کمرے کی ۔۔۔ سب کو تم دیکھو نہ دیکھے تمھیں اصلا کوئی

چلے تھے تو مڑ کر ادھر دیکھ لیتے ۔۔۔ کہ ہم اور بھی اک نظر دیکھ لیتے

اگر آنکھ میں سات پردے نہ ہوتے ۔۔۔ نہ دیکھا تھا جو وہ بشر دیکھ لیتے

نہ دیکھا جو تجکو تو عالم یہ دیکھا ۔۔۔ نہ کچھ دیکھتے پھر اگر دیکھ لیتے

یہ بات کیا ہے سب کو دہن میں کلام ہے[1] ۔۔۔ میں بھی سنوں کچھ آپ تو ارشاد کیجئے

ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہے ۔۔۔ یہ سب کچھ ہوا ہم اکیلے رہے

دو ہی باتوں میں طے کیا قصہ ۔۔۔ بوسہ لے بھی لیا مکر بھی گئے

پھر وہاں یاد عاشقوں کی ہوئی ۔۔۔ کوئی کہتا تو تھا سحر بھی گئے

بناتے ہو مختار مجبور کر کے ۔۔۔ ابھی دیکھ لی بس عدالت تمھاری

وہ رند کاہے کو ہے جس کو فکر فردا ہے ۔۔۔ یہاں تو روزوں میں رکھتے نہیں سحر کیلئے

کہتے ہیں حال جدائی جو کسی شب کہئے ۔۔۔ مختصر کیجئے اس قصے کو مطلب کہئے

[1] داغ نے کہا ہے ؎ آئینہ دیکھ کے دو مجکو گالیاں ۔ تم کو بھی تو یقیں ہو کہ پیدا دہن ہوا۔

بادہ نوشی کی جب آئی ہے بہار اے ساقی — کچھ انھیں روزوں میں اکثر رمضاں ہوتا ہے
نسخۂ مے بھی کم از نسخۂ اکسیر نہیں — ہر برس پیر مغاں پھر سے جواں ہوتا ہے

کیوں بشر نعمت دنیا کی ہوس کرتے ہیں — روز کھانے کے لیے کیا غم عقبےٰ کم ہے
ہاتھ جینے سے اٹھانا ہے امیروں کا سلام — بندگی کرنی ہو ہم کو تو خدا کیا کم ہے

طفل بھی کہتے نہیں حال وہاں کا آکر — پیر تو بھول گئے دیر ہوئی آئے ہوئے
دیکھکر چشم سیہ جو کڑی بھولے ہیں ہرن — گرد نیں ڈالے ہوئے جاتے ہیں کترائے ہوئے

برسے تو آب رحمت شیشوں میں بھر کے رکھوں — مے کا شگوں تو ہے ہر چند مے نہیں ہے
دیکھو کہیں سحر سے بے جا ہنسی نہ کرنا — انسان کی طبیعت قابو میں ہے نہیں ہے
غول کے غول چلے آتے ہیں پرسے کیلئے — گھر میں یہ دھوم دھڑکا ہے لحد سونی ہے

وزیر تلمیذ ناسخ

کہا آئینہ قد آدم ہے — جب سراپا مجھے حیراں دیکھا
کی نگہ چشم فنا سے جس دم — اپنے گھر آپ کو مہماں دیکھا
بادشاہی کی تمنا نہ رہی — جب سوئے گور غریباں دیکھا

جب خفا ہوتا ہے تو یوں دل کو سمجھاتا ہوں میں — آج ہے نامہرباں کل مہرباں ہو جائے گا

سر مرا کاٹ کے پچھتائیے گا — کس کی پھر جھوٹی قسم کھائیے گا
تھام لوں دل کو ذرا ہاتھوں سے — ابھی پہلو سے نہ اٹھ جائیے گا
کہئے یاران عدم کیا گزری — کچھ لب گور سے فرمائیے گا
کم بھی دینے میں بہت فائدہ ہے — بوسہ اک دیجئے دس پائیے گا
کہکے پانوں سے چلے یار کے گھر — ہم جو اٹھنے لگیں سو جائیے گا
ہم نے یوسف جو کہا کیوں بگڑے — مول لے گا کوئی بک جائیے گا
ہم بھی آنکلیں گے مسجد میں وزیر — خشت خم لے کے جو بنوائیے گا

سر جھکائے رہا سدا گردوں — کیا کیا تھا جو شرمسار رہا
اٹھ گیا یار میرے پہلو سے — درد پہلو میں یادگار رہا

ناز نے دی نہ رخصت آگے اُسے — دو قدم جب مرا مزار رہا
اگر پوچھے وہ بربادی ہماری — صبا کہدیجیو کچھ خاک اڑا کر
ذبح کرنا تو ہمیں اے صیاد — یہ نہ کہنا کہ رہا کرتے ہیں
کبھی ہوتی ہے جو اُن سے رنجش — آپ ہم اپنا گلا کرتے ہیں
منہ نظر آتا ہے آئینے وہ رخسارے ہیں — اپنی بھی دید ہے اور ان کے بھی نظارے ہیں
پڑا ہے تفرقہ بیتابیوں سے — ذریراب میں کہیں ہوں دل کہیں ہے
پھر نکل آوں لحد سے سر کٹانے کے لئے — بھیج دیکھو عمر رفتہ کو بلانے کے لئے [1]

رند تلمیذ آتش

دید لیلےٰ کیلئے دیدۂ مجنوں ہے ضرور — میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا
اختیاری نہیں ہر بار بنے ایسی شکل — کھنچ گیا صانع ایجاد سے نقشا تیرا
بھولا ہی بھلا چھوڑ کے اٹھ جاؤں چمن کو — اللہ دکھائے مجھے عالم نہ خزاں کا
چہرے سے عیاں ہوتا ہے جو حال ہے دلکا — خاموشی عاشق میں بھی عالم ہے بیاں کا
شہرہ ہے بڑا آپ کی شیریں دہنی کا — دو منہ میں ذرا ذائقہ چکھوں میں زباں کا
دن عید کے للہ پلائے کئی ساغر — ساقی نے دیا فطرہ یہ ماہ رمضاں کا
اک عمر سے ہے زندگی اور موت میں جھگڑا — قصہ نہیں چکتا یہ بکھیڑا ہے کہاں کا
جس جس طرح سے چاہا مرا امتحاں کیا — اب تو یقیں ہوا تجھے کیوں دل سے شک گیا؟
لکھدیا وصل ہجر کی جا سرنوشت میں — اتنا نہ سہو کاتب تقدیر سے ہوا
جلد آتی وہ تو کیوں میں گلا اپنا کاٹتا — خوں مجھ پہ میرا مرگ کی تاخیر سے ہوا
نہ کرتی موت اگر ہجر میں مسیحائی — میں کس کے پاس لیے درد لا دوا جاتا
ہمارے آپکے بس آج سے ہنسی موقوف — ذرا سی بات میں غصہ ہے تم کو آجاتا
جان دینی تھی اگر جانے نہ دینا تھا اسے — دل میں رہ رہ کے ہوں واللہ پشیماں ہوتا
تونے عریاں ہی رکھا مجکو فلک خوب کیا — میں بھی پھیلاتا ترے آگے جو داماں ہوتا

[1] ان کا دیوان یہاں موجود نہیں ہے اس وجہ سے چند ہی شعر لکھ سکا۔

رنگ خوں اشک بار ہا لایا آج لخت جگر بہا لایا
خاک چھنوائی اسکے کوچے کی بیٹھے بٹھلائے دل اٹھا لایا
حیف بازار دہر میں اے رندؔ کیا میں لینے گیا تھا کیا لایا

کشتۂ فرقت کیا تقدیر نے یوں قضا آئی رضینا بالقضا

کرتا ہوں اسطرح سے بسر کوئے یار میں در سے اٹھا دیا پس دیوار رہ گیا
پائی خبر جو آمد فصل بہار کی کیا پھڑپھڑا کے مرغ گرفتار رہ گیا
جوش جنوں ہے جامہ دری میں کمی نہو پھر رہ گیا جو زیح کے کوئی تار رہ گیا
ہے ترک عشق پر بھی وہی کاوش مژہ دل میں کھٹک رہا ہے کوئی خار رہ گیا

احباب کو کیا کام یہ کیوں پوچھتے ہیں رندؔ جاتا ہوں میں اس کوچے میں اب یا نہیں جاتا

کفن بھی ہو گیا میلا دھرے دھرے اے تو تمام عمر ہوئی کب تک انتظار کریں
ستم شعار جفا پیشہ بے مروت ہے سراہیے جگر ان کے جو تجکو پیار کریں

عبث نہ تیز کرا و ترک خنجر و شمشیر نگاہ بس ہے کلیجا نکال لینے کو

قضا لے آئی ہے اہل قبور مجکو بھی جگہ دو تھوڑی سی یارو ذرا ذرا سر کو

مے پیو تم سرور ہو مجکو ہاتھ سے میرے ایک جام تو لو
مے پیو جو نہیں پلاتے ہو مجکو دیتے نہیں ہو جام تو لو

کون بتلائے کسے یاد ہے ہجراں کا دن مدتیں گزریں یہ جا مجھے بیمار پڑے
ماجرا شب کا تو فرمایئے کیا صحبت تھی ہیں کہیں پھول کہیں ٹوٹے ہوئے ہار پڑے

ہجر میں جان رہی یا گزری رند کہو تم پر کیا گزری
گزرے جس دم ہم دنیا سے ہم نے جانا دنیا گزری
کس سے کہیئے کون سنے گا کیا کیا گزرا کیا کیا گزری
وقت مرگ یہ جی میں گزرا زندگی اپنی بے جا گزری

وعدے پہ تم نہ آئے تو بیٹھے ہم نہ مر گئے کہنے کو بات رہگئی اور دن گزر گئے
کہتے ہیں رندؔ رات کو کچھ کھا کے مر گئے عاشق تھے اپنی جان سے آخر گزر گئے

رو کر کہا جو میں نے کہ مرتا تھا میری جان
ہنس کر دیا جواب کہ پھر کیوں نہ مر گئے

احوال کس سے پوچھئے یاران رفتہ کا
وہ بھی نہ پھر کے آئے جو لینے خبر گئے

لکھ پڑھ کے لو تو جان بھی دیتا ہوں میری جان
یہ وہ نہو کہ دل کو لیا اور مکر گئے

بے وجہ ہر اک بات میں شر کرتے ہو صاحب
کچھ خیر تو ہے آج طبیعت کدھر آئی

حساب کر کے شب وصل فرض کر لینا
اب آج تو کوئی بوسہ علی الحساب ملے

ناز وہ بار بار کرتا ہے
جانتا ہے کہ پیار کرتا ہے

کیوں مکرتا ہے تو کسی کو دلا
پیار کرتا ہے پیار کرتا ہے

طبیعت کو تسکین دم بھر نہیں
الٰہی یہ کیونکر سنبھل جائے گی

نہ کھلواؤ میری زباں چپ رہو
کوئی بات منہ سے نکل جائے گی

واہ پر آپ کا اجار اکیا
ہم بھی آنکلیں گے گلی ہی تو ہے

نا شگفتہ رہا یہ غنچۂ دل
نہ کھلی اے صبا کلی ہی تو ہے

وقت بد میں کہاں انیس و جلیس
کون دے ساتھ بیکسی ہی تو ہے

مرض عشق کا رفتہ رفتہ بڑھا
جو سوچے ہوئے تھے وہ اے دل ہوئی

یہ ہیں تینوں بیماریاں جاں گسل
محبت ہوئی دق ہوئی سل ہوئی

وہ مزے اب نہیں ملتے تری بیباکی میں
لطف اٹھے جو تری شرم و حیا سے پہلے

کچھ کرونگا میں بھی پھر خدمت میں عرض
چپکے رہیئے منہ نہ اب کھلوائیے

اس تمہیدی طول کلام کے بعد میں مطلب پر آتا ہوں کہ ہوش سنبھالتے ہی امیرؔ کو لکھنؤ میں انھیں اساتذۂ متاخرین کی صحبت نصیب ہوئی کہ وہ انھیں کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ اور امیرؔ کا بھی اصلی مذاق سخن یہی تھا[1]۔ فرماتے ہیں ع بے تکلف ہو تو ہم شعر و سخن پر غش ہیں۔ کوئی معشوق ہو مبیاختہ پن پر غش ہیں۔ لیکن خواجہ وزیرؔ کے ہمسایہ تھے اس کے ساتھ ہی اسیرؔ سے تلمذ تھا۔ زیادہ تر

[1] غالباً ۱۸۹۶ء میں ایک غزل میں نے کہی تھی ع یار کب تک نہیں لیتا ہے خبر دیکھیں تو۔ اس کے شعروں میں "دیکھیں تو" ردیف چکی ہوئی اور مختلف پہلوؤں کے تیور تھے۔ منشی صاحبؔ نے تحریر فرمایا کہ ایسی ہی ردیفوں کی زمین تلاش کر کے اور غزلیں کہو۔ ۱۸۹۹ء میں ایک دن میں نے ان کی یادداشت کی کتاب پر (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۱ پر)

انھیں کی خدمت میں فیضیاب رہتے تھے (آسیر کے یہاں بندش کی صفائی اور روانی تو بے مثل تھی مگر اور باتوں میں وہ ناسخ کے ہم مشرب وہمسر تھے) اس لیئے "مرآۃ الغیب" اور "صنمخانے" میں اس رنگ کے بھی شعر ہیں۔

بے شک لکھنؤ میں اُس وقت عموماً ناسخ ہی کا رنگ چوکھا خیال کیا جاتا تھا۔ امیرؔ کو بھی مجبوراً اس رنگ کے شعر زیادہ کہنا پڑتے تھے۔ اس کے بعد رام پور میں بھی ان کی شاعری کو آسیر منیر اور بحر وغیرہ کی شاعری سے سابقہ پڑا تھا اس لیئے وہاں بھی اس رنگ کے شعر کہتے تھے مگر یہ جو اکثر حضرات کہتے رہتے ہیں کہ امیرؔ نے داغ کے رنگ کو مقبول عام دیکھکر "صنمخانے" میں وہی رنگ اختیار کیا یہ کہنا ان کا صحیح نہیں ہے کیونکہ

(۱) صنمخانے کی جن غزلوں پر ایسا خیال کیا جائے وہ اُس وقت کی کہی ہوئی ہیں جب آسیر اور بحر وغیرہ رحلت کر چکے تھے۔ ان کے رنگ میں بھی کہتے تو سُناتے کسے اور داد پاتے کس سے؟ اب امیر کی طبیعت اپنے اصلی رنگ و فطری مذاق سخن میں شاعری کے لیے آزاد تھی۔

(۲) زمانے کی نظروں سے اب وہ رنگ بالکل گر گیا تھا اور عام طور پر سحر۔ رند اور صبا وغیرہ کا رنگ شعرا نے اختیار کر لیا تھا (اور فنون کے مثل شاعری میں بھی مقتضیات زمانہ خیال کیا جائے مگر امیرؔ کے لیئے داغ کی تقلید ہی کہی جائے۔ یہ تعصب طرفداری یا کم سے کم ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا ہے۔)۔

(۳) داغ کے رنگ میں ابھی چمک بھی نہ آئی تھی کہ امیر کا اصلی رنگ اپنی بہار دکھانے لگا تھا ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی دہلی کے استادوں کے اشعار لکھنؤ میں اور لکھنؤ کے استادوں کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۰) یہ غزل لکھی دیکھی میں نے کہا یہ غزل اس پر کیوں لکھی ہے۔ مہدی علی خاں مرحوم نے بتایا کہ نواب خلد آشیاں کو یہ غزل سنائی تھی اس لیئے لکھ لی تھی۔ میں نے ایک غزل کہی ع تم نے کیا دیکھنے والوں کا تماشا دیکھا۔ اس میں بھی مختلف تیوروں سے ردیف کے چمکانے کا کوئی پہلو بزعم خود چھوڑا نہ تھا۔ اصلاح دی تو یہ شعر بڑھا دیا ؎ دیکھتے دیکھ لیا مجکو تو جھنجھلا کے کہا: دیکھئے دیکھئے۔ چھپ کر مجھے۔ اچھا دیکھا۔

ایک غزل میں میرا شعر تھا ؎ یہ واعظ بدمزہ کہتا ہے مے کو جنتی ہو کر: مجھے معلوم ہوتا ہے اُدھر ایسی ہی ہوتی ہے۔ فرمایا کہ یہ نہایت گستاخی اور بے ادبی ہے مگر کیا کروں "اُدھر ایسی ہی ہوتی ہے" یہ ٹکڑا شعر کاٹنے نہیں دیتا۔

لہ ؎ پچھلا کلام بھی ہے جو اس میں شریک آمیر + دیواں میں اب کا رنگ کہیں ہے کہیں نہیں۔

اشعار دہلی میں پہنچتے تھے اور دونوں جگہ کے شعرا کبھی کبھی اُن پر طبع آزمائی بھی کرتے تھے۔
عہد واجد علی شاہ طاب ثراہ میں سراج الدین بہادر شاہ ظفر جعل الجنتہ مثواہ کی اس غزل کا
لکھنؤ میں چرچا ہوا ؎

کیا کہوں دل مائل زلف دوتا کیونکر ہوا | یہ بھلا چنگا گرفتار بلا کیونکر ہوا
جنکو محراب عبادت ہو خم ابروئے یار | ان کا کعبے میں کہو سجدہ ادا کیونکر ہوا
نامہ بر خط دیکے اس نوخط کو تونے کیا کیا | کیا خطا مجھ سے ہوئی اور وہ خفا کیونکر ہوا
خاکساری کیا عجب کھودے اگر دلکا غبار | خاک سے دیکھو کہ آئینہ صفا کیونکر ہوا
تیرے دانتوں کے تصور سے نہ تھا گر آبدار | جو بہا آنسو وہ دُر بے بہا کیونکر ہوا
جو ہونا تھا ہوا ہم پر تمھارے عشق میں | تم نے اتنا بھی نہ پوچھا کیا ہوا کیونکر ہوا
وہ تو ہے نا آشنا مشہور عالم میں ظفر | پر خدا جانے وہ تجھ سے آشنا کیونکر ہوا ؎[1]

جس پر اُسی زمانے میں امیرؔ نے غزل کہی تھی۔ چند شعر یہ ہیں ؎

کچھ نہ پوچھو دلربا مجھسے جدا کیونکر ہوا | دیکھو دل سا آشنا نا آشنا کیونکر ہوا
اے مسیحا میرے دشمن ہوں شفا سے ناامید | تو سلامت درد میرا لا دوا کیونکر ہوا
وجہ حیرت اہل دنیا میں ہے اپنا حال دل | ایسے بیدردوں میں یہ درد آشنا کیونکر ہوا
ہوش میں آبد حواس اتنا نہ رو تا ہے کیوں | نامہ بر قصہ بیاں کر کیا ہوا کیونکر ہوا
ناز اٹھائے میں نے پالا میں نے حضرت کون ہیں | دل اگر میرا نہیں ہے آپ کا کیونکر ہوا
جیتے جی برسوں میں تڑپا تب لی تم نے خبر | مرگئے پر پوچھتے ہو کیا ہوا کیونکر ہوا
میں نہ مانونگا کہ دی اغیار نے ترغیب قتل | دشمنوں سے دوستی کا حق ادا کیونکر ہوا
اُسنے کھینچی تیغ یاں سر جھک گیا قصہ مٹا | خلق یہ کیوں پوچھتی ہے ماجرا کیونکر ہوا
داور محشر کو بھائی میری انکی چھیڑ چھاڑ | چھیڑ کر پوچھا کہ کیا ہوا کیونکر ہوا لغیب (مرآۃ ا)

اُسی زمانے کی ایک اور غزل کے چند شعر لکھتا ہوں ؎

روز حشر ایسی جلن ہوگی دل محرور میں | بھاگ کر ڈوبے گا دوزخ چشمۂ کافور میں

[1] دیکھئے اس غزل میں بھی لکھنؤ کا انگشت نما رنگ موجود ہے۔

خاکساروں کی ہے ذلت دیدۂ مغرور میں ❊ مال کیا ظرف گلی ہے مجلس فغفور میں
گور میں چونکا کے یہ عبرت پکاری بار بار ❊ ہوشیاری شرط ہے غافل شب دیجور میں
نزع کے وقت آدمی سے ہل سکیں کیا ہاتھ پاؤں ❊ شام کو باقی نہیں رہتی سکت مزدور میں
ہے اگر گردوں مخالف غم نہیں مجکو امیر ❊ ہوں میں ظل دامن شاہ ابوالمنصور میں [۱]

بھلا کوئی کہے گا کہ یہ دونوں غزلیں ایک ہی شاعر کی ہوئی ہیں۔ اس غزل میں بھی دو چار شعر اپنے خاص رنگ کے کہہ گئے ہیں ؎

کیوں نہ موسےٰ کو خطر ہو شوق برق طور میں ❊ مشکلیں پڑتی ہیں سالک کو حجاب نور میں — تصوت
شیخ کو تھوڑا نہ جانو یہ بڑا مکار ہے ❊ ساری دنیا چھوڑ بیٹھا ہے تلاش حور میں — شوخی
منزل مقصود کی مستوں کو دکھلاتی ہے راہ ❊ خضر بن بیٹھی ہے سبزی دانۂ انگور میں — ؍؍
اُن سے کہتی ہے حیا اتنا جو میرا پاس تھا ❊ نور بنکر چھپ رہے ہوتے نگاہ حور میں — تیور
(طرۃ الغیب) فرش استبرق کی کچھ حاجت نہیں اے باغباں ❊ بادہ کش ہیں پڑ رہیں گے سایۂ انگور میں — ؍؍

نواب فردوس مکاں کے عہد میں میرزا نوشہ کی غزل پر امیرؔ نے جو غزل کہی تھی وہ اُس عہد کے حالات میں حصۂ اول میں لکھی جا چکی ہے۔ اُسی زمانے میں نواب برور کی غزل پر مصرعے لگائے تھے۔ چند گرہیں یہ ہیں :۔

ہیں سب بناوٹیں ہمیں نقرے نہ دیجئے ❊ ساقی صبح ہو تو صبوحی نہ پیجئے
دوڑ اپنے نہ ہاتھ کو بوسے نہ لیجئے ❊ آجائے کوئی دم میں تو کیا کچھ نہ کیجئے
عشق مجاز و چشم حقیقت نگر غلط

صاحب کہو وہ بات کہ ہو کچھ تو دلنشیں ❊ جس کا نہ سر نہ پانو ہو اسکا ہو کیا یقیں
اس جھوٹ کی ہے بندہ نواز انتہا کہیں ❊ سینے میں اپنے جانتے ہو تم کہ دل نہیں
ہم کو سمجھتے ہو کہ ہے ان کی کمر غلط

شیطان بھی تمھارے فریبوں سے مات ہے ❊ تم دن کو دن کہو تو میں سمجھوں کہ رات ہے
اظہار ذوق قتل کی ساری یہ گھات ہے ❊ کہنا ادا کو تیغ خوشامد کی بات ہے
سینے کو اپنے اسکی سمجھنا سپر غلط

---

[۱] واجد علی شاہ طاب ثراہ —

تم لاکھ قسمیں کھاؤ نہ مانوں گا میں کبھی | کیا جان اپنے ہاتھ سے کھونا ہے دل گی
ناداں بنا رہے ہیں ہمیں آپ واہ جی | مٹھی میں کیا دھری تھی کہ چپکے سے سونپ دی

جان عزیز پیشکش نامہ بر غلط

عیاریوں سے بھی کوئی ہوتا ہے نیکنام | صاحب یہی ہے مکر تو بندے کا ہے سلام
یہ کون بک رہا ہے اگر تم ہوئے تمام | پوچھو تو کوئی مر کے بھی کرتا ہے کچھ کلام

کہتے ہو جان دی ہے سر رہگزر غلط

اس بیوفا کو عشق جتانے سے کیا ملا | الزام اٹھائے بیٹھے بٹھائے ہزار ہا
کہتا نہ تھا امیر کہ اظہار ہے بُرا | یہ کچھ سنا جواب میں ناظم ستم کیا

کیوں یہ کہا کہ دعوئے الفت مگر غلط (مرآۃ الغیب)

اسی غزل پر داغؔ مرحوم نے بھی مصرعے لگائے[1] ہیں جن کا درج کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ دونوں کا فرق دیکھئے اور انصاف کیجئے کہ شوخی و بے تکلفی، زبان اور روزمرہ وغیرہ کا لطف کس کے یہاں زیادہ ہے۔

ہاں بے بسی میں جرم و خطا کچھ نہ کیجئے | تسلیم و عاجزی کے سوا کچھ نہ کیجئے
ظاہر سوائے مہر و وفا کچھ نہ کیجئے | آجائے کوئی دم میں تو کیا کچھ نہ کیجئے

عشق مجاز و چشم حقیقت نگر غلط

معدوم تو وہ شے ہے جسے لاکھ نکتہ چیں | ثابت کریں ہزار وہ ثابت نہو کہیں
یہ بات کیا ہے دل تو نہو اور ہو حزیں | سینے میں اپنے جانتے ہو تم کہ دل نہیں

ہم کو سمجھتے ہو کہ ہے اُس کی[2] کمر غلط

کیا ہو یقیں جو کوئی کہے دن کو رات ہے | ہم جانتے ہیں ہیچ ہے بے شبہ گھات ہے
ایسے مبالغے سے غرض التفات ہے | کہنا ادا کو تیغ خوشامد کی بات ہے

سینے کو اپنے اس کی سمجھنا سپر غلط

---

[1] یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ "مرآۃ الغیب" سنہ ۱۲۹۰ھ میں" اور گلزار داغ" سنہ ۱۲۹۶ھ میں طبع ہوا ہے۔

[2] "گلزار داغ" میں یوں ہی چھپا ہے اور مرآۃ الغیب میں اُس طرح۔ ناظم کا دیوان موجود نہیں ہے۔

اک آہ سرد بھر کے کیا طور بے خودی		اس کو دیا یہ دم کہ تجھے جان نذر کی
لوٹنے والے ہوتے ہیں ایسے ہی تو نخی		مٹھی میں کیا دھری تھی کہ چپکے سے سونپ دی

جان عزیز پیشکش نامہ بر غلط

اعجاز تو نہیں کہ جو قائل ہوں خاص و عام		گر کیجئے شعبدہ ہے محبت، تو بس سلام
اب امتحاں سہی چلو قصہ ہوا تمام		پوچھو تو کوئی مر کے بھی کرتا ہے کچھ کلام

کہتے ہو جان دی ہے سرا سر ہرگز غلط

جو عرض کی تھی داغ نے آخر وہی ہوا		کوئی خفا ہو آپ کو ہے چھیڑ کا مزا
دیکھا نہ آخر آج وہ بدخو برس پڑا		یہ کچھ سنا جواب میں ناظم ستم کیا

یہ کیوں کہا کہ دعوئے الفت مگر غلط

(۴) "مرآۃ الغیب" میں بھی صدہا شعر جہاں اُس رنگ کے ہیں وہاں صدہا شعر اس رنگ کے ہیں۔

(۵) لکھنؤ میں جو کچھ کہا تھا وہ بھی ایک پورا دیوان تھا مگر افسوس ہے کہ غدر کی مصیبت میں تلف ہو گیا۔ کچھ غزلیں مل سکیں اور جن غزلوں کے شعر زیادہ یاد آئے اور شعر کہکر پوری کیں وہ سب "مرآۃ الغیب" میں چھپی ہیں جو سنہ ۱۲۹۰ھ میں طبع ہوا۔ باقی متفرق اشعار کا ایک مجموعہ تو سنہ ۱۲۸۵ھ میں مرتب کیا گیا جس کو آج نصف صدی سے زیادہ زمانہ ہوا۔ اس کا تاریخی نام "گوہر انتخاب" ہے۔ اس مجموعۂ مفردات کے سال ترتیب کی تاریخ نواب صفدر علی خاں صفدر طاب ثراہ اور شیخ الٰہی بخش مرجان رقم المتخلص بہ غریب مرحوم نے کہی تھی۔[۱۲۸۵ھ]

از صفدر

تازہ ہوں دماغ اہل معانی کے نہ کیونکر		جو شعر ہے وہ لخلخۂ زلف رسا ہے
اس نظم دلآویز کی ترتیب کی تاریخ		صفدر نے کہی عطر مضامیں کا کھچا ہے

۱۲۸۵ھ

از غریب

جوہری جانتے ہیں قدر جواہر کی غریب		کیا وہ سمجھے گا نظر جسکی کہ نقاد نہیں

لہ حضرت ثاقب نے لاعلمی سے لکھا ہے کہ سنہ ۱۳۰۱ھ کی تصنیف اور تاریخی نام ہے۔

اسکی ترتیب کی ہاتھ آئی یہ مجکو تاریخ　　واہ الماس کے ٹکڑے ہیں یہ افراد نہیں

"گوہر انتخاب" پہلی بار ۱۲۹۰ھ میں طبع ہو کر شائع ہو گیا تھا۔ سال طبع کی تاریخ داغ مرحوم نے کہی تھی ؎

وقت ترتیب امیر نے جو کہا　　گوہر انتخاب ہے تاریخ ۱۲۸۵ھ

داغ ہنگام طبع بول اٹھا　　دلبر انتخاب ہے تاریخ ۱۲۹۰ھ

یہ مجموعہ اُسی زمانے کا مطبوعہ رئیس المطابع میرے پاس موجود ہے۔ اس سے جو اشعار بچ رہے تھے ان کا ایک دوسرا مجموعہ مرتب ہو کر "صنمخانۂ عشق" اور "گوہر انتخاب" کے ساتھ ۱۳۱۳ھ میں طبع ہوا جس کا نام "جوہر انتخاب" ہے۔ "مرآۃ الغیب" "گوہر انتخاب" اور "جوہر انتخاب" میں ہزاروں شعر اُس رنگ کے ہیں جس کو آج ناواقفیت سے داغ کا رنگ سمجھا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہوں کچھ اشعار لکھے جاتے ہیں۔

از "مرآۃ الغیب"

پچھتا رہے ہیں خون مرا کرکے کیوں حضور　　اب اسپہ خاک ڈالئے جو کچھ ہوا ہوا　　زبان۔ حسرت بار

چالاکیاں تو دیکھو مجھے قتل کرکے خود　　اوروں سے پوچھتے ہیں یہ کیا ماجرا ہوا　　تیور سے تصویر کھینچدی ہے

بوسہ طلب کیا تو یہ کہنے لگا وہ بُت　　قدرت خدا کی تم کو بھی یہ حوصلا ہوا　　زبان۔ تیور

انساں کی مرگ و زیست نہیں ہے کسیکے ہاتھ　　آئے تو کیا جو آپ نہ آئے تو کیا ہوا　　زبان۔ بلاغت

حور آگئی نظر کہ پری کوئی دیکھ لی　　سودا سا ہے امیر کو کیا جانے کیا ہوا　　امیر کو کیا جانے کیا ہوا اسنے تصویر کھینچدی ہے

جناں میں ساتھ اپنے کیوں نہ لیجاؤنگا ناصح کو　　سلوک ایسا ہی میرے ساتھ ہے حضرت نے کر رکھا　　زبان۔ شوخی

بڑا احساں ہے میرے سر پہ اسکی لغزش پا کا　　کہ اسنے بے تحاشا ہاتھ میرے دوش پر رکھا　　"بے تحاشا" نے تصویر

نکیرین اک ذرا دم لینے دو پھر لڑ جھگڑ لینا　　ابھی تو میں تھکا ماندا چلا آتا ہوں منزل کا　　زبان گویا واقعہ سامنے ہے

چشم نرگس نہ ملی دیدۂ آہو نہ ملا　　اے حیا تجکو انھیں آنکھوں میں کیا رہنا تھا　　زبان۔ تیور

مثل مکتوب نہ کہنے میں ہے کیا کیا کہنا　　نہ مری طرز خموشی نہ کسی کا کہنا　　زبان۔ مثال ہی؟

رفتہ رفتہ راہ پر لانا ہے واعظ کو ضرور　　لیچلوں شربت بنا کر نذر کو انگور کا　　شوخی

خیر جاری کا اگر ہے حضرت زاہد خیال　　وقف کر دو مول لیکر باغ اک انگور کا

جب بلندی پر پڑے دیکھے کہیں ہوکے پھول	ڈھیر سمجھے ہم کسی بادہ کش مغفور کا	شوخی
روز خلقت سے وہیں ہے باہر آسکتی نہیں	کہتے ہیں جنت جسے ہے قید خانہ حور کا	″
تم مزے سے حسن کے واقف نہیں ہو زاہدو	نام ہی سنتے ہو منہ دیکھا ہے کس دن حور کا	″
ہم کہاں دنیا کہاں کچھ یوں ہی لیں آ گئی	دیکھتے چلیے تماشا اس تماشا گاہ کا	زبان۔تیور
اسقدر دل پر تصرف کیا سبب یہ کون ہیں	بک گیا ہے کیا بتوں کے ہاتھ گھر اللہ کا	″
کیا تھا کس سے گلہ میں نے کج ادائی کا	تجھے تو شوق ہے اے جنگجو لڑائی کا	″
گلہ زباں پہ نہ لانا تھا بیوفائی کا	امیر ڈوب گیا نام آشنائی کا	زبان۔ دوسرے مصرعے
دکھاؤ جلوہ جو دعوے ہے خود نمائی کا	مجھے یقین نہیں آتا سنی سنائی کا	دوسرے مصرعے کا قافیہ بھی
نہ بیوفائی کا ڈر تھا نہ غم جدائی کا	مزہ میں کیا کہوں آغاز آشنائی کا	زبان۔ دوسرا مصرعہ
میں طول روز قیامت کو سنکے ڈرتا ہوں	کہ دن نہ ہو وہ کہیں یار کی جدائی کا	شوخی
نہ پوچھ جام میں ساقی کے کیا ہے اے واعظ	بھرا ہے اسمیں لہو تیری پارسائی کا	زبان شوخی
ابھی تو فیصلہ ہوتا ہے سارے جھگڑوں کا	زبان تیغ سے پیغام دو صفائی کا	زبان۔تیور
رقیب طنز سے کہتا ہے آپ جائیں وہاں	یقین ہے یہ اُسے میری نارسائی کا	زبان۔ پہلے مصرع
بہار آئی ہے پھر خیر ہو خداوندا	جنوں کے ہاتھ میں دامن ہے پارسائی کا	زبان۔تیور
پہنچ سکا نہ وہاں نامہ بر تو دل نے کہا	کہ اور شکوہ لکھو خط میں نارسائی کا	زبان۔تیور
سنبھل کے دیکھو اگر دیکھتے ہو آئینہ	پھسل نہ جائے کہیں پانو خودنمائی کا	زبان۔تیور
کہیں سے ہاتھ شراب آئی ہے کہیں سے گزک	مزہ ہے کوئے خرابات میں گدائی کا	زبان۔تیور
ہزاروں کافر و مومن پڑے ہیں سجدے میں	بتوں کے گھر میں بھی سامان ہے خدائی کا	زبان۔شوخی
تمام ہو گئے ہم پہلی ہی نگاہ میں حیف	نہ رات وصل کی دیکھی نہ دن جدائی کا	زبان۔ درد
کہا جو میں نے کہ میں خاک راہ ہوں تیرا	تو بولے ہے ابھی پندار خودنمائی کا	زبان۔ بلاغت
کیوں ہوا عاشق جفا پر گر نہ تجکو صبر تھا	اے دل بیتاب کیا تجھ پر کسی کا جبر تھا	زبان۔تیور
نازنین کیونکر نہ جاتے مے کشی کو باغ میں	ننھی ننھی بوندیاں تھیں ہلکا ہلکا ابر تھا	زبان۔تصویر موسم
فتنہ تھا قہر تھا جلوہ ترا اے یار نہ تھا	جب تلک دل کو سنبھالوں میں دل زار نہ تھا	زبان۔تیور

کیا بلا تھی نگہ ہوشربا ساقی کی	اٹھ گئی آنکھ تو کوسوں کوئی ہشیار نہ تھا	زبان۔تیور
باتلے رکھ لی مری قاتل نے گنہگاروں میں	اس گنہ پر مجھے مارا کہ گنہگار نہ تھا	سبحان اللہ
مار ڈالا روز اول کی نگاہ لطف نے	ایک دم کا عیش ظالم عمر بھر کا غم ہوا	زبان۔درد
میرے زخموں کی ہنسی پر تم کو رونا آگیا	یہ خوشی بھی کچھ خوشی تھی جس کا ایسا غم ہوا	زبان۔تیور
ذبح کرتے ہو مجھے اے جان ڈھیلے ہاتھ سے	واہ اچھے وقت میں غصہ تمہارا کم ہوا	زبان۔تیور
جان قالب میں ہے مضطر دم نکلتا دل بیقرار	موت ہی آئی مزاج یار کیا برہم ہوا	زبان۔تیور۔درد
روکنا وقت میں اشکوں کا نہیں اچھا امیر	چار دن کے ضبط میں دیکھو تو کیا عالم ہوا	زبان۔تیور۔تیر
بات کہنے میں تو جاتی ہے ملاقات کی رات	کیا بڑی بات ہے رہ جاؤ یہیں رات کی رات	زبان۔تیور
ذرا ہاں اس زلف میں پھنس جائے تو اتنا پوچھوں	کہئے کس طرح کٹی قبلۂ حاجات کی رات	زبان۔شوخی
سن کے درد دل عشاق یہ کہتا ہے وہ بت	بندے اللہ کے ہو مجھ سے ہے فریاد عبث	زبان۔شوخی
قاضی برہنہ سر ہے تو زخمی ہے محتسب	شاید کہ پی گئے ہیں بہت بادہ خوار آج	شوخی۔بلاغت
جھنجھلا کے بوسۂ لب جاں بخش پر کہا	کچھ موت تو نہیں ترے سر پر سوار آج	زبان۔تیور
سر پر ہے ابر ساقی و مطرب ہیں سامنے	اللہ رے جوش رحمت پروردگار آج	شوخی تصویر کھینچدی ہے
آزماؤ دل کو صاحب آزمانے کیطرح	کروٹیں تم تو بدلتے ہو زمانے کیطرح	زبان۔تیور۔درد
ہوں وہ نالاں کہ ہے اتنے لئے مرگی خوشی	چین سے سوئیگی سب خلق خدا میرے بعد	زبان۔درد
ارادہ ہے خود اُن سے پوچھوں میں چلکر	یہ خط تم نے پھاڑا کہ قاصد نے چلکر	زبان۔بلاغت میں ص
یہ میری طرف پانو محفل میں کیسے	ذرا آدمیت سے بیٹھو سنبھل کر	زبان تیور
نہ محبت نہ تلطف نہ عنایت نہ وفا	تم ہی کہدو کہ رہے پھر کوئی کس کا ہوکر	زبان حسرت بار
توبہ سو بار میں کرلوں گا کچھ انکار نہیں	میکشی سے تو ذرا ہو مجھے فرصت واعظ	زبان۔شوخی
بے سبب آٹھ پہر ذکر مے و جام نہیں	کچھ تو ملتی ہے زباں کو تری لذت واعظ	شوخی
ذکر تو دختر رز کا ہو کسی رنگ سے ہو	وعظ میں بھی ترے کچھ ملتی ہے لذت واعظ	شوخی۔قند مکرر
دخت رز کو برا مرے آگے	پھر نہ کہنا کبھی سنا واعظ	زبان۔تیور

لے داغ نے پہلا مصرع یہ لگایا ہے ؎ بات کیا چاہیئے جب مفت کی حجت ٹھہری + اس گنہ پر الخ

ہجو مے کر رہا تھا منبر پر	ہم جو پہنچے تو پی گیا واعظ	زبان "پی گیا" نے شوخی ع
دیکھئے حشر میں کیا ہوتا ہے	ہم ہیں محبوب خدا کے عاشق	اس "کیا ہوتا ہے" نے ع
ہے زیست کا حاصل تو فقط وصل کی لذت	جس رات کا وعدہ نہو اس رات سے حاصل	شوخی
ظاہر میں دیا بوسہ تو کیا دل ہے مکدر	نیت ہی نہیں ٹھیک تو خیرات سے حاصل	شوخی۔ ردیف تیور دیکھئے
قسمت میں جو مے ہے وہ بہر کیف ملیگی	پھر قاضی و مفتی کی ملاقات سے حاصل	شوخی۔ بلاغت
شب وصال سر شام سے وہ کہتے ہیں	کہ آج کیوں نہیں ہوتی سحر نہیں معلوم	شوخی۔ تیور
خضر ہو راہبری ہے تو اب لے زاہد	کہ ہم کو بادہ فروشوں کا گھر نہیں معلوم	شوخی
جب کبھی اسکو نئی شان سے ہم دیکھتے ہیں	دل ہی واقف ہے جس ارمان سے ہم دیکھتے ہیں	زبان۔ "دل ہی" ع
حشر میں ہاتھ سے رضواں کے اسے بھی ہوں نصیب	ذلتیں جو ترے دربان سے ہم دیکھتے ہیں	شوخی
گرہ ابرو پہ ہے منہ لال ہے چتون ہے پھری	آج انھیں اور ہی سامان سے ہم دیکھتے ہیں	تصویر کھینچدی ہے ع
مدح کرتا ہے جو تو غیر کی دانائی کی	پہروں منہ کو ترے نادان سے ہم دیکھتے ہیں	تصویر کھینچدی ہے
رشک ہوتا ہے کہ شاید ہے تمھارا عاشق	تنگ اے جان جسے جان سے ہم دیکھتے ہیں	زبان۔ بلاغت
چاہی جو میں نے عجلت بولا بگڑ کے قاصد	اڑ جاؤں کسطرح میں کیا پر لگے ہوئے ہیں	زبان۔ تیور
ملنے کا وعدہ منہ سے تو انکے نکل گیا	پوچھی جگہ جو میں نے کہا ہنس کے خواب میں	زبان۔ شوخی
دو کی جگہ دئے مجھے بوسے بہک کے چار	تھے نیند میں پڑا انھیں ہو کا حساب میں	زبان۔ معاملہ
کیوں منہ بنائے ہو بوسے کے مانگنے پر	خوش ہوتے ہیں سخی جب سائل کو دیکھتے ہیں	شوخی
اسطرح مجلس زہاد میں جاتا ہوں میں رند	متقی جیسے سوئے بزم شراب آتے ہیں	شوخی۔ بلاغت
مزے بتوں کے تو خود لوٹتے ہیں حضرت دل	خدا سے مفت مجھے شرمسار کرتے ہیں	زبان۔ شوخی
دل و جگر کو نکالو بھی میرے سینے سے	تڑپ تڑپ کے مجھے بیقرار کرتے ہیں	زبان۔ تیور
کبھی بتوں سے جو کرتا ہوں وصل کی خواہش	خدا کے فضل کا امیدوار کرتے ہیں	شوخی
مرنے کے بعد بحث کو آئے ملک تو کیا	کچھ حوصلہ اگر ہو تو اب گفتگو کریں	شوخی۔ تیور
میں الفت کے وہ حسن کے جوش میں	نہ میں ہوش میں ہوں نہ وہ ہوش میں	کیا بے تکلفی ہے۔ تصویر کھینچدی ہے
قدم پر جو گرنے لگا غش میں میں	کہا ہٹ کے۔ آؤ ذرا ہوش میں	زبان۔ ادابندی

پلا وصل میں مے نہ ان کو امیر	مزہ کیا رہے جب نہ وہ ہوش میں	زبان۔ تیور
محبت کا برا ہو دل کو روؤں یا جگر تھاموں	مرے قابو سے یہ دونوں کے دونوں نکلے جاتے ہیں	زبان۔ تیور
نظر اسیر نہیں کرتے خود آئے ہیں پری بن کر	ہمیں کو اور الٹے آپ دیوانہ بناتے ہیں	زبان۔ تیور
پہلے تم اپنی چتون اپنی نظر کو دیکھو	پھر جس نے دل دیا ہے اسکے جگر کو دیکھو	زبان۔ تیور
ظالم تجھے دل دیا خطا کی	بس بس میں پہنچ گیا سزا کو	زبان۔ تیور
اے حضرت دل بتوں کو سجدہ	اتنا تو نہ بھولئے خدا کو	زبان۔ شوخی۔ تیور
اتنا بکیے کہ کچھ کہے وہ	یوں کھولئے قفل مدعا کو	شوخی۔ بلاغت
وصال پر جو ہے وصل امتحان کر دیکھو	امیر۔ یوں ہی سہی۔ چند روز مر دیکھو	تیور۔ دوسرے مصرع کی بندش دیکھیے
مری طرف سے کہے کوئی حضرت غم سے	بہت لیے رہے دل میں اب اور گھر دیکھو	زبان۔ تیور۔ بلاغت
کسی کا دل نہ دکھاؤ خدا کا خوف کرو	ذرا کلیجے پہ اپنے تو ہاتھ دھر دیکھو	زبان۔ تیور
چھپا چھپا کے نظر بازیاں ہوں غیروں سے	ہمیں سے آنکھ چرانا ذرا ادھر دیکھو	زبان۔ تیور۔ تصویر کھینچدی ہے
گیا تھا لیکے خط آیا ہے ہاتھ کٹوا کر	ذرا خدا کے لیے شان نامہ بر دیکھو	زبان۔ تصویر کھینچدی ہے
جان پر کھیل گیا میں تو کہا اس بت نے	میں نہ سمجھا تھا کہ تم فضل خدا سے کچھ ہو	زبان
نہ محبت کی وہ آنکھیں نہ وہ الفت کی نگاہ	حال دل کس سے کہوں تم تو خفا سے کچھ ہو	زبان
پہلے تو مجھے کہا نکالو	پھر بولے غریب ہے بلا لو	زبان۔ تصویر کھینچدی ہے
گھبرا کے ہم آئے تھے سوے حشر	یاں پیش ہے اور ماجرا لو	زبان۔ ذرا ردیف کو دیکھیے
اوروں پہ امیر تکیہ کب تک	تم بھی تو کچھ آپ کو سنبھالو	زبان۔ حتیٰ یغیروا ما بانفسہم
مدت میں شام وصل ہوئی ہے مجھے نصیب	دو چار سو برس تو الٰہی سحر نہ ہو	زبان۔ شوخی۔ تیور
منہ پھیر کر کہا جو کہا میں نے حال دل	چپ بھی رہو امیر مجھے دردسر نہ ہو	زبان۔ تصویر کھینچدی ہے
خدا کے واسطے کلمہ بتوں کا پڑھ زاہد	پھر اختیار میں غافل زباں رہے نہ رہے	زبان۔ شوخی۔ غافل کے ص
انھیں سے ناز کرتی ہے جو تجھ پر جان دیتے ہیں	اجل تجکو بھی کتنا ناز معشوقانہ آتا ہے	زبان
زبردستی کا دھڑکا وصل میں تم کو سمایا ہے	کدھر ہو۔ ہوش میں آؤ۔ کوئی آیا۔ نہ آتا ہے	زبان۔ تیور۔ معاملہ
دولت لٹاتے ہیں وہ حسن شباب کی	کیا جانئے کیا سمجھ کے یہ سوجھی ثواب کی	زبان۔ شوخی

کیا قہر ہے کہ چھوڑ کے بھٹی شراب کی	بھیجا بہشت میں مری مٹی خراب کی	زبان۔شوخی
وہ چاٹ دوں کرے نہ مذمت شراب کی	واعظ کے منہ پہ مُہر لگا دوں کباب کی	شوخی۔کیا مزے کی مُہر ہے
اس بت پہ عاقبت دل ناصح بھی آ گیا	اللہ نے ہماری دعا مستجاب کی	شوخی
آوازِ صور سن کے میں کیوں ٹھٹھکا ہوا	کچھ یہ تو ایسی بات نہ تھی اضطراب کی	״
سوتے تھے وہ لپٹ کے کبھی ہم سے رات بھر	اب کیا کریں وہ ذکر کہ باتیں ہیں خواب کی	زبان۔حسرت بار
ڈرتے نہیں ہو ساقیِ کوثر سے واعظو	منبر پہ بیٹھ کر یہ مذمت شراب کی	زبان۔شوخی۔تیور
مصروف یادِ دوست ہوں اے منکر و نکیر	پوچھا کرو یہاں نہیں فرصت جواب کی	شوخی۔تیور
ساقی میں رند دیکھ کے دوزخ کو روزِ حشر	سمجھا کہ گرم ہے کوئی بھٹی شراب کی	شوخی
ہم بڑھ چلے جو وصل میں بولے وہ ناز سے	بس بس کہ بوسے ایک کے تم چار لے چکے	زبان۔تیور۔معاملہ
بس بس زبان روک لو اتنا نہ بڑھ چلو[ل]	ہم چپ ہیں آپ[ل] دون کی سو بار لے چکے	زبان۔تیور
ہجوِ مے بیٹھ کے مسجد میں نہ کر اے واعظ	ایسی شے ہے کہ قیامت پہ اٹھا رکھی ہے	مسجد کے لفظ نے اور شوخی
اک ذرا وحشتِ دل بڑھ کے خبر تو لینا	خاک کیا نجد میں مجنوں نے اڑا رکھی ہے	زبان۔تیور
غیر کے ساتھ دغا کرکے وہ مجھ سے بولے	یہ وہی بات ہے جو تم نے بنا رکھی ہے	اس شوخی کی کیا بات ہے
جا کے لے آئے اسے پھر میں جھگڑوں تو لڑو	مختصر بات ہے ناصح نے بڑھا رکھی ہے	زبان۔شوخی۔تیور
ذکرِ غنچہ جو سنا مجھ سے تو ہنس کر بولے	خوب آئے کہ مرے منہ کو چڑاتے آئے	زبان۔شوخی۔تیور
جانِ محزوں کی حقیقت کیا تھی	درد پہلو میں اٹھا لوٹ گئی	زبان۔ردیف کے تیور
کیا مزے کی ہے طبیعت اپنی	ایک بوسہ جو ملا لوٹ گئی	״
ستم سے تنگ ہوں احسان مجھ پہ کر واعظ	خبر سنا اُسے روزِ جزا کے آنے کی	زبان۔شوخی
غضب ہے نزع میں کہتے ہیں سب پڑھو کلمہ	لگی ہے رٹ مجھے اس بے وفا کے آنے کی	غضب کی شوخی کو دیکھئے
چڑھاؤ پھول جو میری لحد پہ آئے ہو	یہ کون چال ہے تیوری چڑھا کے آنے کی	زبان۔ادا بندی
ان دنوں دخترِ رز کا نہیں ملتا ہے پتا	کہیں قاضی کے تو گھر جا کے نہیں بیٹھ گئی	زبان۔تیور۔شوخی
الٰہی شبِ غم میں اتنا تو ہو	کوئی جھوٹ کہہ دے سحر ہو گئی	زبان۔درد
تیرے منہ سے ہاں نہیں دونوں ہیں خوب	صدقے اس انکار اس اقرار کے	زبان۔بلاغت

ل اس زمانے میں یہ جائز تھا

لیا جو خواب میں بوسہ تو یار جاگ اٹھا	تمام عمر کا ہم اعتبار کھو بیٹھے	تیور۔ حالے کی تصویر
حیا دیکھو وہ نرگس زار میں گھبرا کے کہتے ہیں	اِدھر آنکھیں اُدھر آنکھیں نقاب الٹے کہاں کوئی	زبان۔ تیور
بھاری بہت ہے لاؤں گا روز جزا میں لُند	اٹھوا کے سر پہ شیخ کے گٹھری گناہ کی	شوخی
آنکھ مجھ سے دل ملے اغیار سے	یار در گزرا میں ایسے پیار سے	زبان۔ تیور
کر چکے قتل اب کہیں سوا نہو	جاؤ دھو ڈالو لہو تلوار سے	زبان۔ تیور
ایک قطرہ بھی نہ پینا مگر اے جان جہاں	اُسی انداز سے کہہ لے کہ نہیں تھوڑی سی	زبان۔ ادا بندی
آ گئے میخانے میں بھیجے پیر خرابات آمیر	اب چلے مسجد جامع کو امامت کرنے	زبان۔ شوخی
اٹھو جاؤ سدھارو کیوں مرے مُردے پہ روتے ہو	ٹھہرنے کا گیا وقت اب گر ٹھہرے تو کیا ٹھہر	زبان جسرت بار
ابھی جی بھر کے وصل یار کی لذت نہیں اٹھی	کوئی دم اور آغوش اجابت میں دعا ٹھہرے	شوخی
خیال یار آنکلا مرے دل میں تو یوں بولا	یہ دیوانوں کی بستی ہے یہاں میری بلا ٹھہرے	زبان۔ تیور
کہتا ہے وہ صنم کہ رہیں ہم تمہارے گھر	لیکن یہ شرط ہے کہ خدا درمیاں رہے	شوخی

از گوہر انتخاب جوہر انتخاب

وہ مست ہوں کہ ساغر مے جب میں پا گیا	اک بار یا غفور کہا اور چڑھا گیا	جب کے لفظ نے شوخی کی
انصاف جور یار خدا سے طلب کیا	تم نے بھی اے آمیر بڑا ہی غضب کیا	زبان۔ تیور
اے دل تو اور چار پہ عاشق ہو مجکو کیا	میں نے ترے بھلے کو کہا کیا بُرا کیا	زبان۔ تیور
کھیل تھا عمر بھر جو دیکھا تھا	زندگی کیا تھی اک تماشا تھا	درد۔ بندش کی بے تکلفی کو
اے دل بلائے جا وہ کبھی آہی جائیگا	دو چار بار کہنے میں شرما ہی جائے گا	زبان۔ تیور
نالے کرتے کرتے میں ٹھہرا تو وہ کہنے لگے	مر گیا غش کر گیا۔ دیکھو تو چپ کیوں ہو گیا	زبان۔ "دیکھو تو" نے
پیے گا تو بھی تو زاہد ہی جناں میں شراب	جو میکشوں نے یہاں پی تو کیا گناہ کیا	شوخی
عاشق ہوئے مگر کچھ اچھا بُرا نہ جانا	ہم دل لگا تو بیٹھے لیکن لگا نہ جانا	زبان
دے جلد جام ساقی ٹوٹے خمار میرا	تیار ہے جماعت ہے انتظار میرا	شوخی
دل بوند بھر لہو ہے پر جب یہ مضطرب ہو	اسوقت رنگ دیکھو اس بوند بھر لہو کا	تیور
مست ہیں حلقہ کئے ایک سماں ہے سب پہ کرم	دور ساغر میں سبو پیر مغاں بن بیٹھا	تشبیہ کی شوخی نے مست کر دیا

قیامت کا اگر ڈر ہے تو یہ ہے	کہ ہے ہے ہم کو پھر جینا پڑے گا	زبان۔شوخی
غم اسکا حسرتوں سے پوچھتا ہے میرے سینے میں	کہاں ہے وہ جو دل نام اک یہاں بیمار رہتا تھا	شعر پر ایک عالم ہے
یار آیا ہے مرے مُردے پر	ہائے اس وقت میں زندہ نہ ہوا	شوخی میں درد
کل ذرا چپ رہے پاس آکے جو بیٹھا ناصح	میں یہ سمجھا کہیں کمبخت اُسے دیکھ آیا	زبان۔شوخی
مدت ہوئی کہ غم سے خوں ہو کے بہہ گیا دل	صدقے کیا تھا صاحب تم سے عزیز کرتا	زبان۔درد
مری صورت جو بدلی فرط غم سے	تو وہ بولے کہ اچھا روپ بدلا	زبان۔شوخی
نوجواں لوگ کیا نہیں کرتے	دل لگایا تو کیا گناہ کیا	زبان۔تیور
بازو پہ رکھ کے سر جو وہ کل ساتھ سو گیا	آرام یہ ملا کہ مرا ہاتھ سو گیا	عالم۔دوسرے سو گیا کو دیکھیے
ضبط کرتے ہی اثر نالوں کا ظاہر ہو گیا	بول اٹھے گھبرا کے ہے ہے لو وہ آخر ہو گیا	زبان۔تیور
چپکا بیٹھا ہوا ناصح کی میں باتیں سنتا	پر ترا ذکر تھا اے یار میں کچھ کہہ نہ سکا	زبان۔بلاغت
چلے جو آگے بتاتے تری گلی کی راہ	میں آج خضر سے بھی سخت بدگمان ہوا	شوخی۔بلاغت
جنت کا نہ میں خواہاں حوروں کا نہ میں طالب	بوٹا سا وہ قد ہوتا چھوٹا سا مکاں ہوتا	دوسرے مصرع پر ایک
خم توڑ کر بنائے بہت ساغر شراب	مستوں پہ محتسب نے نرالا کرم کیا	شوخی۔بلاغت
یوں شب ہجر میں کرتے ہیں غلط غم اپنا	مردہ خود بنتے ہیں خود کرتے ہیں ماتم اپنا	شوخی میں درد
شہر بیگانہ میں ہوتا ہے مسافر کا جو حال	ہے حسینوں کے محلے میں وہ عالم اپنا	تصویر کھینچدی ہے
ناتوانی نے زور کام کیا	چڑھ گئے یار کی نگاہوں پر	بہت خوب!
عشق کے نام سے معشوق کو ہوتا ہے گریز	جی میں ہے آج سے عاشق ہوں شب فرقت پر	شوخی
جانے دے اس بت کو ضبط نالہ و فریاد کر	اتنی بے صبری نکر اے دل خدا کو یاد کر	زبان
اس در پہ سجدہ کرکے یہ درباں سے کہہ لیا	مسجد یہاں سے دور ہے وقت نماز تنگ	شوخی
راحت کو ڈھونڈھتا ہے عبث تو جہان میں	اسکا زمیں میں ہے نہ پتا آسمان میں	حقیقت۔زبان
جان من وہ دلکے لے لینے کی راہیں اور ہیں	جنکو آنکھیں ڈھونڈتی ہیں وہ نگاہیں اور ہیں	زبان
شیخ جی مر گئے ہیں اسکے مرید	حبس دم کا گماں کرتے ہیں!	زبان۔اکبر مرحوم کا رنگ
گھر میں اللہ کے واعظ ہیں تو یہ کچھ ہے کلام	میکدے میں ابھی آئیں تو ہماری سی کہیں	،،

وصل کو اُنسے جو کہیئے تو کریں وعدہ حشر	کیجئے قتل کی خواہش تو ابھی حاضر ہیں	زبان - ادابندی
دی نہ تھی کسی کو جو اے آفریدگار	پیدا ہی کیوں کیا تھا خوشی کو جہان میں	زبان بلاغت
نامہرباں ہے یار تو اس کا نہیں تصور	یہ مہربانیاں بھی کسی مہرباں کی ہیں	شوخی - بلاغت
ہوئے زاہد مرید پیر مغاں	واہ مرشد کو مانتا ہوں میں	زبان - شوخی
نگاہیں حیا سے کہاں پھر چلیں	ادھر دیکھئے پتلیاں پھر چلیں	زبان - تیور
لیا پھر تو نے اس کا نام اے دل	ارے ظالم ابھی سمجھا چکا ہوں	زبان - تیور
لگاکر تجھسے دل حاصل ہوا یہ اے دغا دشمن	زمانے بھر کا میں دشمن زمانہ بھر مرا دشمن	زبان - بلاغت
مانگتا ہوں خدا سے روز شراب	میں بھی کیا رند پاک طینت ہوں	زبان - شوخی
کنایے جانتے ہیں آپکی گھاتیں سمجھتے ہیں	زمانہ ہمنے دیکھا ہے یہ سب باتیں سمجھتے ہیں	زبان - تیور
مجکو دیکھا تو غیر سے بولے	آپ بھی مجکو پیار کرتے ہیں	زبان - ادابندی
ہم کو فردائے حشر کا کیا غم	کہ شب ہجر کی سحر ہی نہیں	شوخی - بلاغت
کرتے ہیں بندگی پیر مغاں	شیخجی کیا جوان صالح ہیں	زبان - شوخی
میکدے میں کہیں پڑے ہونگے	شب جمعہ ہے آج امیر کہاں	زبان - شوخی
امیر وادی غربت میں تا کجا گردش	بہت سفر میں رہے اب چلو وطن کو چلیں	زبان شعر کے آخری م
دعائیں میں نے ان کو دیں تو بولے	ابھی یہ گالیاں کس پر پڑی تھیں	زبان - ادابندی - تیور
عمر کو سارا زمانہ گزران کہتا ہے	دن جدائی کا مگر عمر میں محسوب نہیں	شوخی - بلاغت
حضور یار مجھے عرض حال کرنا ہے	کرے قبول تو ناصح کو میں وکیل کروں	شوخی - بلاغت
آتا ہے یہ دلمیں اُسے ناصح کو دکھا دوں	پر رشک جو مانع ہے جواب اسکو میں کیا دوں	زبان - بلاغت
دیکھنے کو تمھیں لے اہل عدم آتے ہیں	خیر اگر تم نہیں آتے ہو تو ہم آتے ہیں	حقیقت - لطف زبان
جان دی تب مجھے ملی راحت	موت سے کچھ میں شرمسار نہیں	زبان - بلاغت
آہ کرنے پہ کیوں بگڑتے ہو	تم تو صاحب ہوا سے لڑتے ہو	زبان - تیور
کھاتے ہو قسم نہیں میں عاشق	صورت تو امیر اپنی دیکھو	زبان تیور
دیکھے کہاں تھے ایسے حسینوں کے جمگھٹے	محشر کا روز اور الٰہی دراز ہو	شوخی

پہلے تو آرسی میں منہ اس نے اپنا دیکھا	پھر مجھسے ہنس کے بولا کیا مانگتے ہو بولو	زبان یہ جو نچلے کی تصویر پھبتی
جو بیقرار بہت دیکھتا ہے مجکو وہ بت	تو ہنس کے کہتا ہے صاحب خدا کو یاد کرو	زبان ـ شوخی
کرتے تو ہو سوال امیراس سے حشر میں	اور اسکو گر جواب نہ آیا تو پھر کہو	زبان ـ تیور
خط مرا پھینک کے جھپر یہ کہا قاصد نے	وہ بھی ہو آپ پہ عاشق تو یہ کھرا دیکھے	زبان ـ واقعہ سامنے آگیا ہے
تم دکھاتے تو ہو امیر کا دل	اور جو وہ کوئی آہ کر بیٹھے	زبان ـ میر
جہاں ہم ہونگے آنکھیں عشق کی اس گھر میں آئینگی	یہاں پریاں جلاتی ہیں وہاں حوریں جلائینگی	زبان ـ شوخی
یہ دن فراق کا کیوں دیکھتے ہمیں جو کے	شب وصال کے ہمراہ ہولئے ہوتے	زبان ـ کیا بلاغت ہے
کیا وقت نکالا ہے رنجش کا بھی ظالم نے	جب خوب سنورتا ہے تب مجھسے بگڑتا ہے	شعر پر ایک عالم ہے
اچھی نہیں ملامت ہر وقت کی یہ ناصح	انسان کی طبیعت قابو میں ہے نہیں ہے	زبان ـ تیور ـ تاثیر
دو گھڑی آپ کا ہنس ہنس کے لگاوٹ کرنا	رنج برسوں کا مرے دل سے مٹا دیتا ہے	زبان ـ واقعہ
ہمنشیں اُنسے جو کہتے ہیں کہ مرتا ہے امیر	کیئے کبتک وہ غریب اب مصیبت دیکھے	ق
کہتے ہیں واہ جی عاشق کہیں ہوتے ہیں غریب	پاس جا بیٹھے پھر انکی کوئی غربت دیکھے	زبان ـ شوخی
ہے وصل میں راحت نہ جدائی میں الم ہے	آئے کی خوشی ہے نہ گئے کا مجھے غم ہے	پوری مثل دوسرے مصرع
زاہدو ہم سے پوچھو قدر ان کی	بت ملے ہیں خدا خدا کر کے	شوخی
خیر تم پر نہیں ہے زور اپنا	مر مٹیں گے یہ اختیار تو ہے	زبان حسرت
مجکو زاہد نہیں شراب حرام	تیسرے دن میسر آئی ہے	شوخی
راز کیا عاشق و معشوق کے غیروں پہ کھلیں	صلح ہو آنکھوں میں آنکھوں میں لڑائی ہو جائے	سبحان اللہ!
وہ جلوہ دیکھکر جب طور پر موسے کو غش آیا	تو آئی غیب سے آواز ـ دیکھا ہم نہ کہتے تھے	زبان ـ تیور
غیر کے ساتھ وفا کر کے وہ مجھ سے بولے	تو جفا دوست ہے اک طرز جفا یہ بھی ہے	یہ دوسرا پہلو ہے
دو ہاتھ جب کنارہ ہو دیر اس میں کیا لگے	ہم پیر کر شراب میں کوثر سے جا لگے	کیا بے تکلفی ہے اسکے ۳۹
نجد میں گھبرا کے جا نکلے جو ہم	قیس بولا پیر و مرشد خیر ہے	زبان ـ شوخی
امیر اس بت کو دل دیتے ہو کیا شامت رہی تمہاری	کسی پتھر پہ دے پٹکو جو ایسا تم کو بھاری ہے	زبان ـ تیور ـ میر

لہ سحر کے یہاں بھی پہلا مصرع دیکھیے سہ دیکھو کہیں سحر سے بیجا ہنسی نہ کرنا ـ

ہزار ہوں حسن آدمی میں ہزا ہوں خوبیاں پری میں — امیر اپنا تو ہے یہ مشرب دا نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے — بہت خوب

پردہ الٹ کے جب وہ دیدار عام کرتے — ایوب صبر کرتے تو ہم سلام کرتے — زبان۔ بلاغت شوخی

ہے دختِ رز حلال تجھے کیا تمیز ہے — واعظ یہ زر خرید ہماری کنیز ہے — شوخی

پی کے مے بیٹھے وعظ سننے امیر — یہ بڑی تم نے ہوشیاری کی — زبان۔شوخی

باقی نہ کوئی دل میں الٰہی ہوس رہے — چودہ برس کے سن میں وہ لاکھوں برس رہے — شوخی

مسجد میں بلاتا ہے ہمیں زاہد نافہم — ہوتا کچھ اگر ہوش تو میخانے نہ جاتے — شوخی۔ تہور

غیروں کے حال پر تو بہت لطف ہے تمہیں — ہم پر بھی لطف حال ہمارا بھی غیر ہے — زبان۔شوخی

ہاتھ ڈالا میں نے دامن پر تو بولے ناز سے — میرا دامن چھوڑیئے اپنا گریباں پھاڑیئے — زبان۔ ادا بندی

اور اک بات حسینوں کی نرالی سنیے — دیجیئے ان کو دعائیں بھی تو گالی سنیے — تیور اور بے تکلفی قابل دید ہے

مسکرائے وہ اس ادا سے امیر — میں تو سمجھا کہ اب گری بجلی — زبان۔"اب گری بجلی" نے

میں تو سب اپنے کام خدا ہی کو سونپ دوں — لیکن یہ خوف ہے کہ خدا بے نیاز ہے — شوخی

دل نہ بازار میں مہنگا ہی نہ سستا چھوٹے — کھو ہی جائے کہیں کمبخت کہ جھگڑا چھوٹے — زبان

فرقت میں زندگی یہ عنایت خدا کی ہے — آگے جو کچھ کہوں تو شکایت خدا کی ہے — شوخی۔ بلاغت

میرے مرنے کی خبر جھوٹی اڑاتے ہیں وہ روز — کیا مسیحائی ہے غیروں کے جلانے کیلیئے — شوخی

کیا ان اشعار کے دیکھنے کے بعد بھی کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ امیرؔ نے داغؔ کی تقلید میں یہ رنگ اختیار کیا یا داغؔ اس رنگ کے موجد تھے؟

اب "صنم خانۂ عشق" میں سے چند شعر ملاحظہ فرمایئے اور انصاف کیجیئے کہ کیا یہ رنگ اس رنگ سے کچھ مختلف ہے جو آپ مندرجۂ بالا اشعار میں ملاحظہ فرما چکے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ صنم خانے میں یہ رنگ زیادہ نظر آتا ہے اور اس کی وجہ یہی ہے (جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں) کہ اب وہ اپنے خاص رنگ میں شعر کہنے کے لیے آزاد تھے لیکن ان کی ہمہ گیر طبیعت اور قادر الکلامی مضمون آفرینی اور نازک خیالی وغیرہ سے کب باز رہ سکتی تھی چنانچہ صنم خانے میں بھی ہر رنگ کے شعر ہیں۔

از صنم خانۂ عشق

دنیا میں پریزاد دئے خلد میں حوریں — بندوں سے وہ اپنے کبھی غافل نہیں ہوتا — شوخی

خواہش وصل تو کیونکر کہوں لیکن ناصح | دیکھ لینے کا تو حضرت کو بھی ارماں ہوگا | شوخی-تیور

مرے[۱] پھولوں میں کیا ہے موقع ہنسی کا | نہ اتنا بھی بیدرد ہو دل کسی کا | زبان-تیور

یہ کیا ہے کہ جب مانگئے ان سے بوسہ | تو منہ دیکھنے لگتے ہیں آرسی کا | زبان-ادابندی

ہنسا عکس ہنسنے پہ انکے تو بولے | کہ میرے ترے واسطہ کیا ہنسی کا | کیا بات پیدا کی ہے!

دکھا کر اُسے روز محشر کہوں گا | کہ سرکار میں نالشی ہوں اسی کا | زبان-تیور

نگہ برچھیاں غمزہ چھریاں لگائے | مرا ایک دل ہو گیا وہ اسی کا | زبان

نہیں وصل و ہجر اک مرقع کھنچا ہے | تری بے بسی کا مری بے کسی کا | بلاغت

مزے اڑا کے در توبہ باز ہے زاہد | حسین شراب جو دیں پیکے توبہ کرلینا | شوخی-تیور

نہ توڑ شام سے اے دل شب فراق میں دم | ابھی تو رات ہی ساری پڑی ہے مرلینا | زبان-تیور

دل مرا لیکے دکھادی مجھے مٹھی خالی | پھر کہا دیکھ لیا ہاتھ سے جانا دل کا | شوخی کی تصویر کھینچدی ہے

پیکے واعظ مے گلگوں مرے دشمن پچھتائیں | تیرے کہنے سے نہ پیتا تو پشیماں ہوتا | شوخی

بہار آئی لنڈھاتے خم کے خم ہم بادہ خوار دیں | کہو توبہ سے چندے جالے ہے پرہیزگار دیں | شوخی

فرشتوں سے کہو اتنی قیامت میں خبر رکھیں | کہیں چھپ چھپ کے زاہد مل نجائیں بادہ خوار دیں | شوخی

جدا ہے دخت رز کا نام ہر صحبت میں اے ساقی | پری ہے میکشوں میں حور ہے پرہیزگار دیں | شوخی

اڑائے پرزے میرے دلکے خوش چشموں نے یوں ملکر | تبرک جیسے ہو دستار قاضی بادہ خوار دیں | شوخی-خوش چشموں ادا

ہوہی رہتا ہے کسی بُت کا نظارہ تا شام | صبح کو اٹھ کے جو ہم نام خدا لیتے ہیں | شوخی

ملی ہے دختر رز لڑ جھگڑ کے قاضی سے | جہاد کرکے جو عورت ملے حرام نہیں | شوخی

گرہ سے کچھ نہیں جاتا ہے پی بھی مے واعظ | ملے جو مفت تو قاضی کو بھی حرام نہیں | شوخی

جو میکشی سے ہو فرصت تو دو گھڑی کو چلو | امیر مسجد جامع میں آج امام نہیں | شوخی

حضور وصل کی حسرت ازل سے ہے مجکو | خیال کیجئے کب سے امیدوار ہوں میں | شعر پر عجب عالم ہے

کیا دھیان امیر آیا کہ وہ ہٹ گئے پیچھے | جھک جھک کے جو ہم کرنے لگے پیار سے باتیں | بلاغت-ادابندی ہے

بتوں کا تصور جو ان کو نہیں ہے | تو بت کیوں یہ اللہ والے ہوئے ہیں | شوخی

---

[۱] ارادہ تھا کہ اسی بحر میں کل حروف تہجی میں ایک ایک غزل کہیں گے۔ یہ ایک چھوٹا سا مزیدار مجموعہ الگ ہوجائے گا۔

[له] غش میں گر تجھے زلف سنگھاتے بھی نہیں	جایئے جایئے ہم ہوش میں آتے بھی نہیں	زبان۔تیور
بت بنے بیٹھے ہیں کچھ بات بتاتے بھی نہیں	اور یہ غصہ کہ میں روٹھا تو مناتے بھی نہیں	زبان۔تصویر کھینچدی ہے
کچھ وفا کچھ ہے حیا جان ہے کس مشکل میں	دلسے جاتے بھی نہیں آنکھوں میں آتے بھی نہیں	زبان
جی دھڑکتا ہے کہ چوری نہو دل کی ثابت	منہ سے انکار بھی ہے آنکھ ملاتے بھی نہیں	زبان
پرسش حشر میں چوکے تو وہ مجھ سے بولے	تم کھڑے دیکھتے ہو اور بتاتے بھی نہیں	زبان۔تیور
آکے تربت پہ مری کہتے ہیں لو اٹھ بیٹھو	ابتو مدت ہوئی ہم تم کو ستاتے بھی نہیں	زبان معشوق کیطرف سے ہے
لطف مرنے کا دکھائیں کسے فرقت میں امیر	نہیں آتے وہ تو ہم جان سے جاتے بھی نہیں	زبان
یوں تو سلجھے گا نہ الجھا ہوا بوسوں کا حساب	سہل سا گُر میں بتا دوں تجھے تو گن ہی نہیں	زبان۔شوخی
ان سے ہے وصل کی درخواست وہ جو چاہیں کہیں	غمزہ کہیں بیچ میں بول اٹھتا ہے ممکن ہی نہیں	زبان۔تیور۔جدت
وائے قسمت جو سب کی سنتا ہے	وہ بھی عاشق کی التجا نہ سُنے	شوخی کے ساتھ درد
میری فریاد رائگاں تو نہ ہو	بت ہی سن لیں اگر خدا نہ سنے	شوخی
درد پر دل نثار دل پر درد	ایسے دیکھے ہیں آشنا نہ سنے	زبان۔تیور
میں تو سنتا ہوں تو جو کہتا ہے	اے ستمگر مگر خدا نہ سنے	زبان۔بلاغت
جان دینے کو کہا ان سے، تو ہنس کر بولے	تم سلامت رہو ہر روز کے مرنے والے	زبان
لحد میں آئے نکیرین تو میں یہ سمجھا	نقیب مجکو بلانے حضور سے آئے	شوخی
دل کو اب کب قرار آتا ہے	سن لیا ہے کہ یار آتا ہے	بے تکلفی
تیرے وعدے سے عشق ہے اسکو	ساتھ ہی اعتبار آتا ہے	سبحان اللہ!
تم کو آتا ہے پیار پر غصہ	مجکو غصے پہ پیار آتا ہے	بہت مشہور شعر ہے۔
زندگی میں کبھی نہ آنکلا	مر گئے پر ترار آتا ہے	واقعے میں کیا شاعری کی ہے
لیٹ کے تم سے تصور میں کوئی سوتا ہے	کدھر خیال تمھارا ہے کچھ خبر بھی ہے	زبان۔تیور
آپ نے غیر کا خط ہم سے چھپا رکھا ہے	دیکھئے دیکھئے تکیے میں وہ کیا رکھا ہے	زبان۔تیور
کہتے ہیں میری بلا جانے ترا دل ہے کہاں	چور ہیں کیا مرے دشمن جو چرا رکھا ہے	زبان تیور

له داغ کی بھی غزل ہے اور گائی جاتی ہے۔

ہم چلے دیر سے کعبے کو تو وہ بت بولا	جا کے لے لیجئے کعبے میں خدا رکھا ہے	زبان۔تیور۔شوخی بھی ہے
برائی مری سن کے غیروں سے بولے	یہ سب سچ مگر ہائے کیا آدمی ہے	بہت خوب !
قیامت ہے واعظ اسی تاک میں	اِدھر تو نے پی اور اُدھر آ گئی	شوخی۔بلاغت
مسی چھوٹی ہوئی سوکھے ہوئے ہونٹ	یہ صورت اور آپ آتے ہیں گھر سے	تصویر کھینچدی ہے
دیکھ پایا ہے انھیں حضرت ناصح نے کہیں	اب میں سمجھا جو غرض ہے مُرے سمجھانے سے	زبان۔شوخی۔بلاغت
زاہد وعظ کی مجلس سے کسے ہے انکار	تم چلو پہلے میں آیا ابھی میخانے سے	زبان۔شوخی۔تیور
کل نظر آئے تھے جاتے ہوئے مسجد کو امیر	آج دیکھا تو چلے آتے ہیں میخانے سے	زبان۔شوخی
لے چکے دل تو ہنس کے فرمایا	پیار اب کیجئے گا کس دل سے	شوخی کی تصویر کھینچدی ہے
گھٹا جو برق میں چمکی تو یاد آئی امیر	ادا کسی کی وہ پردہ اٹھا کے آنے کی	تصویر کھینچدی ہے

امیرؔ کے کلام میں بول چال، اس میں لوچ جو لکھنؤ کی زبان کا حصہ ہے اور اشعار میں شوخیاں وغیرہ تو آپ دیکھ چکے اب اُن کے ہر رنگ کے کچھ شعر لکھے جاتے ہیں کیونکہ ہر شخص کا مذاق سخن جداگانہ ہوتا ہے۔ع۔ نگہ اپنی اپنی پسند اپنی اپنی۔

کچھ غم نہیں جو بیش ہے دفتر قصور کا	عنوان نامہ نام ہے رب غفور کا	عفو تقصیر کی امید کس
کیسی نظر حجاب جو مانع ہو نور کا	دریا سے قطرہ قصد کرے کیا عبور کا	تصوف
کہتے ہی یا کریم اِدھر سے اُدھر گئے	لطف و غضب میں فاصلہ تھا کتنی دور کا	شان رحمت
میں خاک بھی ہوا تو ہوا اسکی خاک در	چھوٹا نہ دست عجز سے دامن غرور کا	مرتبہ عجز
دیدار کا تو وعدہ وفا ہوگا حشر کو	ارشاد ہو علاج دل ناصبور کا	زبان۔درد
دیکھیں کہ کیا دکھائے قیامت میں شوق دید	درپیش مرحلہ ہے شہود و ظہور کا	تصوف
مرغ عصیاں اڑ کے صید باز رحمت ہو گیا	دنگ شاہین ترازوئے عدالت ہو گیا	رفعت۔اسلوب بیاں
جگر کو دوں کہ دل کو دوں بتا اے ناوک قاتل	کہ دو پیاسوں میں ہے یہ ایک قطرہ آب پیکاں کا	حسن طلب
کہتے تھے دل کسی سے لگائیو نہ اے امیر	دیکھو تو چار روز میں کیا حال ہو گیا	بندش و زبان میر
خلعت پہن کے آنے کی تھی گھر میں آرزو	یہ حوصلہ بھی گور و کفن سے نکل گیا	تشبیہ نو
پہلو میں میرے دل کو نہ اے درد کر تلاش	مدت ہوئی غریب وطن سے نکل گیا	درد

مرغان باغ تم کو مبارک ہو سیر گل	کانٹا تھا ایک میں سو چمن سے نکل گیا	درد
سارا جہان نام کے پیچھے تباہ ہے	انسان کیا عقیق یمن سے نکل گیا	ناموری کی تشویق
اللہ رے انقلاب جہان پلید کا	خون حسینؓ غازہ ہے روئے یزید کا	عبرت
پیری میں مجھ سے خنجر قاتل گلے ملا	دیکھا ہے چاند تیری تاریخ عید کا	نیا مضمون
اس غم کدے میں کٹ گئی یوں اپنی زندگی	قیدی پہ جیسے روز گزر جائے عید کا	درد
یت بنکے وقت نزع نہ بالیں پہ میرے بیٹھ	ہوتا ہے آج خاتمہ گفت و شنید کا	درد۔حسرت
باطن میں غم ہے عشرت دنیائے ظاہری	پہنے ہوئے لباس محرم ہے عید کا	حقیقت تشبیہ نو
صفحۂ دہر پہ صورت گر قدرت نے امیر	اس کی تصویر وہ کھینچی کہ قلم توڑ دیا	سہل ممتنع
کی نظر روئے کتابی پہ تو کچھ دل ٹھہرا	مکتب شوق بھی قرآن کی منزل ٹھہرا	تشبیہ
نکہت گل سے پریشان ہوا اسکا دماغ	خندۂ گل نہوا شور عنا دل ٹھہرا	نزاکت
دریائے معرفت سے جو دل آشنا ہوا	ترک خودی سفینۂ اہل فنا ہوا	تصوف۔استعارہ
میں مٹ گیا تو وہ بھی مرے ساتھ مٹ گیا	سایے سے خوب حق رفاقت ادا ہوا	رفاقت کی تشویق
زائل ہوئی نہ بھیس بدلنے سے بوئے عشق	تصویر میں بھی رنگ ہے رخ سے اڑا ہوا	رفعت تخیل
شاید خط اس ہتیلی کے حلقے تھے جال کے	آتے ہی قید طائر رنگ حنا ہوا	بلند پروازی
نہ پوچھ دیکھنے کا حال ہم نے کچھ نہیں دیکھا	کیا نرگس کی آنکھوں سے تماشا سائے گلشن کا	بے بصیرتی
بہار آئی ہے اے دست جنوں یا عید آئی ہے	گریباں سے گلے ملنے چلا ہے چاک دامن کا	رفعت تخیل۔ندرت بیان
اٹھالوں سختیاں لاکھوں کڑی بات اٹھ نہیں سکتی	میں دل رکھتا ہوں شیشے کا جگر رکھتا ہوں آہن کا	خودداری
بہائے تیغ براں نقد جان اہل جرأت ہے	بہت سستا ہے بازار اجل میں نرخ آہن کا	استعارہ
کچھ آج نہیں رنگ یہ افسردہ دلی کا	مدت سے یہی حال ہے بیمار مرے جی کا	رنگ میر
غم اٹھانے کو بہت تھے ترے بندے یارب	کیا کمی تھی اگر اک مجکو نہ پیدا کرتا	اظہار درد و غم کس خوبی سے کیا ہے
وہ جو امید بر آری پر امیر آجاتے	پہلے ہی میں ترک تمنا کی تمنا کرتا	درد۔ترک تمنا بھی مشکل ہے
غبار اسکے لب بام تک بلند ہوا	ہوائے تند کا جھونکا مجھے کمند ہوا	رفعت تخیل
کیا قبول نہ گل نے مرے گریباں کو	کبھی نہ خار کو دامن مرا پسند ہوا	کس مپرسی حسرت

آوارہ پھر رہا ہے محبت کی راہ میں	اک دل دیا تھا ہم کو خدا نے سو یوں گیا	رنگ میر
تڑپنے میں دکھا جاتی ہے کچھ انداز بسمل کا	مگر کھایا ہے جوہر کا برق نے بھی تیغ قاتل کا	رفعت تخیل
لگا خنجر جو سینے پر ہوئے کیا کیا رہا قیدی	ہزاروں حسرتیں نکلیں جو دروازہ کھلا دل کا	رفعت تشبیہ
زباں پر تذکرہ اس تیغ ابرو کا جو ہے ہر دم	صدا میری کہ نالہ ہے گلوے مرغ بسمل کا	"
الٰہی بعد مردن بھی رہے مشق ستم مجھ پر	لگائیں تیر جب تو وہ بنائیں وہ مری گل کا	انتہائے عشق
کسی نے لفظ رخ بے نقطہ کب عالم میں دیکھا ہے	نہ ہوتا کسطرح نقطہ رخ محبوب پر تل کا	مضمون آفرینی
نئی معراج پائی ہے غبار گور مجنوں نے	بگولا جو اٹھا قبہ بنا لیلےٰ کے محمل کا	رفعت جذبۂ عشق
بولے وہ سن کے رات کو میری صدا امیر	پوچھو تو کوئی نام ہے کیا اس فقیر کا	انداز میر
وقت صید آیا تصور جب قضا کے تیر کا	چلدیا صیاد پیچھا چھوڑ کر نخچیر کا	موت کی یاد
زخم دل ہم کو پتا دیتے ہیں تیرے تیر کا	دام ہے نقش قدم بھاگے ہوئے نخچیر کا	رفعت تشبیہ
دشت وحشت میں پہ چبھے ہیں خار ایسے ہر قدم	پانو شانہ بن گیا ہے گیسوئے زنجیر کا	"
گرم بازار تجلی تیری باتوں سے ہوا	لو ہے شمع طور کی شعلہ تری تقریر کا	"
فراق یار نے بیچین مجکو رات بھر رکھا	کبھی تکیہ ادھر رکھا کبھی تکیہ اُدھر رکھا	بیقراری کی تصویر
برابر آئنے کے بھی نہ سمجھے قدر وہ دل کی	اسے زیر قدم رکھا اُسے پیش نظر رکھا	درد
نہ کی کس نے سفارش میری وقت قتل قاتل سے	کماں نے ہاتھ جوڑے تیغ نے قدموں پہ سر رکھا	مضمون آفرینی
پڑ گیا ہے کوئی ناسور جگر میں شاید	کہ مری آنکھ سے کل شب کو لہو بھر آیا	میر کا رنگ
لن ترانی ارنی گو کو بھی کہنا تھا ضرور	عشق کو حسن کے پردے میں چھپا رہنا تھا	تصوف
فریفتہ ہوں اس انداز دلربائی کا	کہ دل لیا تو دیا ذوق آشنائی کا	ہل جزاء الاحسان الا الاحسان
عزیز کیوں نہو داغ اس کی بیوفائی کا	کہ ہے صلہ یہی مدت کی آشنائی کا	درد
بغیر پہنچے ہوئے یار تک نہیں رہتا	میں مٹ کے نام مٹا دوں گا نارسائی کا	تصوف
شناوران محبت تو سیکڑوں ہیں مگر	جو ڈوب جائے وہ پورا ہے آشنائی کا	"
مرے نصیب یہ کہتے ہیں میرے نالوں سے	ہے خیال ہماری بھی نارسائی کا	درد ۔ یاس
کسی گنہ پہ کوئی قتل ہو میں کہتا ہوں	کہ اس سے جرم ہوا ہوگا آشنائی کا	عشق میں محویت

کمال حسن نے بے پردہ کر دیا ان کو	نکل پڑے یہ ہوا ذوق خود نمائی کا	تصوف
میں درد دل بھی شب وصل کہہ نہیں سکتا	کہ ہاتھ آئے گا پہلو اسے جدائی کا	عالم جبر
بار بار اسکی گلی میں کیوں نہ جاتا اے امیر	کیا کروں بے اختیاری تھی کہ دل بے صبر تھا	درد - تیر کا رنگ
سر نیاز کو تیرا ہی آستانہ ہوا	شراب خانہ ہوا یا قمار خانہ ہوا	تصوف
حسد سے طرۂ مضموں مرا یگانہ ہوا	عدو کے خندۂ دنداں نما سے شانہ ہوا	رفعت تشبیہ
یہ بدحواس کیا شوق جبہ سائی نے	کہ سنگ راہ مجھے سنگ آستانہ ہوا	تصوف
کمان حسن نہ تھی آشنائے تیر ادا	کہ ناوک غم الفت کا میں نشانہ ہوا	״
خدا کی راہ میں دینا ہے گھر کا بھر لینا	ادھر دیا کہ ادھر داخل خزانہ ہوا	خیرات کی ترغیب
نشان غیر کہاں صید گاہ وحدت میں	پڑا ہدف پہ بھی تو تیر ہی نشانہ ہوا	تصوف
نہ پوچھ ناز و نیاز اسکے میرے کب سے ہیں	یہ حسن و عشق تو اب ہیں اسے زمانہ ہوا	״
چنے مہینوں ہی تنکے غریب بلبل نے	مگر نصیب نہ دو روز آشیانہ ہوا	درد - حسرت
فروغ دل کا سبب ہو گئی بجھی جو ہوس	شرار کشتہ سے روشن چراغ خانہ ہوا	اخلاق
وادی ایمن میں بھی تھی برق تجلی بے حجاب	حیرت موسیٰ تھی پردہ جلوہ گاہ طور کا	تصوف
حسن یوسف اور تیرے حسن میں اتنا ہے فرق	چوٹ یہ نزدیک کی ہے وار وہ تھا دور کا	״
قصر تن بگڑا کسی کا گورکن کی بن پڑی	گھر کسی کا گر پڑا گھر بن گیا مزدور کا	نیرنگ عالم قافیہ دیکھئے اور مضمون
عجز کرتے ہیں عدو سے جاں سے بھی خاصان حق	جھک گیا سر آکے پائے دار پر منصور کا	تواضع
صیاد ہم کہاں وہ تماشائے گل کہاں	رو دی ہو نگاہ جو ذکر چمن ہوا	درد - حسرت
ممنون چارہ گر نہوا میں ہزار شکر	ہر داغ تازہ مرہم زخم کہن ہوا	رفعت تخیل
دل مرا کشتہ ہے یارب کس شہادت گاہ کا	ہر شگاف زخم دروازہ ہے بیت اللہ کا	رفعت تشبیہ
رند مشرب کب کے پہنچے یار کے گھر زاہدا	تو بتا ہی پوچھتا ہے ابتک اسکی راہ کا	تصوف
عشق شیریں میں نہیں فرہاد بھی خسرو سے کم	ایک عالم ہے محبت میں گدا و شاہ کا	مساوات عشق
فی الحقیقۃ غوطۂ بحر فنا ہے لا الہ	ہے ابھرنا اس بھنور سے ذکر الا اللہ کا	تصوف
صحبت احباب یا دربار یا سرکار ہو	بات وہ کہیئے بھلا ہو جسمیں خلق اللہ کا	اخلاق

آنسوؤں کا جوش یہ ذکرِ الٰہی میں ہوا	بن گیا سرو کنار جو الف اللہ کا	ندرت بیان
بے یار ابر میں میں دل انگار ہو گیا	بجلی کا کوندنا مجھے تلوار ہو گیا	درد۔غم جدائی
عالم تمام اپنی جوانی سے تھا جوان	ہم پیر کیا ہوئے کہ جہاں پیر ہو گیا	واقعہ۔حسرت
کیا ہماری گور پر ہے احتیاجِ روشنی	چار جگنو جب چمک نکلے چراغاں ہو گیا	قناعت
جا کے تنہا اور بھی صدمے اٹھائے باغ میں	پھول جو پھولا مجھے داغِ عزیزاں ہو گیا	درد۔غم
وجہ رسوائی نہ تھا ملبس تھا جبتک کہ عشق	آ کے مضمون لفظ کے جامے میں عریاں ہو گیا	تشبیہ نو
نامۂ اعمال ہے جب تک نہیں ملتا امیر	میرے ہاتھ آیا یہ اور میرا گریباں ہو گیا	انتہائے جنوں۔شوخی
ماتم کیا کسی نے نہ میرا تو کیا ہوا	ابر آ کے خاک گور پہ ہر سال رو گیا	درد
کھائے تھے داغ جسکی محبت میں سیکڑوں	دو پھول بھی نہ وہ سرِ تربت چڑھا گیا	درد۔حسرت
اب کون ہے جو منزلِ الفت میں ساتھ دے	دل بھی چھٹا رفیق جو اپنا قدیم تھا	درد۔انداز میر
تیرے مریضِ غم کی نہیں آج کچھ خبر	سنتے ہیں کل تو حال نہایت سقیم تھا	؍؍
ہر جگہ سوزِ محبت کا نیا عالم ہوا	آنکھ میں آنسو جگر میں داغ دل میں غم ہوا	مجسم سوز
رازداری محبت کا میں کیا دعوے کروں	جسقدر محرم ہوا اتنا ہی نامحرم ہوا	تصوف
آنسوؤں سے بیقراری میں ذرا تسکین تھی	بڑھ گیا اور اضطراب دل جو رونا کم ہوا	درد
میں ترا ممنون ہوں اے گریۂ بے اختیار	جب پڑی مجھ پر مصیبت تو شریکِ غم ہوا	؍؍
وائے قسمت رہ گئی حسرت ہی لطفِ یار کی	بڑھ گئی شانِ تغافل کچھ جو غصہ کم ہوا	درد۔حسرت
لذتِ شرمِ گنہ تھی کب فرشتوں کو نصیب	یہ مزا چکھنے کو پیدا خلق میں آدم ہوا	انسان کا شرف
کس طرح مکنونِ دل اظہار کرتا پیشِ یار	آج تک میں خود نہ اپنے راز کا محرم ہوا	تصوف
۱؎ تنگ آکر جب عافرقت میں مانگی موت کی	حسرتیں بگڑیں مزاجِ آرزو برہم ہوا	بلاغت
تیغ زنگ آلود خنجر کند قاتل خردسال	کیا کہوں مقتل میں وقتِ قتل کیا عالم ہوا	اس مزے سے اہلِ دل ہی
اے جرس تو تو نہیں قافلے والوں سے جدا	تیری آواز میں یہ درد کہاں سے آیا	درد

۱؎ حکیم مرحوم نے یہ مصرع لگایا تھا ۔ یار کی محفل میں جب پریوں کو دیکھا غم ہوا۔ حسرتیں بگڑیں الخ۔

دونوں کا فرق ظاہر ہے۔

یاس حرماں کے اگر جھونکے ہیں فرقت میں یہی	کوئی دم میں گل چراغ آرزو ہو جائے گا	درد۔ سوز
ساتھ میرا تو چھوڑا ہے یاس ہجر یار میں	اور بھی ویراں دل بے آرزو ہو جائے گا	درد
رہ رہ کے اک کھٹک سی سینے میں ہو رہی ہے	شاید ابھی ہے باقی ٹکڑا کوئی جگر کا	درد۔ تیر کا رنگ
نہ پھرا نامہ بر وہاں سے امیر	زندگی نے ہمیں جواب دیا	"
نزع میں ہوں میں کہو انسے اب آرام کریں	دیکھنا تھا مجھے سو ایک نظر دیکھ لیا	"
کس کس نے ہم کو روکا اس در پہ ہم جو پہنچے	لغزش نے پاؤں پکڑے دربانے ہاتھ پکڑا	جدت
شب عدہ نہ جھپکی آنکھ تک آرام کب آیا	یہی کھٹکا رہا شب بھر وہ اب آیا وہ اب آیا	درد۔ تیر کا انداز
کب انا الحق جرم تھا منصور کا	دیکھنے والا تھا کس معرور کا	تصوف
مردے کا زندہ کرنا کیسا تم آپ مرتے	مرنے کا کچھ مسیحا تم نے مزانہ جانا	ذوق فنا
مجکو دیکھا تو آئینے نے کہا	ہائے کیا حال ہو گیا تیرا	زاری و ناتوانی کے اظہار کا
قتل سے ہم رہے محروم گری ہاتھ سے تیغ	ہائے اس آنکھ سے جلاد کو کیوں دیکھا تھا	حسرت
وہ آئے کھینچ کے تلوار سب کو شاد کیا	امیر آج بہت ہم نے تم کو یاد کیا	درد
بیقراری نے بدلوائی تو کروٹ بدلی	درد دل نے جو مدد کی تو میں بستر سے اٹھا	حالت مجبور کی تصویر
لاکھوں اس لیلے کے دیوانے تھے انمیں عشق نے	ایک مشت استخواں کا نام مجنوں رکھ دیا	تصوف
عشق نے زور دکھایا تھا امیر	کوہکن کو ہکنی کیا کرتا	سہل ممتنع۔ بلاغت
کہاں بادۂ عیش تقدیر میں	پیوں میں تو ہو جائے پانی شراب	حسرت۔ یاس
نامہ بر میں جانتا ہوں پر بتا سکتا نہیں	دلمیں ہے لب تک نہیں آتا نشان کوئے دوست	ایہام۔ بلاغت
نو بہار چمن غم ہے عجب روز افزوں	بڑھتی جاتی ہے گرہ دل کی ثمر کی صورت	تشبیہ
عمر گزری ہے مری وادی غربت میں مگر	اب تلک یاد ہے کچھ کچھ مجھے گھر کی صورت	درد۔ یاد وطن
آنے سے تیرے یاس ہوئی مجکو یار آج	کل تک ترا تھا موت کا ہے انتظار آج	درد۔ بلاغت
ایکبار لے برق تکلیف ورکر جھگڑا مٹے	پھونک دے مجکو بھی میرے آشیانے کی طرح	درد
عین غفلت میں ہیں خوش اسطرح اہل جہاں	جیسے ہنس پڑتے ہیں بچوں کو جو آجاتی ہے نیند	تشبیہ

دل ملا خاک میں ایسا کہ پتا پھر نہ ملا	سیکڑوں دانے اُگے خاک میں پنہاں ہو کر	درد
گل ہوا غنچہ تو آواز یہ اس سے آئی	جمع پھر دل نہیں ہوتا ہے پریشاں ہو کر	حقیقت اور اسکا ثبوت
کہہ گئی گل کر کے میری شمع بالیں کو صبا	کوئی اسے ناداں روتا ہے سر بیمار پر	زبان۔ محاورہ
سنا کسی سے جو نام دوائے درد جگر	تڑپ کے دل نے صدا دی کہ ہائے درد جگر	درد
نہ محبت نہ تلطف نہ عنایت نہ وفا	تم ہی کہدو کہ رہے پھر کوئی کس کا ہو کر	″
بیٹھنے دو پاس لینگے بوسۂ عارض نہ اب	شک اگر ہو مہر کر دیں ہم کلام اللہ پر	معاملہ۔ کیا شوخی ہے
دشت میں گرمیٔ رفتار و بخار دل سے	بجلیاں پانو کے نیچے ہیں گھٹا ہے سر پر	تشبیہ
قدم کو لغزش زباں کو لکنت ہے رعشہ ہاتھوں کو سر کو جنبش	کدھر گئی ہائے نوجوانی ان آفتوں میں ہمیں پھنسا کر	پیری کی تصویر۔ درد
جو آنکھ کھولی تو کچھ نہ دیکھا سحر کو سنسان سب سرا تھی	ہوا نہ ہمراہیوں سے اتنا کہ ساتھ لیتے مجھے جگا کر	حسرت
شبیہہ مد نظر ہے کسکی کہ کوئی پوری نہیں اترتی	مٹا دیے صانع ازل نے ہزاروں نقشے بنا بنا کر	تصوف
یہ ظلم سارے ہیں چند روزہ ہے ایکدن انتقام کا بھی	امیر حمام گرم کر لیں فقیر کا جھونپڑا جلا کر	نیرنگ زمانہ۔ درس عبرت
صیاد یہ ستم تو برائے خدا نہ کر	بے بال و پر ہوں میں ابھی مجکو رہا نہ کر	بلاغت۔ درد
پس مردن یہ بخشا ہم کو رتبہ بیقراری نے	چھپے ہم خاک کے نیچے گئے افلاک کے اوپر	مضمون آفرینی
گر پڑا کیا کوئی لخت دل کا لعل اے چشم تر	ڈھونڈنے کو اشک آتے ہیں جو دامن کیطرف	تلاش مضمون آفرینی
رغبت اب دل کو ہے یوں جانب غم	جیسے معشوق کو تاکے عاشق	تشبیہ

مرکز عشق ہے درد تہ پیمانۂ عشق عہ — آسماں ظرف بر آوردۂ میخانۂ عشق

کم بلندی میں نہیں عرش سے کاشانۂ عشق — دونوں عالم ہیں دو مصراع درخانۂ عشق

ہے جو والیل سراپردۂ کاشانۂ عشق — سورۂ شمس ہے قندیل درخانۂ عشق

دل مرا شیشہ ہے آنکھیں مری پیمانۂ عشق — جسم یاں جوش محبت سے ہے میخانۂ عشق

ہم تھے اور پیش نظر جلوۂ مستانۂ عشق — جس زمانے میں نہ محرم تھا نہ بیگانۂ عشق

غرق ابھی بحر فنا میں یہ دو عالم ہو جائیں — اک اشارہ جو کرے نرگس مستانۂ عشق

ہم وہ فرہاد تھے کاٹا نہ صورت سے پہاڑ — حسن کا گنج لیا کھود کے ویرانۂ عشق

عہ پوری غزل ایک خاص رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ہر شعر تصوف۔ بلاغت اور رفعت تخیل سے بھرا ہوا ہے

عین مستی میں ملے ہیں مجھے گوش شنوا — سن رہا ہوں میں صدائے لب پیمانۂ عشق
آرہے باغ جناں سے جو زمیں پر آدم — فی الحقیقت تھی وہ اک لغزش مستانۂ عشق
معتقد کون نہیں کون نہیں اس کا مرید — پیر ہفتاد و دو ملت کا ہے دیوانۂ عشق
دل نے تسبیح بنا کر وہ کئے زیب گلو — ہاتھ آئے جو کئی گوہر یکدانۂ عشق
زلف معشوق نہ گھٹ جائے ادب کا ہے مقام — بڑھ چلیں اتنے نہ موئے سر دیوانۂ عشق
خاک درکار ہے وہ لوث خطا سے جو ہو پاک — ورنہ ہر خاک سے اگتا ہے کوئی دانۂ عشق
طالب درد ہے اس درجہ مرا طائر دل — ٹوٹ پڑتا ہے یہ جس دام میں ہو دانۂ عشق
کہتے ہیں مرگ جوانی جسے سب اہل جہاں — اپنے نزدیک ہے وہ بازی طفلانۂ عشق
بخت برگشتہ ہوں تب بھی نہیں جاتا یہ مزہ — نگرے بادہ جو وارون بھی ہو پیمانۂ عشق
طور پر کہتی ہے یہ شمع تجلی کی زباں — سرمۂ حسن ہے خاکستر پروانۂ عشق
ہم تھے اور چہرۂ محبوب کا نظارہ امیرؔ — شعلۂ حسن تھا جس دم نہ پروانۂ عشق

کروں ضبط نفس ہمدم کہاں تک — لگی ہے آگ اک دل سے زباں تک — درد
تجھے ملتا نہیں گھر ان کا قاصد — گئے کیونکر پیمبر لامکاں تک — شوق درہر دل
ایک قطرہ خون ہے دل پردہ قطرہ ہے امیرؔ — غوطے کھاتے پھرتے ہیں جس میں دو عالم آج تک — تخیل بلند
ممنون ضعف عالم پیری ہوں لے امیرؔ — جھکتا چلا ہے سر طرف آستان دل — بلاغت مضمون آفرینی
اے غم تری اب خوشی کہاں تک — کمبخت لہو تو ہو گیا دل — درد
فرش سے عرش تک نشاں نہیں — دور پہنچے ہوائے یار میں ہم — تصوف
اس کو لائیں گے خاک قابو میں — کہ نہیں اپنے اختیار میں ہم — بلاغت۔ درد۔ بیان میم
وصل میں بھی شکستہ خاطر ہیں — تو بہ مست ہیں بہار میں ہم — تشبیہہ نادر
گھر میں ہیں لیکن اپنے نام کیطرح — ہیں ہر اک ملک ہر دیار میں ہم — تشویق کمال
کانٹا ہوا ہوں سوکھ کے لیکن نہال ہوں — کھٹکوں گا اور اپنے عدو کی نگاہ میں — زبان۔ بلاغت
تو نے تو اسے سیاہی شبہائے تار ہجر — دھبا لگا دیا مرے بخت سیاہ میں — نیا مضمون۔ جدت
فراق میں ترے عاشق کو جا کے کل دیکھا — کہ وہ تو ہیچ تھا کچھ اشک تھے کچھ آہیں تھیں — درد۔ میر کا انداز

اللہ رے میرے دل کی تڑپ اضطراب میں	گھبرا کے کروٹیں وہ لگے لینے خواب میں	جذب عشق
اے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی	یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں	درد
دریا سے حل یہ مسئلہ ہے فہم چاہیئے	دیکھو ملا صدف میں خلا ہے حباب میں	فلسفہ
مردہ جو اہل دل ہوں تو زندہ انھیں سمجھ	عارف کی آنکھ رہتی ہے بیدار خواب میں	تشویق معرفت
ہرچند ماندگی نے ہم کو بٹھا دیا ہے	صد شکر دور سے تو منزل کو دیکھتے ہیں	حسرت
کیسے موسے لن ترانی کی صدا کیسی ایر	حسن کے نیرنگ تھے خلوت سرائے طور میں	تصوف
عاشقوں سے ہے ترقی حسن کی تنویر میں	جسکے رخ سے رنگ اڑا آیا تری تصویر میں	رفعت تخیل
ہے یہ بے مہری کا چرچا دور چرخ پیر میں	خون مادر طفل پیتے ہیں ملا کر شیر میں	اخلاق
جس پری کی آنکھ مجھسے پھر گئی بولا جنوں	لو مبارک اور اک حلقہ بڑھا زنجیر میں	تشبیہہ۔ رفعت تخیل
بیقراری سے مجھے الفت میں حاصل ہے سکوں	پائے دل موج پریشانی سے ہے زنجیر میں	استعارہ۔ رفعت
غیر ممکن ہے دل حیراں میں میرے دخل غیر	عکس پڑتا ہے کہاں آئینہ تصویر میں	تشبیہہ
کام آتی ہے جوانوں کے بہت تدبیر پیر	طاقت پرواز ہے زور کماں سے تیر میں	کلیہ۔ الہامی تشبیہ
دل ٹھہر جائے یہ امید نہیں	ایسے بگڑے کہیں سنورتے ہیں	زبان۔ درد
یہ چرچے یہ صحبت یہ عالم کہاں	خدا جانے کل تم کہاں ہم کہاں	”
کرے گا یاد اے غم ہم کو بعد مرگ تو برسوں	کھلایا ہے جگر برسوں پلایا ہے لہو برسوں	درد
رہے تصویر حیرانی ہم انکے روبرو برسوں	لب خاموش سے کی درد دل کی گفتگو برسوں	زبان عشق
فنا کے بعد ایسے بیکسوں کو کون پوچھے گا	مگر اے بیکسی رویا کرے گی ہم کو تو برسوں	درد
نکر اے یاس یوں برباد میرے خانۂ دل کو	اسی گھر میں جلایا ہے چراغ آرزو برسوں	”
پتلیاں تک بھی تو پھر جاتی ہیں دیکھو دم نزع	وقت پڑتا ہے تو سب آنکھ چرا جاتے ہیں	درد۔ محاورہ
سمجھا یہ میں جو نکلے شاخوں سے گل چمن میں	صوفی نکل کے بیٹھے خلوت سے انجمن میں	تشبیہ نادر
آواز کن جو آئی کانوں میں ہم یہ سمجھے	غربت پکارتی ہے بس رہ چکے وطن میں	تصوف
راتوں کو مثل شبنم چھپ چھپ کے باغباں سے	ہر پھول سے لپٹ کر روتا ہوں میں چمن میں	درد
غربت میں ہے جو صورت خط میں لکھوں کہاں تک	تصویر اپنی بھیجوں احباب کو وطن میں	درد۔ بلاغت

ہماری بیخودی تمہید ہے تیری نمائش کی	مٹا کر نقش اپنا ہم ترا نقشہ جماتے ہیں	تصوف
کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں	جل اٹھتا ہے جو یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں	درد۔ تصویر فراق
گو کہ دیکھے خواب اچھے سب نے تعبیریں کہیں	وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں	درد
بزم کثرت نور وحدت سے کبھی خالی نہیں	آنکھ بینا ہو تو یوسف سیکڑوں بازار میں	تصوف
ہزار طرح کے ہوتے ہیں وہم ہم کو امیر	کسی کی آنکھ جہاں ہم پر آب دیکھتے ہیں	تیر۔ بلاغت
صورت کو اسکی دیکھ کے سمجھے ہو تم غریب	تم سے کبھی امیر سے باتیں نہیں ہوئیں	انداز میر
کرتے ہیں جو لوگ ذکر ان کا	ایک ایک کا منہ میں دیکھتا ہوں	تیر۔ مجبوری بےبسی کی تصویر
عجب دریائے حیرت میں پڑا ہوں	میں کس نا آشنا کا آشنا ہوں	تصوف
نہ عارض نہ زلف دو تا دیکھتے ہیں	خدا جانے ہم تجھ میں کیا دیکھتے ہیں	"
کوئی مجکو لئے جاتا ہے کہیں	نہیں معلوم کہاں جاتا ہوں	سہل ممتنع۔ بلاغت
دم لے نہ ابھی پوچھ مرے درد کو ہمدم	رونے سے جو دل ٹھہرے تو کچھ بات کروں میں	رنگ میر۔ درد
کیونکر تری گلی سے میں قاتل ابھی اٹھوں	مٹی میں مل تو لوں میں لہو میں نہا تو لوں	درد
نہ ہستی میں نہ مستی میں ہے یہ نفس وجود	مٹے امیر یہ جھگڑا کہیں مٹا بھی چکو	تصوف
اسی ادا سے جو تو آئے گا تو روز جزا	ملیگی الٹی سزا میرے داد خواہوں کو	بلاغت سبحان اللہ
حالت مریض غم کی کچھ تم بھی جانتے ہو	ایک ایک غش کو دیکھو دو دو پہر کو دیکھو	درد۔ رنگ میر
دل کی ہوتی ہے درستی جتنی ہوتی ہے شکست	کرتی ہے آباد بربادی اسی تعمیر کو	رفعت تخیل۔ بلاغت
زاہد امید رحمت حق اور ہجو مے	پہلے شراب پی کے گنہگار بھی تو ہو	شوخی
یاد آئیں تری آنکھیں تو یہ سمجھے دم نزع	حوریں فردوس سے آئی ہیں بلانے ہم کو	تشبیہ
لے چلے داغ ہزاروں چمن ہستی سے	زندگی لائی تھی کیا سیر دکھانے ہم کو	درد
سارے عالم میں یہ شہرت ہے قضا نے مارا	واہ کس پردے میں مارا ہے ادا نے ہم کو	حقیقت
پر جو کھولے بھی تو کب کھولے خزاں جب آ گئی	رحم آیا بھی تو کب آیا مرے صیاد کو	درد
دیکھا تھا جب سے دل نے تری آن بان کو	ہم صبر کر چکے تھے اسی دن سے جان کو	رنگ میر
پیری میں ضعف سے یہ نہیں رعشہ دار ہاتھ	ہیں دامن قضا کیلئے بیقرار ہاتھ	رفعت تخیل

آج امید صبح ہونے کی حضرت دل یہ شام فرقت ہے درد

بت بن گئے ہم امیرؔ آخر یہ یاد صنم کی انتہا ہے میرؔ کا انداز

کیا کہیں عشق میں کیا ملتا ہے بت کے ملنے سے خدا ملتا ہے سہل ممتنع۔ بلاغت

ہائے غم سے بھی جی نہیں بھرتا برکت اٹھ گئی زمانے سے اندازِ میرؔ

بڑھ جاتی ہے چمن میں اور آرزو تمھاری جس گل کو سونگھتا ہوں آتی ہے بو تمھاری درد۔ تصوف

الفت میں یوں تو اکثر ہم زار زار روئے کل دل پہ ہاتھ رکھکر بے اختیار روئے رنگ میرؔ

اے طول زمانۂ اسیری بلبل کہیں گل کو بھولتی ہے بلاغت

گیا ہے دیر سے ناخوش امیرؔ آج خدا ہی ہے جواب کعبے سے آئے رنگ میرؔ

اے صنم اللہ والے سیکڑوں شیدا ہوئے جب سے اس دنیا میں تم نام خدا پیدا ہوئے 〃

خبر انجام سے دیتا ہے پیری میں قد پرخم اشارہ ہے کہ اب تو خاک میں ملنے کے دن پہنچے مضمون آفرینی

ہونٹوں پہ دم ہے لیکن دلمیں یہی ہے حسرت دو حرف اسکے منہ کے سن لیتے ہم کسی سے درد

تیشے سے کوہکن کے آواز آرہی ہے شیریں کے دل پہ الفت چوٹیں لگا رہی ہے سبحان اللہ

انتہائے نشہ میں آتا ہے ہوش ہوشیاری انتہائے نشہ ہے لفظوں کے الٹ پھیر

[1] پنہاں جو سوز عشق کرے مرد ہے وہی دل پھنک گیا مگر نفس سرد ہے وہی

دیکھنے وہ جو نہ آئے تو نہیں مجکو گلہ میری حالت ہی وہ اب ہے کہ نہ دیکھی جائے درد۔ پاس یار

ہم قتل یوں ہوئے نہ کسی کو خبر ہوئی قاتل کی آستیں بھی لہو میں نہ تر ہوئی سبحان اللہ

ابھی مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں پھر اسقدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے درد

خزاں تو خیر سے گزری چمن میں بلبل کو بہار آئی ہے اب آشیاں رہے نہ رہے 〃

کیا جانیں ہم کہ ہنسنا کہتی ہے خلق کس کو ہم نے جو آنکھ کھولی تو چشم تر ہی دیکھی

جو ہے بہار اسکو خزاں کا خطر بھی ہے اے باغباں بسنت کی تجکو خبر بھی ہے کہاوت۔ رعایت

کونین میں ہے جلوۂ حسن جمال دوست ہے ایک روشنی کہ ادھر بھی اُدھر بھی ہے تصوف

---

[1] میر صاحب فرماتے ہیں ؎ عاشق ہیں ہم تو میرؔ کے اس ضبط عشق کے ٭ دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا۔ دونوں کا فرق ملاحظہ طلب ہے۔

بہار آئی عجب حالت ہے ان ذروں مرے دل کی	جگر میں چٹکیاں لیتی ہیں منقاریں عنادل کی	بلندی تخیل
کسی کو دہر میں پہچانتا ہے کون اے عزت	شناسائی ہے کچھ ان راستے والوں میں منزل کی	بلاغت۔ جدت تخیل
یہ تیری زلف کا عقدہ نہیں وا ہو جو شانے سے	ارے ناداں بہت مشکل سے کھلتی ہے گرہ دل کی	اخلاق
تامل سے جو دیکھا برگہائے غنچۂ گل کو	نظر میں پھر گئیں سب صحبتیں یاران یکدل کی	الہامی تشبیہ
تڑپ جاتا ہے دل اہل کرم کا جوش میں آ کر	چمکتی ہے جو بجلی شعلۂ آواز سائل کی	استعارہ تشویق کرم
خیال نیستی یہ ہر قدم تھا دشت ہستی میں	مٹا جو نقش پا مجھکو بتا دی راہ منزل کی	تصوف
کف سائل نہیں ہے کشتی دریائے بے آبی	اسی دریا کی موجیں ہیں لکیریں دست سائل کی	تشبیہ۔ ندرت تخیل
ملتی نہیں ہے نقد دو عالم پہ جنس وصل	قیمت یہ ہے تو مول خریدار لے چکے	تصوف
دلا آنکھوں سے چھپکر اس سے ہو دیدار کا طالب	جو ہو خلوت نشیں کیا مجمع اغیار میں آئے	؍؍
گرفتار قفس تھے جب تلک فصل بہاری تھی	خزاں بھی ساتھ آئی ہم اگر گلزار میں آئے	درد
لگی دل کی بجھائے بیکسی میں کون ہے ایسا	مگر اک گریۂ حسرت کہ بیتابانہ آتا ہے	درد "بیتابانہ" نے
چھلک جاتا ہے جام عمر اپنا وائے ناکامی	ہمارے منہ تلک ساقی اگر پیمانہ آتا ہے	درد
بتوں کی بھی جو پرستش نہ کرتے اے زاہد	خدا کے سامنے ہم لیکے کیا عمل جاتے	شوخی
کہتے ہیں گل یہ سبحۂ شبنم سنبھال کر	گنتی کے رہ گئے ہیں دن اپنی بہار کے	بے ثباتی
اپنی کہو گزرتی ہے کس طرح سے امیر	ہم ہیں فقیر لوگ ہماری بھلی کہی	تیر کا رنگ
آخری وقت تو آواز سنا جاؤ مجھے	خلق کے کہنے کو اک بات رہی جاتی ہے	درد۔ بلاغت
گل نسیم سحری شمع سحر کو نہ کرے	کوئی دم میں یہ غریب آپ بجھی جاتی ہے	درد
دھری ہے آسماں پر گنج انجم	ملی تھی جو تری خیرات تھوڑی	نعت
پلا دے لے کے نقد ہوش ساقی	تہیدستوں کی ہے اوقات تھوڑی	محاورہ
کنہ باری میں مقر ہو عجز کا	جیت لے بازی کو ہمت ہار کے	تصوف
ضبط گریہ کیا کروں اے ہم صفیر	پھول کھلا جائیں گے گلزار کے	بلاغت
غلاف ڈال قفس پر ابھی نہ اے صیاد	کہ ہے چمن سے توقع صبا کے آنے کی	درد
بیعت پیر مغاں طرفہ مزا دیتی ہے	سلسلہ ساقی کوثر سے ملا دیتی ہے	شوخی بھی اور حقیقت بھی

پوچھتے ہیں جو شب ہجر میں ہم شمع سے حال	منہ سے کہتی نہیں کچھ اشک بہا دیتی ہے	درد
قفس کی تیلیاں ہیں جتنی شاخیں ہیں درختوں کی	کہاں باندھے الٰہی اس چمن میں آشیاں کوئی	درد۔ بلاغت
کیا باغ میں دیکھتی ہے شبنم	جو گل کی ہنسی پہ رو رہی ہے	درد۔ عبرت
سوچ لے بدعہد وقت انکار کے	دونوں لب ہیں دو گواہ اقرار کے	اخلاق
رند خراب تیرا وہ مے پیے ہوئے ہے	مدت سے جان جسپر زاہد دیئے ہوئے ہے	تصوف
آتا نہیں نظر کچھ گو سامنا ہے اس کا	کیا بیچ میں تحیر پردہ کیئے ہوئے ہے	״
فنا کیسی بقا کیسی جب اسکے آشنا ٹھہرے	کبھی اس گھر میں آنکلے کبھی اس گھر میں جا ٹھہرے	״
جو چشم غور سے آئینۂ توحید کو دیکھا	تو سب کچھ تو ہی ٹھہرا ہم نہ کچھ اے خود نما ٹھہرے	״
نکالے جاتے ہیں ہر روز اسکے پاس خاطر سے	ترے عاشق نہ ٹھہرے ہم عدو کا مدعا ٹھہرے	ندرت تخیل
نہ تڑپا چارہ گر کے سامنے لے درد یوں مجھ کو	کہیں ایسا نہو یہ بھی تقاضائے دوا ٹھہرے	درد۔ بلاغت
تندرستوں نے قضا کی ہوئے بیمار صحیح	پہلے کیا جانیئے دنیا سے سفر کس کا ہے	بلاغت۔ کرشمہ قدرت
نہ مجکو آئے نہ اُن کو حساب بوسوں کا	یہ لین دین الٰہی علی الحساب رہے	زبان۔ شوخی
خدا نے مرتبہ عالی دیا ہے محسن کو	بلند ماہ سے کیونکر نہ آفتاب رہے	اخلاق
قصور نفس لعیں سے خدا رہا ناراض	گناہ غیر پہ ہم مورد عتاب رہے	نئی شوخی
صحت ہوئی مرض سے مگر ناتواں رہے	پرہیز کون توڑے ہم اتنے کہاں رہے	محاورہ
مجھ میں رہے وہ پر میں نہ سمجھا کہاں رہے	قالب میں رہ کے روح کی صورت نہاں رہے	تصوف
دیر و حرم میں سجدہ در یار پر کیا	تھے آستان یار پہ حاضر جہاں رہے	״
ہم غافلان دہر کو اتنا ہوا نہ ہوش	تھا کون میزبان کہاں میہماں رہے	اخلاق
ہے حسن میں بھی معنی روشن کا خاصہ	دلبر عیاں رہے وہ نظر سے نہاں رہے	تشبیہ نادر
انساں کو چاہیئے کہ دلوں میں جگہ کرے	بو ہو کے اس چمن کے گلوں میں نہاں رہے	اخلاق
راضی ہیں ہم کو پھیر کے منہ ذبح کیجیئے	باقی نہ کوئی حوصلۂ امتحاں رہے	بلاغت
اے آہ کر مدد یہ کہاں تک مخالفت	یا ہم رہیں زمین پہ یا آسماں رہے	تیور۔ خودداری
لاؤں بھلا کہاں سے دل بے ملال میں	اے دوست غمکدہ تو یہ ہے غم کہاں رہے	درد

نیرنگ اُن کی شان تجلی کے دیکھئے — اتنے ہوئے عیاں کہ نظر سے نہاں رہے — تصوف

یوں بیٹھے بیٹھے زیست کے دن ہو گئے تمام — کشتی میں جیسے ساکن کشتی رواں رہے — اخلاق تشبیہ

صیاد اِدھر خلاف اُدھر باغباں امیر — ہم بار خاطر قفس و آشیاں رہے — درد

پھیلکد و کاٹ کے جڑ نخل تمنا کی امیر — پھول کمبخت میں آئے نہ کبھی پھل آئے — زبان تمنا سے بیزاری

اب تو آجاؤ دم ہے آنکھوں میں — ناامیدانہ اک نگاہ سہی — تیر کا رنگ

امیر اک ذرا دیکھے بھالے ہوئے — محبت میں دل کو سنبھالے ہوئے — "

ہم فقیروں کو کہاں حوصلۂ وصل امیر — مہرباں اسکو جو پایا تو کبھی جا بیٹھے — "

جو بیقراری دل اب ہے گر یہی ہوتی — تو آجتک مری کاہے کو زندگی ہوتی — "

آئی پیری قشقہ دھو زنار توڑ اب اے امیر — کیا اسی صورت سے جائیگا خدا کے سامنے — "

اک کنارے پڑا ہوا ہے امیر — کچھ تمھارا غریب لیتا ہے — "

کوئی امیر ترا درد دل سنے کیونکر — تو ایک بات کہے اور دو گھڑی روئے — "

تو وہ بت ہے کہ تجھے ساری خدائی چاہے — بندہ اللہ سے کس کس کی برائی چاہے — بلاغت و وسعت تخیل

انسان جو چاہے کہ نہو اس کو کبھی رنج — زنہار کسی سے کوئی امید نہ رکھے — کلیہ۔ اخلاق

ہونٹوں پہ دم ہے لیکن دل میں یہی ہے حسرت — دو حرف انکے منہ کے سن لیتے ہم کسی سے — درد و سوز

(از مرآۃ الغیب دگوہر انتخاب)

دل کا حاکم جان کا مالک غم جانانہ تھا — میہماں جسکو میں سمجھا تھا وہ صاحب خانہ تھا — رفعت

گل سراپا گوش بنتے کیوں نہ سننے کیلئے — چھیڑے بلبل کے گلشن میں ترا افسانہ تھا — ہمہ اوست

دار پر چڑھ کر انا الحق جو کہا منصور نے — وہ بھی اک تیرا کرشمہ ہمت مردانہ تھا — تشویق ہمت

یار اُدھر بدمست میں بیخود تکلف برطرف — ایسی صحبت میں جو آتا ہوش کیا دیوانہ تھا — خلوت وصل

حال میرا سنکے وہ بولے کہ جی دکھنے لگا — ہائے کس کمبخت کس بیدرد کا افسانہ تھا — تغافل

دیر کی تحقیر کر اتنی نہ اے شیخ حرم — آج کعبہ بن گیا کل تک یہی بتخانہ تھا — شوخی۔ واقعہ

پوچھتا پھرتا ہے غم اسکا مرے سینے میں اب — کیا ہوا وہ جو یہاں دل نام اک ویرانہ تھا — درد۔ تیر کا رنگ

[۱]آنکھوں میں نور تیرا دل میں سرور تیرا — دروازے سے ہے گھر تک سارا ظہور تیرا — تصوف

۱؎ پوری غزل اسی رنگ میں ہے۔

میں آئینہ ہوں تیرا تو آئینہ ہے میرا	تجھ میں ظہور میرا مجھ میں ظہور تیرا	تصوف
مدہوش عشق ہو کر جا بزم معرفت میں	پردہ نہ بیچ میں ہو غافل شعور تیرا	״
پڑا صد شکر جو داغ اپنے سینے میں جدائی کا	ستارہ بن گیا آخر وہ صبح آشنائی کا	استعارہ
ترے بندوں سے کرتے ہیں یہ بت دعوے خدائی کا	تماشا دیکھتا ہوں تیری شان کبریائی کا	حمد
نیا افسانہ کہہ زاہد تو شاید گرم ہو مجلس	قیامت تو پرانا حال ہے روز جدائی کا	زبان۔ شوخی
کیا رسوائے عالم چھپکے پردے میں مجھے تو نے	تری عصمت کے سر پر خون میری پارسائی کا	رفعت تخیل
ان شوخ حسینوں پہ جو مائل نہیں ہوتا	کچھ اور بلا ہوتی ہے وہ دل نہیں ہوتا	تشویق محبت
دل مجھ سے لیا ہے تو ذرا بولیے ہنسیے	چٹکی میں مسلنے کے لیے دل نہیں ہوتا	زبان۔ تیور
راحت کا نکلتا نہیں اس کی کوئی پہلو	مایوس بھی کمبخت مرا دل نہیں ہوتا	لاتقنطوا من رحمۃ اللہ
تیر اس نے لگایا وہ پڑا آکے جگر پر	بےچین ہے وہ کیا جانے ادھر دل نہیں ہوتا	حسن کی بےخبری
وہ ہم ہیں کہ زندہ ہیں اور اس کوچے میں پہنچے	بے موت کوئی خلد میں داخل نہیں ہوتا	موتوا قبل ان تموتوا
غم نہیں جی تن سے نکلا دل گیا	مل گئے تم مجھ کو سب کچھ مل گیا	حاصل زندگی یہی ہے
کچھ تو سبب ہے گردش لیل و نہار کا	اس پر پڑا ہے صبر کسی بے قرار کا	بلندی تخیل
جھونکا ادھر نہ آئے نسیم بہار کا	نازک بہت ہے پھول چراغ مزار کا	بلاغت
یارب مٹے نہ دل سے کبھی داغ آرزو	ٹھنڈا نہ ہو چراغ شب انتظار کا	لذت فراق
آئیں وہ یا نہ آئیں ترس کھائیں یا نہ کھائیں	کیا اختیار گریۂ بے اختیار کا	درد
جمال یار کو کہتے ہو تم کہ ہاں دیکھا	کلیم ہوش میں آؤ ابھی کہاں دیکھا	تیور۔ تصوف
پھنسی جو دام میں بلبل تو کن نگاہوں سے	کبھی چمن کو کبھی سوئے آشیاں دیکھا	تصویر حسرت
دکھائی ترک تعلق نے شان بیرنگی	بڑھے مکان سے آگے تو لامکاں دیکھا	تصوف
کہیں گے وقت ملاقات ان سے اتنی بات	جو کچھ سنا تھا وہ آنکھوں سے مہرباں دیکھا	سہل ممتنع
سخی ساتھ دنیا سے کیا لے گیا	مگر جو کسی کو دیا لے گیا	اخلاق
ادھر بھی کرم لے نسیم بہاری	ترستا ہے پھولوں کو مدفن کسی کا	درد
دیکھو جو کچھ سامنے آجائے منہ سے کچھ نہ بول	آنکھ آئینے کی پیدا کر دہن تصویر کا	تشبیہ نادر۔ اخلاق

موقوف بیخودی پہ ہے جلوہ حبیب کا	اپنی خودی پہ ہے مجھے دھوکا رقیب کا	تصوف
اللہ رے پاس عشق میں مجکو حبیب کا	آنسو ٹپک پڑے جو دُکھا دل رقیب کا	اخلاق
صیاد کچھ تو پاس ہے لازم غریب کا	لٹکا دے شاخ گل سے قفس عندلیب کا	درد
ملک الموت جسے کہتے ہیں	زندگی بھر ہے نگہباں میرا	بلاغت
وہ دن کہاں ہیں جو رہتا تھا دلسے شکوہ یار	اب اُس سے جاکے میں کرنے لگا گلہ دل کا	بلاغت
ملے ہیں شرر کے مجھے بال و پر	اڑا اور بے بال و پر ہوگیا	رفعت
دیا مژدہ آبرد اشک کو	جو پانی کا قطرہ گہر ہوگیا	بلاغت
غضب اشکباری سے عقدے پڑے	کہ کوتاہ تار نظر ہوگیا	رفعت
ہائے بیدرد کیا مزہ ہوتا	تیرے پہلو میں دل مرا نہوا	زبان
دھوم تھی ان کی لن ترانی کی	کیا کہیں ہم سے سامنا نہوا	زبان
تیس دن مے پلائی ساقی نے	ایک روزہ مرا قضا نہوا	زبان ۔ شوخی
داغ دل سوز تو ہوا اسے درد	تو کسی درد کی دوا نہ ہوا	زبان
مجکو درد آشنا کیا لیکن	درد خود درد آشنا نہوا	بلاغت
ایسا تری رحمت پہ بھروسا ہے کہ مجھ سے	احسان اٹھایا نہیں جاتا ہے دعا کا	یقین رحمت
کیا جانیے کیا ہے ترے بیمار کی حالت	عیسے بھی یہ کہتے ہیں کہ ہے وقت دعا کا	درد
کچھ نیند نے کچھ نشئہ نے شوخی کی کمک کی	مشکل سے شب وصل اٹھا پردہ حیا کا	تصویر کھینچدی ہے
کچھ ٹھکانا سہے ناتوانی کا	نہ اٹھا بوجھ زندگانی کا	بلاغت
داغ دلمیں جو ہے جوانی کا	گل ہے یہ شمع زندگانی کا	رفعت
مرگ جسکو جہاں میں کہتے ہیں	نام ہے میری زندگانی کا	تلخی زیست
حریم کوچہ قاتل کی راہ گر لینا	سمند عمر سے اے شہسوار اتر لینا	رفعت
دم اخیر ہے لازم نظارہ کر لینا	خدا سے کام پڑا ہے بتو خبر لینا	زبان شوخی
جگر سے اٹھتے ہیں شعلے کہ دلسے اے ہمدم	کدھر یہ آگ لگی ہے ذرا خبر لینا	زبان
دیکھتے چاہ سے تم پیار سے ہم تو شب وصل	دلمیں جو کچھ تھا وہ آنکھوں سے نمایاں ہوتا آنکھیں ترجمان دل ہیں	

لطف حسرت کی نگاہوں کا تو جب تھا کہ امیر   ان نگاہوں کا کوئی دیکھنے والا ہوتا   درد
اٹھکے اس محفل سے گھبراہٹ کا احساں رہ گیا   زانوئے جاناں کے نیچے دب کے داماں رہ گیا   تصویر
بوسے کی لذت میں بھولے شکوۂ دشنام یار   عیب منعم پردۂ ہمت میں پنہاں رہ گیا   تشبیہ
وائے حسرت مار ڈالا مجکو شوق قتل نے   ذبح کرنے کا مرے قاتل کو ارماں رہ گیا   انتہائے شوق
عجب قدرت حق کے اے بت ہیں کھیل   کہ مٹی کے پتلے کو گویا کیا   حمد
موقوف جرم ہی پہ کرم کا ظہور تھا   بندے اگر قصور نہ کرتے قصور تھا   شوخی اور حقیقت بھی
اے برق حسن یار یہ اچھا ظہور تھا   دیدار کو کلیم تھے جلنے کو طور تھا   زبان، تیور، شوخی
جبتک کہ چشم شوق میں وحدت کا نور تھا   جس بام پر نگاہ پڑی کوہ طور تھا   تصوف
دشمن مری برائی کریں اور تم سنو   ان سے نہ تھا بعید مگر تم سے دور تھا   اخلاق
مجکو کیا جس کو جب ملیں گے آپ   وہ یہ پوچھے گا کب ملیں گے آپ   بلاغت
خبر آمد گل کیسی سنائی صیاد   یوں ہی ہم جلتے تھے اور آگ لگائی صیاد   درد
بہار لالہ و گل پھر کبھی کا ہے کو دیکھیں گے   چلے ہیں اس چمن سے ہم نگاہ واپسیں ہو کر   ″
کدورت کب جگہ پاتی ہے دل میں صاف طینت کے   نہ کھا گرد کو جتنے کبھی دریا کے دامن پر   رفعت تشبیہ اخلاق
اگر قابل رفو کرنے کے چاک جیب گل ہوتا   تو اشک چشم بلبل سے میں لکھتا آب سوزن پر   رفعت تخیل
مرا تو کیا ذکر سایے سے بھی وہ شوخ کہتا ہے یہ جھجک کر   یہ کیا قرینہ ہے بیٹھنے کا ادب سے بیٹھو ذرا سرک کر   تصویر
جو تیرے احسان ہیں ضعف پیری میں شکر انکا ادا کروں کیا   دعائیں دیتی ہے ہڈی ہڈی مرے بدن کی چٹک چٹک کر   ″
ہماری مستی تو دیکھ زاہد کہ بتکدے میں شراب اگر پی   ہوئی یہ نشے میں لغزش پا حرم میں ہم جا گرے بہک کر   تصوف کی شان
رو سیاہ جرم الفت بے قصور آیا نظر   سطر قرآں کی طرح ظلمت میں نور آیا نظر   تشبیہ کیا الہام ہے
حقا کہ دو جہاں میں ہے ذات اللہ ایک   دو آنکھیں جسطرح کہ ہے انکی نگاہ ایک   ″

ملا جب وہ کھلا تب یہ معما   کیا کرتے تھے اپنی جستجو ہم   تصوف
کسی سے کوئی کچھ کرتا ہو باتیں   سنا کرتے ہیں تیری گفتگو ہم   ″

نیرنگیاں ہیں کیا چمن روزگار کی   خوشبو تو گل نے دی ہے بنی ہے صبا کریم   اخلاق
ہے قصد شب غم میں کریں دل ہی سے باتیں   پھر کہتے ہیں دیوانے سے کیا بات کریں ہم   رنگ میر

اسکی حسرت ہے جسے دل سے مٹا بھی نہ سکوں	ڈھونڈنے اسکو چلا ہوں جسے پا بھی نہ سکوں	حوصلۂ عشق
چٹکیاں لینے سے دل میں وہ کریں تو انکار	داغ کچھ درد نہیں ہے کہ دکھا بھی نہ سکوں	زبان۔تیور
میں کسی سے نہ کہوں گا وہ کریں وعدہ وصل	راز الفت یہ نہیں ہے کہ چھپا بھی نہ سکوں	شوخی
ہائے کیا سحر ہے یہ حسن کہ مانگیں جو حسین	دل بچا بھی نہ سکوں جان چرا بھی نہ سکوں	افسون حسن
رعب کو ساتھ لگا لائے ہیں اپنے شب وصل	کہ جو اُٹھیں تو خوشامد سے بٹھا بھی نہ سکوں	ادا بندی
وصل کیسا ترے نادیدہ خریداروں میں ہوں	واہ رے قسمت کہ اسپر بھی گنہگاروں میں ہوں	جرم عشق

ہم لوٹتے ہیں وہ سو رہے ہیں — کیا ناز و نیاز ہو رہے ہیں
کیا رنگ جہاں میں ہو رہے ہیں — دو ہنستے ہیں چار رو رہے ہیں
دنیا سے الگ جو ہو رہے ہیں — تکیوں میں مزے سے سو رہے ہیں
پہنچی ہے ہماری اب یہ حالت — جو ہنستے تھے وہ بھی رو رہے ہیں
سوتے ہیں لحد میں سونے والے — جو جاگتے ہیں وہ رو رہے ہیں
میں جاگ رہا ہوں اے شب غم — پر میرے نصیب سو رہے ہیں
ارباب کمال چل بسے سب — سو میں کہیں ایک دو رہے ہیں
محفل برخاست ہے پتنگے — رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں
ہے کوچ کا وقت آسماں پر — تارے کہیں نام کو رہے ہیں
ان کی بھی نمود ہے کوئی دم — وہ بھی نہ رہیں گے جو رہے ہیں
آئے گی نہ پھر کے عمر رفتہ — ہم مفت میں جان کھو رہے ہیں
کیا گریۂ بے اثر سے حاصل — اس رونے پہ ہم تو رو رہے ہیں
فریاد کہ ناخدائے کشتی — کشتی کو مری ڈبو رہے ہیں
پیری میں بھی ہم ہزار افسوس — بچپن کی نیند سو رہے ہیں
ٹھہرو دم نزع دو گھڑی اور — دو چار نفس ہی تو رہے ہیں
روئیں گے ہمیں رلانے والے — ڈوبیں گے وہ جو ڈبو رہے ہیں
زانو پہ امیر سر کو رکھے — پہروں گزرے کہ رو رہے ہیں[۵]

[۵] قادر الکلامی اسی کا نام ہے - درد دل اسکو کہتے ہیں - پوری غزل ایک رنگ میں ہے - ع تو نے جس جامے کو پہنا تجکو زیبا ہوگیا

کیا دخل جاسکے کوئی اس جلوہ گاہ میں | غمزہ چھری لیے ہوئے بیٹھا ہے راہ میں[1] | جدت
وہ دیکھتے ہیں خون تمنا جما کے آنکھ | مہندی لگائی جاتی ہے پائے نگاہ میں | جدت۔ رفعت
ہوئے ہم قتل جب جلسہ نظر آیا حسینوں کا | بتایا خون ناحق چلو چلو گلنداروں میں | نیا مضمون "خون ناحق"
جب تڑپتا ہے دل میں ڈرتا ہوں | چرخ پر جا پڑے زمیں نہ کہیں | رفعت
دل سی شے لیکے اب تو نکلے ہیں | پوچھ لے گا کوئی کہیں نہ کہیں | زبان
دیکھئے تو اسی میں ہے سب کچھ | کون کہتا ہے کچھ بشر میں نہیں | تصوف
بے نیازی اُسطرف ہے اسطرف بالکل نیاز | حد فاصل ہے تو یہ ہے بندہ واللہ میں | فرق عبد و معبود
شمع کی مانند طے کی راہ ہستی اسطرح | پائمال اپنے ہوئے ہم رفتہ رفتہ راہ میں | رفعت تشبیہ
اسواسطے کہ ایک ہی ہو میری اسکی شکل | منہ دیکھتا ہوں آئینۂ روئے یار میں | مسلک تصوف
بدلی ہے رُت چمن کا ہے جوبن ابھار پر | کیا کیا بھرے ہیں گال گلوں کے بہار میں | تصویر۔ نیچرل
جو شوخ طبع ہیں وہ جھپکتے نہیں کہیں | بجلی کٹار کھینچ کے آئی ہزار میں | جدت۔ شوخی کی تصویر
کیا بے ثبات باغ تھا گل ہو گئے ہوا | جب تک کہ دوں میں چاک گریباں بہار میں | بے ثباتی
جی لوٹ ہے تڑپنے پہ اب تک مگر امیر | اب جان ہی نہیں ہے دل بیقرار میں | لذت فراق
غنچے کہتے ہیں کہ کیا جلد گزرتی ہے بہار | مسکرا لینے کی فرصت بھی گلستاں میں نہیں | درد
لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں | بہار جھول رہی ہے خوشی سے جھولوں میں | نیچرل تصویر بہار
وہ گلعذار کہ تلتے تھے روز پھولوں میں | انھیں کی خاک شریک آج ہے بگولوں میں | رفعت۔ نیرنگ زمانہ
یہی ہے شرم تو وہ آچکے آغوش میں میری | جھکا لیتے ہیں آنکھیں چاند ہوتا ہے جو ہالے میں | انتہائے حیا
کہا جو میں نے کہ رُخ سے کبھی نقاب الٹو | تو ہنس کے بولے وہ منظور قتل عام نہیں | بلاغت
پتا پاتے ہیں یوسف کا وہی لوگ | جو اپنے پیرہن میں ڈھونڈتے ہیں | تصوف
ترے کرم میں کمی کچھ نہیں کریم ہے تو | مرا قصور ہے جھوٹا امیدوار ہوں میں | ناامیدی پر ندامت
پھر آج میں نے نئی پی ہے حضرت واعظ | ازل کا مست پرانا شرابخوار ہوں میں | تصوف
خلوت میں بیخودی سے پتا ہی کہیں نہیں | کیا سیر ہے وہاں کہ ہمیں ہیں ہمیں نہیں | ”

[1] اس نئی راہ کے ایجاد کا سہرا بھی حضرت امیرؔ ہی کے سر ہے۔

شوخی کا ہاتھ اٹھ کے پکڑ لے شبِ وصال	اتنی بھی کام کی نگہ شرمگیں نہیں	جدت
عزیز احباب ساتھی دم کے ہیں پھر چھوٹ جاتے ہیں	جہاں یہ تار ٹوٹا سارے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں	درد۔ اخلاق
الٰہی کیا علاقہ ہے وہ جب لیتا ہے انگڑائی	مرے سینے میں سب زخموں کے ٹانکے ٹوٹ جاتے ہیں	بلاغت
حباب آسا محیطِ عشق سے جو پار اترتے ہیں	گزر جاتے ہیں پہلے سر سے پیچھے پاؤں دھرتے ہیں	رفعت تخیل
تفاوت کس قدر ہے زاہدوں میں اور رندوں میں	کہ وہ کچھ دم لیے رہتے ہیں یہ سب کر گزرتے ہیں	اخلاق
پڑی ہیں انکی آنکھیں آئینے میں خطِ عارض سے	غزالانِ حرم فردوس کے سبزے میں چرتے ہیں	جدت تخیل۔ تلاش
پڑے ہیں ابروؤں پہ بل یہ کیوں ترچھی نظر کیا ہے	یہ دوہرے دوہرے خنجر آپ کس پر تیز کرتے ہیں	״
[1] شوخی تھی قیامت تری مستانہ اداؤں میں	فتنوں نے قدم چوم لیے لغزشِ پا میں	جدت
شرمائی ہوئی چتونوں پر اس کی نہ جانا	شوخی بھی چھپی بیٹھی ہے پہلوئے حیا میں	״
شرماتے ہیں جب وصل میں وہ مجھ سے تو شوخی	لے لیتی ہے چٹکی دہیں پہلوئے حیا میں	״
کہنے کی بات ہو تو کسی سے کہے کوئی	دل تم نے لے لیا ہے یہ دلبر سے کیا کہیں	سہل ممتنع
کیجئے شوخی وہ جس سے شرم کے انداز ہوں	پھاڑیے کپڑے مگر سب چاک بے آواز ہوں	اخلاق۔ انداز بیان
ملال کس سے کہوں کوئی آس پاس نہیں	شریکِ غم فقط اک دل اُسے ہواس نہیں	درد۔ میر کا انداز
امیدِ جواب کی ہو کیا خاک	جب اُس سے نہو سوال ممکن	سہل ممتنع۔ وسعت تخیل
کھا کے تلوار جو قاتل کی فغاں کرتا ہوں	لذتِ زخم رقیبوں سے نہاں کرتا ہوں	نیا مضمون
اس رشک کا بُرا ہو کہ گلیوں میں خلق سے	کہتا ہوں تجکو میں یہ مراد لربا نہیں	بلاغت
ٹھہر ٹھہر کے ذرا لے چلو مرا تابوت	کہاں امید کہ پھر آؤں کوئے قاتل میں	درد

[1] اس جدت کے متعلق حکیم سید محمد مرتضےٰ صاحب رسا لکھنوی نبیرۂ جناب مرزا اوج مرحوم (خلف مرزا دبیر مغفور) نے ایک مرتبہ بسبیل تذکرہ بیان کیا کہ زمانۂ طالب علمی میں میں ایک دن حضرت امیرؒ کا دیوان دیکھ رہا تھا کہ نانا ابا مرحوم (مرزا اوج) آگئے مجھ سے پوچھا کون کتاب دیکھ رہے ہو۔ میں نے عرض کیا دیوان امیر مینائی۔ خوش ہوئے اور فرمایا کہ ضرور دیکھا کرو۔ بہت فائدہ پہنچے گا۔ حضرت امیرؒ بڑے پایے کے شاعر تھے اور انھوں نے شاعری میں بعض نئی نئی راہیں نکال دی ہیں جو بہت ہی پر لطف ہیں۔ اسکے بعد مزے لے لے کر یہ اور اسی قسم کے انکے اور اشعار پڑھے اور فرمایا اس راہ کے موجد وہی ہیں اور غالباً انھیں پر یہ ایجاد ختم بھی ہو گیا۔

تیرے وعدے پہ شاد ہوں کیونکر | اپنی قسمت کو جانتا ہوں میں | درد
دعائے مرگ فرقت میں جو مانگی | محلے والے چلائے کہ آمین | بلاغت شوخی کے

الفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو | ہر بات میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو | لذت عشق
آئے جو مری لاش پہ وہ طنز سے بولے | اب میں ہوں خفا تم سے کہ تم مجھ سے خفا ہو | چونچلا
تو صورت دریا ہے حباب اہل جہاں ہیں | تیرا ہے تری راہ میں سر جس کا فدا ہو | تصوف
آئے جو دم نزع کہا ہنس کے سدھارو | پریوں کو تو چاہا بہت اب حوروں کو چاہو | چونچلا
ہنس ہنس کے چھری پھیر گلے پر مرے قاتل | آخر کی تڑپ ہے یہ کچھ اس میں تو مزا ہو | بلاغت
رحم اس دل پر داغ پہ اے الفت مژگاں | کانٹوں میں نہ کھینچ اسکو جو پھولوں میں پلا ہو | دوسرے مصرع
پردے میں تم ہو اس پہ یہ عالم ہے حسن کا | پردے سے باہر آؤ تو کیا جانے کیا کرو | تصوف
اے تیغ یار مل کے گلے سے جدا نہو | اب روٹھنے کا وقت نہیں ہے خفا نہو | درد
ہے ایک عمر سے مہماں اسے ملال نہو | شب فراق میں ذکر شب وصال نہو | بلاغت۔ اخلاق
خوشی کی دل میں تمنا بھی کر نہیں سکتا | خیال ہے ترے غم کو کہیں ملال نہو
ساری دنیا مجھے اس پردے میں اللہ نے دی | کہ دیئے آنکھوں میں رکھ لینے کو دل مجکو | شکر نعمت
باغباں ہاتھ لگاتا نہیں پھولوں کو ترے | آ نکلتا ہوں کبھی دل کے میں بہلانے کو | درد
اول عشق میں یہ حال امیر | تم تو آغاز ہی میں آخر ہو | درد۔ انداز میر
اس ادا سے کیا شہید اس نے | خوں بہا مل گیا شہیدوں کو | حسن کی قدر قیمت
امیر ایسی کہاں قسمت کہ پہنچوں اڑ کے پھولوں تک | کبھی جا کر قفس سے جھانک لیتا ہوں گلستاں کو | درد
سبز عمامہ بسنتی ہے عبا ریش سفید | نو بنو رنگ ہیں اعظم کے عجب شان ہے کچھ | شوخی۔ تصویر

دوسرا کون ہے جہاں تو ہے | کون جانے تجھے کہاں تو ہے
لاکھ پردوں میں تو ہے بے پردہ | سو نشانوں پہ بے نشاں تو ہے
جسم کہتا ہے جاں ہے تو ہی | جان کہتی ہے جان جاں تو ہے
رنگ تیرا چمن میں بو تیری | خوب دیکھا تو باغباں تو ہے
محرم راز تو بہت ہیں امیر | جس کو کہتے ہیں رازداں تو ہے

تصوف۔ ہمہ اوست کا ایک نظر میں

پردے سے اسکی ذات کو کیا کام تھا امیر	چھپ کر صفات نامتناہی میں رہ گئی	تصوف
ساقی تری محفل میں ہوں میں تشنہ جگر بھی	صدقے تری آنکھوں کے کوئی جام ادھر بھی	سودا سے بڑھ گئے
غیروں سے ہیں باتیں بھی عنایت کی نظر بھی	پر دیکھتے جاتے ہیں کنکھیوں سے ادھر بھی	تصویر
فیصلہ کر رہے ہیں مجنوں کا	بیچ میں پڑ کے پردے محمل کے	کیا ذومعنین فیصلہ ہے
غم کونین سے مجھے کیا کام	کسی کونے میں پڑ رہے دل کے	بلاغت
مجاز میں بھی ہے اپنی نظر حقیقت پر	بتوں کی راہ میں پھرتے ہیں ہم خدا کیلئے	تصوف
وہ آئین نزع میں چلتی نہیں زباں نہ چلے	نگاہ یاس تو ہے عرض مدعا کے لئے	درد۔ بلاغت
نگاہ لطف بھی خالی نہیں ہے شوخی سے	کسی ادا کو تو رکھ چھوڑیے حیا کے لئے	اخلاق
کس مے کے ہیں سائل یہ حباب لب دریا	خالی ہے جو اک ایک قدح ہاتھ میں سب کے	بلاغت۔ رفعت تخیل
قرآں میں امیر آئے ہیں حوروں کے جو اوصاف	در پردہ وہ انداز ہیں سب حسن طلب کے	بلاغت۔ شوخی
اے دل اس دور میں سنتا نہیں ایسی کوئی	یہ کر اس قصے کو اب ذکر وفا رہنے دے	اخلاق
بے پر و بال ہوں طاقت نہیں اڑنے کی صبا	اک ذرا شاخ نشیمن کو جھکا رہنے دے	حسرت۔ معذوری سے طلب امداد
روسیہ ہوں سر محشر نہ بلا داور حشر	مجھکو تو خاک کے پردے میں چھپا رہنے دے	شرم عصیاں
اے فلک گور غریباں کو تو برباد نہ کر	اس لٹے قافلے کا کچھ تو پتا رہنے دے	تشبیہ۔ حسرت بار
چبھ رہی ہیں دل پر داغ میں پلکیں کسکی	تلتے ہیں پھولوں میں کانٹے یہ چمن کسکا ہے	پرانی تشبیہ میں نیاپن
نظر آتی ہے کہیں جب نئی چادر کوئی	دل دھڑکتا ہے کہ یارب یہ کفن کسکا ہے	موت کو یاد رکھو
پھر وہ چمکے نصیب فرقت کے	تم چلے دن پھرے قیامت کے	بلاغت
کیا کیا کوہکن سے شیریں نے	بھاگ سایے سے بیمروت کے	اخلاق
دونوں عالم ہوئے تہ و بالا	تم تھے پردے میں کیا قیامت کے	بلاغت
جس کو دیکھا حسین لوٹ گئی	ہم تو عاشق ہیں اس طبیعت کے	قدر حسن
رکھکے خنجر گلے پہ کہتے ہیں	کیوں چکھا دوں مزے محبت کے	تصویر
گلگوں روتے ہیں ہم امیر لہو	زخم کوئی جو مسکرایا ہے	درد۔ انداز میر
چاک کرنے کی وضع پوچھتی ہے	صبح محشر مرے گریباں سے	رفعت

دست وحشت سے بیشتر اٹھے — آگے چل نکلے ہم گریباں سے — رفعت

حسن اور عشق ہم آغوش نظر آ جاتے — تیری تصویر میں کھنچ جاتی جو حیرت میری — بلندی تخیل

بے ترے حالت ہے یہ گلزار کی — نکہت گل سانس ہے بیمار کی — تشبیہ نو

حال مجھسے سر پٹکنے کا نہ پوچھ — دیکھ لے حالت در و دیوار کی — بلاغت

ہجر میں باقی نہیں کچھ میرے پاس — اک شکایت ہے تو وہ بھی یار کی — //

گل ترے عارض کے دیوانے ہوئے — پھاڑ کے کپڑے راہ لی بازار کی — مضمون آفرینی

عاجزی کس دن مرے گھر سے گئی — ہے وہی افتادگی دیوار کی — اخلاق

پھر بہار آئی ہے پھر ہم کو جنوں ہوتا ہے — کیا دن آئے ہیں فراغت سے گزرنے والے — تشویق عشق

جائے شکوہ مری زباں پہ امیر — شکر بے اختیار آتا ہے — تسلیم و رضا

بیعت پیر مغاں سے مل گیا بام مراد — سلسلہ پیدا ہوا رفعت کا سیڑھی لگ گئی — مسئلہ طریقت

تن منقش بوریے سے ہے اگر کیا فائدہ — فقر کے جامے کو زینت دے وہ آتو اور ہے — ریا

مل گیا ہوں تجھ میں میں ہر چند مثل آب و رنگ — شوق کہتا ہے ابھی میں دور ہوں تو اور ہے — تصوف

رنگ گلزار تحیر نظر آیا جب سے — غنچہ ساں بند ہیں لب لذت خاموشی سے — //

واصل سمجھئے اسکو جو سالک ہے عشق میں — منزل پہ جانیے اُسے جو رہگزر میں ہے — //

کرتے ہیں اس طریق سے ہم طے رہ سلوک — سر اسکے آستاں پہ قدم رہگزر میں ہے — //

آ جاؤ تیغ باندھ کے پھر سیر دیکھ لو — میرے گلے پہ ہے کہ تمھاری کمر میں ہے — جذب شوق

ساقی مے طہور میں کیفیتیں سہی — پر وہ مزہ کہاں ہے جو تیری نظر میں ہے — معرفت

آئینہ سامنے آتا ہے عوض لینے کو — ہوشیار او مرے دیوانہ بنانے والے — اخلاق

جام مے کاتب اعمال کو بھی دے ساقی[1] — دو بزرگ آئے ہیں ساتھ اگلے زمانے والے

---

[1] صبا نے بھی کہا ہے ؎ کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے ۔ خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے۔ مگر امیر کی شوخی بہت بڑھ گئی ہے ۔ مرحوم نواب فصیح الملک نے بھی کہا ہے ؎ وادئ عشق کی سیریں کوئی ہم سے پوچھے ۔ خضر کیا جانے کبھی گھر سے نہ باہر نکلا (گلزار داغ) صبا کے دوسرے مصرع نے زبان میں کس قدر گھلاوٹ پیدا کی ہے داغ نے کبھی گھر سے نہ باہر نکلا شاید محاورے کی حیثیت سے کہا ہے مگر واقعے کے بالکل خلاف ہے اور ایک ڈھیلا سا مار دیا ہے

فنا جو قبل فنا ہو بقا کی راہ ملے | یہ قلعہ وہ ہے جہاں موت سے پناہ ملے | تصوف

انگور میں تھی یہ مے پانی کی چار بوندیں | جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے | تشبیہ۔ رفعت تخیل

جلوہ گر یار مگر قتل گہ عام میں ہے | جب بلاتا ہوں میں سنتا ہوں قضا کام میں ہے | غالب رنگ کا استعارہ

ہے لڑکپن میں بجا خاک سے انسان کو انس | عاقل آغاز سے اندیشۂ انجام میں ہے | تخیل بلند

کون کرتا ہے ادھر چشم ترحم سے نظر | شہر میں داغ جگر لالۂ صحرائی ہے | تشبیہ۔ شکایت زمانہ

موت کو ہم جو حیات ابدی سمجھے ہیں | ملک الموت کو بھی ناز مسیحائی ہے | نئی بات

زیست کیا گور میں بھی بعد فنا ساتھ دیا | یار ثابت جسے کہتے ہیں وہ تنہائی ہے | اخلاق

آغاز جوانی میں ادا اور ہی کچھ ہے | اٹھتی ہوئی کونپل میں مزا اور ہی کچھ ہے | تشبیہ

عارف سے یہ کہدو جو تری فہم میں آئے | وہ سب ہے ترا وہم خدا اور ہی کچھ ہے | تصوف

کہتے ہو کہ ہم درد کسی کا نہیں سنتے | میں نے تو رقیبوں سے سنا اور ہی کچھ ہے | بلاغت

عادت تو امیر اچھی ہے فریاد و دعا کی | پر شیوۂ تسلیم و رضا اور ہی کچھ ہے | شان تسلیم و رضا

آنا تو بتا ہجر کی شب صبح کا پایا | صد شکر کہ بالوں میں سفیدی نظر آئی | بلاغت

جو سمجھے کہ میں ہوں زمانے سے چھوٹا | وہی فی الحقیقت بڑا آدمی ہے | درس۔ اخلاق

امیر کو کس نے تشنہ مارا کہ اب بھی پانی کا ہے تقاضہ | غبار اٹھتا نہیں ہے بیجا تلاش ابر بہار میں ہے | ندرت خیال

ذرا ٹھہرو ابھی جوڑا نہ کھولو | نزاکت پوچھ لے پہلے کمر سے | جدت۔ تصویر

نہیں سنتی اجل بھی میری فریاد | مگر سیکھے ہیں یہ غمزے اثر سے | جینے سے بیزاری

تبسم نے نمک چھڑکا یہ کہکر | میں ہنستا ہوں ترے زخم جگر سے | چونچلا

میں ہوں عاجز اور اسکو عاجزی مطلوب ہے | بے نیازی اسکی میرے ناز برداروں میں ہے | بندے کی شان

شوخ وہ ہم مضطرب وہ نازنیں ہم ناتواں | ملتی جلتی یار سے ہے بات جو یاروں میں ہے | ہمرنگی حسن و عشق

یوں پھبتی ہے مرے آنسو مرگ دشمن کی خوشی | ہو نہیں وہ ناشاد شادی میرے غمخواروں میں ہے | ہمدردی

صورت آئینہ ہر صورت سے ہے وہ آشنا | یار اگر یاروں میں ہے عیار عیاروں میں ہے | تصوف

رکا خنجر جو دست نازنیں سے | چھری جھنجھلا کے لی چیں جبیں سے | جدت۔ نئی راہ

حذر مے سے مسلم اور جو واعظ | ملے دست بتان نازنیں سے؟ | شوخی

سوال بوسہ لب تک کیونکر آئے	حیا آتی ہے چشم سرمگیں سے	بلاغت. کیا بات کہی ہے
بچراؤ بھیک مانگو ان کو کیا کام	انھیں روز اک نیا دل دو کہیں سے	زبان. تیور
وہ صورت تصور سے ہٹنے نہ پائے	ترا حسن اے عشق کامل یہی ہے	مسئلہ طریقت
کمال طلب ہے جو خود ہو وہ طالب	وہ کھنچ آئے خود جذب کامل یہی ہے	تصوف
جو کہتا ہوں کہ میرا دم نکلتا ہے تو کہتے ہیں	ہمارے وصل کا ارمان تو یونہی نکلتا ہے	بچوچلا
ہم اتنی بات پر خوش ہیں کہ مذکور اپنی الفت کا	ہمیشہ ذکر حسن یار کے ہمراہ چلتا ہے	بلاغت
حسن انجام پہ اسلام کا ہے دار و مدار	تھے مسلماں وہ جو دنیا سے مسلمان گئے	اخلاق
آنکھ سے آنکھ ملی وصل میں تو دل نے کہا	وہ گلے ملنے کو ارمان سے ارمان گئے	بہت خوب
بیوفا جان نہیں ہوتی ہے اس پردے میں	تو ہی تھا تو ہی تھا ہم جان گئے جان گئے	تصوف
حق شناسی کی حقیقت کو انھیں نے جانا	اے امیر اپنی حقیقت کو جو پہچان گئے	من عرف نفسہ فقد عرف ربہ
وحشتوں کے وہ کہاں لطف اسیری میں امیر	اب وہ میدان وہ سنسان بیابان گئے	حسرت
اتنی باتیں کیوں سناتے تم مجھے	پیار کرتا ہوں میں اتنی بات ہے	بلاغت
مقتل کو وہ چلے تو ہٹانے کو بھیڑ بھاڑ	تیغ نگاہ کھنچ کے آگے ادا ہوئی	جدت
غافل نزول ہی تو کمال عروج ہے	خاک فنا ہی منزل آب بقا ہوئی	تصوف
نقطے کی سیر دائرہ معرفت میں دیکھ	ق تھی ابتدا جہاں سے وہیں انتہا ہوئی	
راز میخانے کے باہر نہوں میخانے سے	محتسب چھین نہ لے خط کہیں پیمانے سے	رفعت تخیل
نگہ شوق کی زور آوریوں کو دیکھا	آنچل آیا ہے کہاں ڈھلکے ترے شانے سے	جذب
نیم جاں کر کے مجھے چھوڑ چلا او قاتل	تیری بیدردی ہی اچھی تھی ترس کھانے سے	بلاغت
غیر کو دیکھ کے ساقی نہیں دیکھا کر	ہم نہیں پیتے چھلکتے ہوئے پیمانے سے	تشبیہ نادر
شیخ جی اٹھے تو لغزش نے قدم لیکے کہا	اٹھ کے کیوں بیٹھ گئے جاؤ نہ میخانے سے	جدت. شوخی
تیر نگہ ناز سے ہم بچ کے جو نکلے	غمزے سے چھری لیکے کیا ذبح ادا نے	جدت
میں امتحان میں پورا ہوا تو پھر کہیئے	ذرا سمجھ کے تقاضہ ہو امتحاں کے لیئے	بلاغت. زبان. تیور
نہ چوک وقت کو پاکر کہ ہے یہ وہ معشوق	کبھی امید نہیں جس سے جا کے آنے کی	اخلاق

ایسا ہے کون اسکو جو میری خبر کرے — اک آہ ہے سو وہ بھی جو پیدا اثر کرے — درد

عشق سے پیری میں بھی کچھ لاگ باقی رہگئی — کاروان عمر گزرا آگ باقی رہ گئی — استقامت عشق

جاری ہے لین دین یہ رسم زمانہ ہے — دریا کا ابر ابر کا دریا خزانہ ہے — نیچرل۔ اصول

تیر یوں دل ترے کوچے کیطرف جاتا ہے — جسطرح تیر کوئی سوئے ہدف جاتا ہے — تشبیہ

دل اس کا نرم کیا یہ دل نوحہ گر کرے — ڈر ہے کہیں نہ غیر کا نالہ اثر کرے — تخیل بلند

ہے مد نظر خون یہ کس کا کہ حنا نے — چومے ہیں ترے ہاتھ ترے پاؤں پڑی ہے — جدت

جب سے پیدا ہوئے صیاد کے بس میں آئے — پر نکلنے بھی نہ پائے کہ قفس میں آئے — درد

ہم بتوں سے امیدوار کرم — کارخانے ہیں اسکی قدرت کے — سہل ممتنع۔ بلاغت

بڑا ہے داغ سجود اور داغ عشق میں فرق — کہ ہے یہ دل کیلئے اور وہ جبیں کے لیے — تفوق عشق

عجب دلچسپ نقشہ عالم ایجاد رکھتا ہے — جو آنکھیں دیکھ لیتی ہیں اُسے دل یاد رکھتا ہے

سختی نہ وہ بھی دیکھ سکی میری نزع کی — گھبرا کے روح خانۂ تن سے نکل گئی — مضمون آفرینی

اک جا رہے ہمیشہ مگر مثل رنگ و بو — ہم سے نہ وہ ملے نہ کبھی ان سے ہم ملے — رفعت تخیل۔ یہ ص

افسانۂ سنگ و تیشہ ہے اور — یاں صحبت ناخن و جگر ہے — بلاغت

تکلیف ہے پر شکر گدا کو ہے مناسب — شاہوں کیطرح کچھ غم عالم تو نہیں ہے — ع جن کے رتبے

بیساختہ دل دکھا تو بولے — کیا جانیے آہ تھی یہ کس کی — انداز میر

قدر مرنے کی ہم سمجھتے ہیں — صدمے جھیلے ہیں زندگانی کے — درد۔ ״

پوچھو نہ اس زمانے میں الفت کا حال کچھ — اک رسم تھی قدیم سو موقوف ہوگئی — ״ ״

(از صنمخانۂ عشق و جوہر انتخاب)

ان اشعار کے دیکھنے کے بعد بھی جو مشتے نمونہ از خروارے ہیں کوئی یہ کہے کہ امیرؔ کے یہاں تخیل کی بلندی۔ جدت۔ نئے مضامین۔ صوفیانہ رنگ۔ درد۔ سوز اور تاثیر وغیرہ نہیں ہے تو سوا اسکے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ؎ گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ؛ چشمۂ آفتاب را چہ گناہ۔ ایک صاحب نے تو مخالفت میں یہاں تک زیادتی فرمائی ہے کہ "امیرؔ کے نعتیہ دیوان میں بھی دس بیس شعر ایسے نہ نکلیں گے جن سے اہل دل کے قلوب کو سرور اور ارباب نظر کی آنکھوں کو

نور حاصل ہو سکے۔" اس کا جواب بھی اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ؎ سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست۔ کسی کے دل میں اثر قبول کرنے اور سرور حاصل کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو تو اس کا کیا علاج اور شاعر اس کا کیا الزام ورنہ یہ وہ کلام ہے جس کی بدولت اُن حضرات نے جو واقعی درد دل رکھتے اور صاحب بصیرت ہیں حضرت امیرؒ کو سچا عاشق رسول تسلیم کر لیا اور محفل میلاد و سماع وغیرہ میں اس کو سنکر سر دھنتے اور حظ اٹھاتے ہیں۔

اصلیت یہ ہے کہ حضرت امیرؒ کے دونوں عاشقانہ دیوانوں اور مجموعۂ مفردات میں ہر رنگ کے اشعار ہیں اور دو چار نہیں سیکڑوں۔ ہاں تعصب اور ہٹ دھرمی کی عینک اتار کر ڈھونڈنا شرط ہے۔ دراصل اس کی زحمت کوئی گوارا نہیں کرتا اور ایک خیال یہ قائم کر لیا گیا ہے کہ امیرؒ کا کلام ان محاسن سے خالی ہے اور اسی بنیاد پر جو مضمون نگار قلم اٹھاتا ہے بغیر خود دیکھے بھالے خیالی عمارت تعمیر کرتا چلا جاتا ہے۔

لطیفہ:۔ ایک ایم۔ اے صاحب سے جو مذاق سلیم بھی رکھتے ہیں ایک بار حضرتؒ کی شاعری سے متعلق کچھ گفتگو ہوئی اور انھوں نے کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار فرمایا۔ میں نے بحث کا رخ چھوڑ کر حضرتؒ کے چند مختلف رنگ کے اشعار سنائے اور اُن سے پوچھتا گیا کہ آپ کے نزدیک یہ کس کا شعر ہے۔ وہ کسی کو میر و درد کا کسی کو مومن و غالب و آتش وغیرہ کا اور کسی کو زمانۂ حال کے کسی نیچرل شاعر کا بتاتے رہے۔ آخر میں جب میں نے یہ کہا کہ یہ سب شعر امیرؒ کے ہیں تو وہ کچھ کھوئے گئے اور میری طرف تعجب سے دیکھنے لگے۔ میں نے پوچھا "یقین نہیں آتا؟ ثبوت بہم پہنچاؤں؟" کہنے لگے "نہیں لیکن ایسا ہے تو یہ بڑی بے انصافی ہے کہ ان کی شاعری کو محض کنگھی چوٹی کے افسانوں اور رعایت لفظی تک محدود سمجھا جاتا ہے۔"

قدرداں چاہیے دیوان ہمارا ہے امیرؔ　　منتخب مصحفی و میر کے دیوانوں کا

اس میں شک نہیں کہ امیرؒ کے یہاں ایسے اشعار بھی ہیں جن میں لطف زبان محاورات کی بندش اور رعایت لفظی وغیرہ کے سوا کچھ نہیں یا جنھیں پست اشعار کہا جا سکتا ہے لیکن اول تو جہاں تک زبان وغیرہ کا تعلق ہے اس وقت زبان کو منضبط اور اس کی اصلاح کرنے کا کام بھی ان کے پیش نظر تھا (چنانچہ اس کی تکمیل کا سہرا امیرؒ ہی کے سر ہے) اور وہ ایسے اشعار کہنے کی ضرورت

سمجھتے تھے۔ آج ایسے ہی اشعار سے ہم کو الفاظ و محاورات وغیرہ کی سندیں ملتی ہیں۔ دوسرے دہلی یا لکھنؤ کے کسی شاعر کا دیوان جو اتنا ضخیم ہو اس قسم کے اشعار سے خالی نہیں ہے حتیٰ کہ غالب کے دیوان میں بھی جو ڈیڑھ جزو کا ہے اور کہنا چاہیے انتخاب الانتخاب ہے اس قسم کے اشعار نظر آتے ہیں۔ میر صاحب کے بھی بہتر و بہتر ہی نشتر مشہور ہیں لیکن ان کے آٹھوں دیوانوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو سیکڑوں اشعار ایسے ملتے ہیں جو ان کے شہور زمانہ رنگ پر دھبا لگاتے ہیں اور رطب و یابس کے تحت میں آتے ہیں۔

جس طرح میر سودا کے۔ ناسخ آتش کے۔ اور ذوق غالب کے حریف اور مدمقابل سمجھے گئے اور ان کی شاعری کی بابت لوگوں میں بحث رہا کی اسی طرح آخری غلطی یہ ہے کہ امیر و داغ بھی باہم حریف و مدمقابل خیال کیے گئے[1]۔ دونوں کی شاعری زیر بحث رہی اور گو ان دونوں بزرگوں کو دنیا سے اٹھے ہوئے کئی برس ہو گئے مگر یہ بحث اب تک زندہ ہے۔ کوئی شہر کوئی قصبہ ایسا نہ ہوگا جہاں یہ بحث نہ ہو بلکہ کسی گانو میں بھی اگر شعر و سخن کا کچھ چرچا ہے تو وہاں بھی ان دونوں شاعروں کے کلام پر بحث ہوتی رہتی ہے۔

احباب کا حد سے بڑھ کر اصرار ہے کہ اس کتاب میں امیر و داغ کی شاعری کا موازنہ بھی ضرور کیا جائے لیکن میرے خیال میں اس بحث کا فیصلہ ہوا ہے نہ ہوگا۔ البتہ وہ زمانہ آتا جاتا ہے کہ دونوں کے شعر و سخن کا مزہ لوگ رفتہ رفتہ بھول جائیں گے۔ کیونکہ مذاق سخن بدل چلا ہے ایک نئی شاعری کا دور شروع ہو گیا ہے اور لوگوں کو (الا ماشاء اللہ) اُسی میں کچھ مزہ آ چلا ہے ؎ ترک لذت بھی نہیں لذت سے کم۔ کچھ مزہ اس کا بھی چکھا چاہیے (امیر)

میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ امیر کو ہر صنف شاعری پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ وہ ہر رنگ پر قادر اور فن شاعری کے استاد مسلم الثبوت تھے۔ بڑے بڑے شاعر بھی اپنے شعر و سخن میں اُن سے مشورہ کرتے تھے[2]۔

---

[1] میرے خیال میں اس بحث کی ابتدا حسد کی وجہ سے ہوتی ہے رفتہ رفتہ عام طور پر یہ مباحثہ ہونے لگتا ہے۔

[2] غالباً ۱۸۸۳ء میں چندوسی سے رات کی ریل پر میں روانہ ہوا۔ کاکوری صبح کو پہنچا (اُن دنوں منشی صاحب رح وہیں مقیم تھے) فرمایا "تم رات بھر سوئے نہ ہوگے یہاں نیند نہ آئے گی باہر کمرے میں میرا پلنگ بچھا ہے وہاں تنہائی ہے جا کر سو رہو"۔ میں جا کے لیٹا تو مگر نیند نہ آئی۔ حضرت رح کے بستے کو میں نے دیکھا کہ کچھ دیکھنے کو ملے (بقیہ ص ۲۲۷ پر)

آمیر کی غزل میں ہر رنگ کے شعر ہیں اور اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کافی سے زیادہ ان کے اشعار لکھ گیا ہوں۔ داغ کی غزل[1] میں زبان کی صفائی اور مضمون میں شوخی ہے تو اس وصف میں بھی آمیر کے ہزاروں شعر ہیں۔ آمیر کی غزل ایک گلزار ہے جس میں ہر رنگ کے خوشبو اور خوش رنگ پھول ہیں اور داغ کی غزل ایک چمن ہے جس میں بیلے اور چمیلی ہی کے پھول نظر آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب زمین ان کے موافق اور مناسب نہیں ہوتی تو وہ اپنی بہار نہیں دکھا سکتے۔

آمیر کی فکر دونوں جہاں کی موجودات سے تخیل پیدا کرتی ہے اور داغ کے یہاں چند مضامین کا ایک مجموعہ ہے وہ ہمیشہ اُسی سے کام لیتے ہیں اور اُن سے وہ کبھی نہایت مزے کی باتیں پیدا کرتے ہیں۔ کبھی ان کی کوشش کامیاب نہیں ہوتی۔ اس زمانے میں "گلزار داغ" میں نے بالاستیعاب دیکھا۔ مثال کے طور پر ایک حشر کا مضمون ہے جو قریب قریب ان کی ہر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۶) تو شاید نیند آجائے۔ اور یہی حضرت ریاض کے دیوان کے کچھ اجزا ملے مگر اس کے نیچے ہی مثنوی "چراغ کعبہ" نظر آئی تو اُسی کو لے کر میں دیکھنے لگا۔ اتنے میں آپ یہ دیکھنے کہ میں سوتا ہوں یا نہیں اس طرح دبے پاؤں آئے کہ مجھے خبر نہ ہوئی۔ جب پلنگ کے قریب پہنچ کر فرمایا "بیٹا تم سوتے نہیں یہ کیا دیکھ رہے ہو! یہ معاملہ میرے ان کے درمیان میں بطور راز کے ہے (اب دونوں جنت نصیب ہو گئے تو اس کے لکھنے میں کچھ مضائقہ نہیں) خیر اب مثنوی دیکھ لی ہے تو دیکھ جاؤ اور جہاں کہیں شک ہو نقطہ لگا دینا"۔ میں نے عرض کی "شروع میں ایک شعر ہے ؎ خطرہ نہیں راہ میں سخن کے کھٹکا نہیں قفل میں دہن کے"۔ کچھ خشونت سے کہنے لگے "کیا ہوا کبھی کبھی بڑے بڑے استاد بھی اس ترکیب میں دھوکا کھا جاتے ہیں۔ آتش نے کہا ہے ؎

معرفت میں اس کی ذات پاک کے　　　　اڑتے ہیں ہوش وخرد ادراک کے

جب اعتراض ہوا تو ان کے شاگردوں نے یہ بات بنائی کہ مطلع نہیں یہ تو حسن مطلع ہے"۔

اللہ اللہ وہ کیا زمانہ تھا کہ ایسے ایسے باکمال اس قدر محتاط تھے۔ اب تو ایک طبقۂ خاص کا یہ حال ہے کہ ہر شخص اپنے زعم میں خود ہی استاد ہے۔

[1] اگر زندگی ہے تو انشاء اللہ کسی وقت موقع سے داغ کے کلام پر اپنا خیال تفصیل کے ساتھ ظاہر کروں گا۔

غزل میں موجود ہے اور کسی کسی غزل میں تو دو دو تین تین شعروں میں بندھا ہوا ہے۔

نمونہ

دھوم ہے حشر کی سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے[1] | فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں
حشر میں دست جنوں سے نہ خجل ہوں اے داغ | کہ مرے پاس بجز دامن تر کچھ بھی نہیں

مقام رشک ہوا عرصۂ قیامت بھی | تجھی کو دیکھتا ہے جس بشر کو دیکھتے ہیں
خدا کرے سر محشر وہ بت ہو بے پردہ | کہ ہم بھی دیکھتے ہیں سب کدھر کو دیکھتے ہیں

فرشتوں سے سر روز جزا تکرار ہوتی ہے | گنگار کہا ہے ہمکو بھی کسی نے جان نثار نہیں
دکھا دینگے صف محشر میں ہم کتنے نکلتے ہیں | جو پوچھا اُسنے کوئی ہے مرے امیدوار نہیں

ملے محشر میں گر مجکو یہ کافی ہے عذاب اسکو | کہ یارب وہ بت کافر مرے سایے سے جلتا ہے
ادھر ٹھہرے اُدھر ٹھہرے اسے دیکھا اسے دیکھا | تماشاگاہ محشر میں ہمارا دل بہلتا ہے
ترا کوچہ ہے محشر یا ہے جنت کیا کہیں اسکو | وہ جی اٹھتا ہے جو اس راہ سے مردہ نکلتا ہے

کیا کہوں گا اگر اس بت نے کہا محشر میں | داور حشر ترے ہاتھ ہے عزت میری
حشر میں تجھ سا جفاکار خدا سا منصف | دل ربا انصاف طلب اور شہادت میری

بخشے جائیں گے یہ کار بہت روز جزا | کہیں جنت میں نہ پہنچے شب فرقت میری
کون جانے گا ترا چاہنے والا مجکو | حشر کے روز بدل جائیگی صورت میری
وہ دبے پاؤں چلیں حشر کے ڈر سے توبہ | فکر ہے چال اڑا لے نہ قیامت میری

اسی طرح خط اور قاصد کا مضمون ہے۔

نامہ بر کہتا ہے مجھسے کیا کرامت ہے تمھیں[2] | جو وہ لکھتے وہ بھی تم نے خط میں لکھکر رکھدیا
شوق بھی ہے وہم بھی ہے کیا کروں اے نامہ بر | کل جو لکھا کاٹ کر وہ آج دفتر رکھدیا

الٰہی قاصد کی خیر گزرے کہ آج کوچے سے فتنہ گر کے | صبا نکلتی ہے لڑکھڑا کر نسیم چلتی ہے تھرتھرا کر
وہ بدگمان نکتہ چیں ہے بڈھب کہیں نہ قاصد ہو قتل یارب | اگرچہ لکھا ہے حرف مطلب ہزار پہلو بچا بچا کر

---

[1] غالباً اس جگہ "ایسا ہے" "ویسا ہے" بولتے ہیں۔

[2] تمھیں کرامت یا تم میں کرامت؟

تلاش بھی مجکو نامہ بر کی خبر نہ تھی ہائے اس خبر کی — نہ پانو کی سدھ رہی نہ سر کی گئی ہے ایسی صبا سنا کر

لکھا تھا خط انھیں مرتے ہیں دیکھ لو آکر — ملا جواب کہ اب تو ضرور ہم آئے

ہزار بھیج چکا ایک نامہ بر نہ پھرا — گئے تھے کہکے یہ سب آب حضور ہم آئے

داغ کہیں کہیں غلطی کر جاتے تھے اور یہ بات میری ہی نظر میں نہیں بلکہ بقول حضرت ثاقب حالی مرحوم بھی کہتے تھے (مولانا حالی نے میری اس نگارش کی تائید کی اور فرمایا کہ امیر کا کلام غلطی سے پاک ہے اور داغ غلطی کر جاتے ہیں خطوط منشی امیر احمد صفحہ ۳۴ میں فٹ نوٹ ملاحظہ ہو)۔

خدا بخشے داغ کوئی ثقہ آدمی نہ تھے۔ ابتدا میں ارباب نشاط کی بدولت کلام ان کا پھیلا اور مقبول عام ہوا کیونکہ گانے[1] میں شعر کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے اور سرور میں شعر کا عیب[2] و صواب تک نہیں سوجھتا۔ اس کے سوا دہلی والوں کے لئے یہ رنگ درحقیقت نیا تھا۔

اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ بعض غزلیں داغ کی امیرؔ سے اچھی ہیں اور بعض قافیوں میں داغ امیرؔ سے بنر لے گئے ہیں مگر کیا کوئی منصف یہ کہ سکتا ہے کہ امیرؔ کے شاگرد داغ کی غزل کے مقابلے میں یا داغ کے تلامذہ امیرؔ کی غزل کے مقابلے میں چند غزلیں یا غزل میں بعض قافیے اچھے کہہ لے جائیں تو اس سے ان دونوں استادوں کے مقابلے میں ان کو عام تفوق حاصل ہو جائے گا

میں اس موازنے میں جلال مرحوم کی غزلیں بھی لکھنا مناسب سمجھتا ہوں کیونکہ یہ تینوں بزرگ ہم عصر اور خوشگو تھے۔ نعت ہی سے ابتدا کرتا ہوں۔

امیر کی بعض نعتیہ غزلیں میں شروع ہی میں لکھ چکا ہوں۔ ان کے قصائد وغیرہ اپنے اپنے موقعے پر لکھے جائیں گے۔ داغ کے چاروں دیوان میں نے دیکھے۔ گلزار داغ میں یہ دو غزلیں ہیں

اللہ شوق دے مجھے نعت شریف کا — شہرہ ہو خوب میرے کلام لطیف کا

سرسبز کشت دل ہے محمدؐ کے عشق میں — کیا اس زمیں میں کام ربیع و خریف کا

---

[1] اسی لالچ میں تو اکثر سنیے شاعر گا کر اپنی غزل سنانے لگے ہیں چاہے آواز پھوٹا ڈھول ہی کیوں نہ ہو۔

[2] لطیفہ۔ مضطر مرحوم کی اس غزل کی ۔ نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں (گانے سے) ایک دھوم تھی لیکن غزل لکھ کر جب دیکھی دکھائی گئی تو جو نوآموز شعرا وجد کرتے تھے وہی بعض شعروں پر اعتراض کرنے لگے اور غزل نظروں سے گر گئی۔

اللہ رے اس کے علم لدنی کا معجزہ　　امی سبق پڑھا ہے کتاب شریف کا
حسرت جس آبرو کی سلیمانؑ کو رہی　　یثرب میں ہے وہ مرتبہ مور ضعیف کا
شیطان بھاگتا ہے محمدؐ کے نام سے　　کیا خوف اس پلید و خبیث و کثیف کا
مداح مصطفےٰ سے کرے کوئی بحث کیا　　سحباں ہے خوشہ چیں مری طبع ظریف کا
ادنےٰ شجاعت احمد مرسلؐ کی دیکھنا　　کیا حال جنگ بدر میں تھا ہر حریف کا
ہے ناتوان عشق محمدؐ وہ پہلواں　　رستم سے ہو مقابلہ کب اس نحیف کا
صبر جمیل تھا کہ ستم پر ستم سہا　　بوجہل و بولہب سے ذلیل و خفیف کا

اے داغ شعر ڈھل گئے نعت شریف میں
ہے فکر قافیہ نہ تردد ردیف کا

نہ کیونکر ہو افضل ہمارا محمدؐ　　کہ ہے اپنے پیارے کا پیارا محمدؐ
الٰہی یہ محشر میں ہم کہتے جائیں　　کہاں ہے کہاں ہے ہمارا محمدؐ
وہیں کشتی نوحؑ بھی ڈوب جاتی　　نہ دیتے جو اس کو سہارا محمدؐ
ابھی فرش سے عرش مل جائے جھک کر　　کریں گر طلب کا اشارا محمدؐ
یہی بات عاشق نے معشوق سے کی　　نہیں تیری فرقت گوارا محمدؐ
کہیں گے یہی اس شہ انبیا سے　　وہاں ہوں گے جب آشکارا محمدؐ
شفیع امم روز محشر تمھیں ہو　　ہمیں ہے تمھارا سہارا محمدؐ
صدا خیر مقدم کی کعبے سے آئی　　حرم سے جب آئے دوبارا محمدؐ
بلالو مدینے میں پھر داغ کو تم　　نہیں ہند میں اب گزارا محمدؐ

"آفتاب داغ" میں یہ غزل ہے۔

تو جو اللہ کا محبوب ہوا خوب ہوا　　یا نبی خوب ہوا خوب ہوا خوب ہوا
شب معراج یہ کہتے تھے فرشتے باہم　　سخن طالب و مطلوب ہوا خوب ہوا
اے شہنشاہ رسل فخر رسل ختم رسل　　خوب سے خوب خوش اسلوب ہوا خوب ہوا
حشر میں امت عاصی کا ٹھکانا ہی نہ تھا　　بخشوانا تجھے مرغوب ہوا خوب ہوا

حسن یوسفؑ میں ترا نور تھا اے نورِ خدا ۔ چارۂ دیدۂ یعقوبؑ ہوا خوب ہوا
تھا بھی پیشِ نظرِ معرکۂ کرب و بلا ۔ صبر میں ثانیٔ ایوبؑ ہوا خوب ہوا
فخرِ آدم کو نہ ہوتا جو فرشتہ ہوتا ۔ بنی آدم سے جو منسوب ہوا خوب ہوا
داغ ہے روزِ قیامت مری شرم اسکے ہاتھ ۔ میں گناہوں سے جو محجوب ہوا خوب ہوا

"مہتاب داغ" میں یہ غزل ملی :-

خدا دے تو دے آرزوئے محمدؐ ۔ کریں چشم و دل جستجوئے محمدؐ
کھلے گی مری آنکھ جب روزِ محشر ۔ کھنچے گی مری روح سوئے محمدؐ
کہاں باغِ جنت کہاں باغِ یثرب ۔ کہاں بوئے گل اور بوئے محمدؐ
خوشی سے ابل جائیں تسنیم و کوثر ۔ جو مل جائے آبِ وضوئے محمدؐ
کہوں کیوں نہ ہر بار صلِ علیٰ میں ۔ تصور میں پھرتا ہے روئے محمدؐ
اِدھر دوست خوش ہیں اُدھر غیر راضی ۔ خوشا خلق و خوئے نکوئے محمدؐ
بنیں دست مژگاں مرے یا نو یا رب ۔ کروں طے ان آنکھوں سے کوئے محمدؐ
بھریں خضرؑ بھی سامنے جس کے پانی ۔ زہے عزت و آبروئے محمدؐ
الٰہی نہ ہو داغ کا بال بیکا ۔ رگ جاں بنے تار موئے محمدؐ

"یادگار داغ" میں کوئی غزل نہیں ملی۔

ان زمینوں میں امیرؔ کے یہاں غزلیں نہیں ہیں۔

جلال

کہاں بھولا تھیں عاشق تھارا یا رسول اللہ ۔ قیامت میں بھی اٹھتے ہی پکارا یا رسول اللہ
خدا سے بخشوا ہی لوگے جس مجرم کو چاہوگے ۔ اُسے ہے کون تم سے بڑھکے پیارا یا رسول اللہ
بھچھوڑونگا نہ چھوڑونگا اگر محشر میں ہاتھ آیا ۔ مرا ہاتھ اور دامن ہے تھارا یا رسول اللہ
مقرر تیری بخشش ہوگی تو کیسا ہی مجرم ہو ۔ یہ کہتا ہے شفاعت کا سہارا یا رسول اللہ
درِ جنت جدھر ہے مجکو محشر میں بتا دیگا ۔ تھاری چشمِ رحمت کا اشارا یا رسول اللہ
گواہی دی نبوت پر تھاری سنگریزوں نے ۔ زہے اعجاز پتھر بھی پکارا یا رسول اللہ

یہی کہتا جلالؔ آئیگا میدان قیامت میں — نگاہ لطف اِدھر کو بھی خدارا یارسول اللہ

(از دیوان اول)

اس زمین میں امیرؒ کی غزل ہے :-

نہیں ہے آسرا کوئی ہمارا یارسول اللہ — تمھارے ہیں تمھارا ہے سہارا یارسول اللہ
زمیں ہوتی نہ بالائے زمیں یہ آسماں ہوتا — تمھارا ہی کرشمہ ہے یہ سارا یارسول اللہ
نہ دنیا کے رہیں جھگڑے نہ عقبےٰ کے رہیں کھڑکے — نگاہ لطف سے ہو اک اشارا یارسول اللہ
مدد فرمایئے اب تاب گویائی نہیں باقی — چلی جبتک زباں میں نے پکارا یارسول اللہ
دل نومید پر بھی اک نگاہ لطف ہو جائے — ہزاروں حسرتوں کا ہے یہ مارا یارسول اللہ
دکھادو اک جھلک رخسار کی مشتاق کو اپنے — چمک جائے مقدر کا ستارا یارسول اللہ
بڑی بندہ نوازی کی جو وقت نزع آ پہنچے — ذرا ٹھہریں کہ میں کرلوں نظارا یارسول اللہ
شہید جلوۂ دیدار ہو جاؤں تو یہ سمجھوں — کہ میں نے زندگی پائی دوبارا یارسول اللہ
نہ حوروں سے مجھے مطلب نہ جنت کی مجھے خواہش — مری آنکھیں ہوں اور تیرا نظارا یارسول اللہ
بہت ہی سخت کڑے ہیں تمھاری تیغ فرقت کے — یہ کڑوے گھونٹ کیونکر ہوں گوارا یارسول اللہ
امیرؔ بینوا عقبےٰ میں کس کا آسرا ڈھونڈے — رہا مداح دنیا میں تمھارا یارسول اللہ

جلال

دم عیسےٰ نے ہر سو دم بھرا ہے عشق احمدؐ کا[۱] — کلیم اللہ بھی پڑھتے رہے کلمہ محمدؐ کا
گھٹی دوری بڑھا جب ولولہ عشق محمدؐ کا — عجب انداز اس دریا میں پایا جزر کا مد کا
جسے کہتے ہیں خلد اک پھول ہے قبر محمدؐ کا — بہار باغ کن ہے کاٹ نوں روضے کے گنبد کا
شرف کعبے کا ہے گر طوف کرنے آئے مرقد کا — تری چوکھٹ کو چومے فخر ہے یہ سنگ اسود کا
سر انور پہ ابر اک دھوپ میں رہتا تھا سنتے ہیں — نئے پیرایے میں تھا جلوہ گر سایہ ترے قد کا
تمنا عرش کو بھی فرش ایواں کا ترے ہوکر — بناؤں گوشوارہ کوئی گوشہ لے کے مسند کا
جلیں کیونکر نہ پر فکر رسا کے نعت میں اسکی — پر جبریل پروانہ ہو جس کی شمع مرقد کا

۱ قصیدے کے رنگ میں غزل ہے۔

مدینے کی زمیں کو تجھسے سرسبزی یہ حاصل ہے — غبار اٹھے تو قایم ہو فلک بن کر زبرجد کا
کبھی میں آپ میں ہوں اور گاہے آپ باہر — ترے بحرِ محبت میں ہے عالم جزر کا مد کا
میان خلد طوبےٰ کس کے نیچے پرورش پاتا — نہوتا عالم بالا میں گر سایہ ترے قد کا
الٰہی حشر برپا کر ترے محبوب کو دیکھوں — اٹھا سکتیں نہیں آنکھیں تقاضا شوق بیحد کا
تصور میں ملیں کس کے قدم پر پتلیاں میں نے — فرشتے بوسے لیتے ہیں گماں ہے سنگ اسود کا
تجلی گاہ اقدس سینۂ حور و ملائک ہے — مقام اے شاہِ خوبی صدر میں ہے تیری مسند کا
مدینے کی طرف شوق زیارت میں چلا ہوں میں — سکھاتا گردش تقدیر کو طوف اسکے مرقد کا
قدم بھی مثل امکاں ہے ترے ظل حمایت میں — یہاں تو آیہ رحمت وہاں سایہ ترے قد کا
گنہ ہٹ کر کھڑے ہوں گے گنہگاروں سے محشر میں — نشاں یہ ہے شفیع المذنبیں کی آمد آمد کا
سراپا عالم امکاں ترا جلوہ دکھاتا ہے — ابد میں دال گیسو کی ازل میں ہے الف قد کا
نہیں خورشید عالم تاب یہ چرخ چہارم پر — کلس ترا ہوا ہے اک ترے روضے کے گنبد کا

یہ حسرت ہے جلالؔ حمدؐ کے روضے کو اگر دیکھوں
گردوں غش کھا کے پہلے ہوش ہو پھر عرض مقصد کا (از دیوان دوم)

جلالؔ کے تیسرے دیوان میں کوئی نعتیہ غزل نہیں ہے۔ امیرؔ کے یہاں اس زمین میں بھی دو غزلہ موجود ہے۔

خلف وہ ہے کرے جو نام روشن جد امجد کا — الف احمدؐ کا میم احمدؐ کا دال آدم میں احمدؐ کا
کھنچا ایسا پری نقشہ سراپائے محمدؐ کا — کہ نقاش ازل نے آپ سایہ کھینچ لیا قد کا
تبسم کیجیے غش آئے دانتوں کی تجلی سے — یہی ہے درۂ تعزیر بر جرم شوق بیحد کا
ہوا یہ محو حسن پاک اے محبوب یزدانی — کہ تجھ پر مٹ گیا روز ازل سایہ ترے قد کا
اتر کر عرش سے لیتے ہیں بوسے رات دن ملکی — دبایا سنگ در نے تیرے پہلو سنگ اسود کا
پھریں جب پتلیاں آنکھوں کی یہ شوق زیارت ہو — کہ پھر جائے نظر میں گرد پھرنا تیرے مرقد کا
نہیں بے وجہ حسن یوسفی کی دھوم عالم میں — کہ سایہ چھپ کے اس پردے میں آیا تھا محمدؐ کا
شب معراج حوروں نے بچھائیں اسقدر آنکھیں — کہ سبزہ نرگستان ہو گیا چرخ زبرجد کا

جوانانِ چمن باہر ہوئے جاتے ہیں جامے سے
اڑایا بوئے گل نے رنگ شاید تیری آمد کا

الٰہی لے چلے شوقِ زیارت جب مدینے کو
خضر ہو جائے بڑھ کر دلولہ عشقِ محمدؐ کا

مدینے میں نہ کیونکر لہلہائے سبزۂ جنت
خضر چھڑکاؤ کرتے پھرتے ہیں آبِ زمرد کا

ہجومِ خلق اتنا بے سبب ہو میں نہ مانوں گا
قیامت نے بھی کچھ پرواز اڑایا ہے ترے قد کا

سیہ کاران امت کے سروں پر ہو گیا سایہ
گیا محشر میں سودائی جو گیسوئے محمدؐ کا

امیر اس روضے میں پہنچوں تو استغنا ہے اور یہ ہو
جو یہ مقصد روا ہو قصد ہے پھر ترک مقصد کا

میں طفلی سے ہوں عاشق ابروئے خمدار احمدؐ کا
کمان حسن کا ناوک الف ہے میری ابجد کا

تمنا ہے کہ اک اک بال کی سو سو بلائیں لے
دلِ صد چاک شانہ بن کے گیسوئے محمدؐ کا

ترے روضے میں جو نیچے سے نیچا جھاڑ لٹکا ہے
فلک اس جھاڑ میں ہے ایک ریزہ زمرد کا

مدینے میں الٰہی زیر تیغ ناز دم نکلے
شہید جلوہ گاہ حسن کر صدقہ محمدؐ کا

نگاہ چشم ہر بسمل اشاروں میں سکھاتی ہے
طواف آنکھوں سے کرنا مرتے دم تک تیرے مرقد کا

درِ فردوس پر محشر میں رضواں یوں پکارے گا
بڑھے جس جس کے دل میں داغ ہو عشق محمدؐ کا

قدم سے کیا ہی تیز آئی سواری جانب امکاں
نہ پہنچا ساتھ آخر رہ گیا سایہ وہیں قد کا

کوئی دم تیری تیغ ناز کے نیچے ٹھہر جانا
شہید شوق کو ساماں ہے عیشِ مخلد کا

سیہ کاران امت اور سب کڑیاں اٹھالیں گے
الٰہی سلسلہ چھوٹے نہ گیسوئے محمدؐ کا

مزاج اس سنگ در کا شان محبوبی سے برہم ہے
کبھی کیا میں نے بوسہ لے لیا تھا سنگ اسود کا

اٹھا دے آنکھ سے پردہ دوئی کا حسن یکتائی
جدھر دیکھوں نظر آئے مجھے جلوہ محمدؐ کا

بسر ہوتا سیہ کاروں کے حق میں ہر محشر سے
اٹھا رکھا گیا محشر پہ سایہ آپ کے قد کا

امیر بے نشاں کا نقش جب مٹنے لگے یارب
زباں پر نام تیرا نقش دل پر ہو محمدؐ کا

عاشقانہ غزل

میں نے اس کتاب کے پہلے حصے میں بسلسلۂ واقعات دو ایک جگہ امیر کی غزل کے

ساتھ ساتھ داغ کی بھی غزل لکھ دی ہے ۔ اب میں امیر و جلال و داغ کی دو چار وہم طرح غزلیں لکھتا ہوں جو نواب خلد آشیاں[1] کے عہد میں سرکاری مشاعروں میں (جن مشاعروں سے مجھے کسی نہ کسی طرح آگاہی حاصل ہو سکی) انھوں نے کہی تھیں ۔

میں نے قصداً ایسی غزلوں میں موازنہ نہیں کیا ہے جس کے قریب قریب ہر قافیے میں امیر کا نمبر بڑھا رہا ہے ۔ میرے نزدیک موازنے کا یہ طریقہ بھی مناسب نہیں کہ ہم قافیہ یا ہم مضمون اشعار منتخب کر کے لکھے جائیں اس لئے کہ اس طرح یہ ممکن ہے کہ موازنہ کرنے والا جس استاد کو بڑھانا چاہے اس کا بہترین شعر انتخاب کرے اور جسے گھٹانا چاہے اس کا معمولی سا شعر لے لے ۔ اسی لئے میں نے ہر قافیے میں جس کے جتنے شعر ہیں وہ سب لکھ دیے ہیں تاکہ جس قافیے میں جس کی فکر نے جتنا کام کیا ہے اس کا صحیح اندازہ ہو سکے اور ناظرین خود بھی فیصلہ کر سکیں ۔ جو اشعار ہم قافیہ نہ مل سکے ان کو آخر میں درج کر دیا ہے کیونکہ ایسا نہ کرنے میں یہ ممکن تھا کہ کسی استاد کے بعض بہترین شعر صرف اس لئے رہ جاتے کہ دوسرے استاد کے یہاں ان کے ہم قافیہ اشعار نہیں اور یہاں دیکھنا اصل میں یہ ہے کہ جس زمین میں تینوں استادوں نے طبع آزمائی فرمائی ہے اس میں کون کتنا پھولا پھلا ہے ۔

امیر ۔ وہ کون تھا جو خرابات میں خراب نہ تھا	ہم آج پیر ہوئے کیا کبھی شباب نہ تھا
نہ پوچھ عیش جوانی کے ہم سے پیری میں	ملی تھی خواب میں وہ سلطنت شباب نہ تھا
جلال ۔ ہم اور جاتے نہ پیر مغاں کی صحبت میں	بہت ابھارنے والے تھے اک شباب نہ تھا
وہ پھر کے آپ تو آتا اگر جواب نہ تھا	پیا بر تھا الٰہی مرا شباب نہ تھا
زمانہ ہجر کا جا جا کے کیوں نہ پھر آتا	شب وصال نہ تھی موسم شباب نہ تھا
دکھا دیا ہے طبیعت نے آ کے جو عالم	ترا بھی رنگ یہ اے آمد شباب نہ تھا
داغ ۔ جواں ہوئے تو قیامت ہوئے خدا کی پناہ	وہ جب بھی فتنہ تھے جب عالم شباب نہ تھا

امیر کے یہاں بے تکلفی ایسی ہے کہ دونوں شعر زبانوں پر رہ جانے کے ہیں ۔ مگر جلال نے

---

[1] یہ وہ زمانہ تھا جب نواب خلد آشیاں کی شاہی کا شباب اور شعر گوئی کا شوق زوروں پر تھا اور امیر کی راتیں (دن اور سرکاری کاموں میں) اصلاح ہی میں گزر جاتی تھیں ۔

وہ باتیں پیدا کی ہیں کہ یہ قافیہ ان کے حصے کا ہو گیا ہے۔

امیر۔ شب فراق میں کیوں یارب انقلاب نہ تھا — یہ آسمان نہ تھا یا یہ آفتاب نہ تھا

جلال۔ یہ گم ہوا تھا سیاہی میں شام فرقت کی — کہ صبح ہو گئی تھی اور آفتاب نہ تھا

اسی سے آنکھ لڑاتے ترے تماشائی — ادھر تو حشر میں بھی روئے آفتاب نہ تھا

داغ۔ نہ پوچھیے مرے روز سیاہ کی ظلمت — چراغ لے کے بھی ڈھونڈا تو آفتاب نہ تھا

وہ پہنچے غیر کے گھر جان کر شب وعدہ — ہمارے روز سیہ میں جو آفتاب نہ تھا

داغ نے دوسرے شعر میں وہ بات کہی ہے کہ آفتاب نہ ہونے کا گویا ثبوت دیدیا ہے۔ یہ قافیہ سب سے اچھا کہا۔

امیر۔ لحاظ ہم سے نہ قاتل کا ہو سکا دم قتل — سنبھل سنبھل کے تڑپتے وہ اضطراب تھا

زرا سے صدمے کی تاب اب نہیں ہی ہم ہیں — کہ ٹکڑے ٹکڑے تھا دل اور اضطراب نہ تھا

بیان کی جو شب غم کی بے کسی تو کہا — جگر میں درد نہ تھا دل میں اضطراب نہ تھا

سر و رقتل سے بھی ہاتھ پانو کو جنبش — وہ مجھ پہ وجد کا عالم تھا اضطراب نہ تھا

جلال۔ اگرچہ ایک بھی تسکین کا جواب نہ تھا — مگر کچھ آتے ہی قاصد کے اضطراب تھا

کسی نے دے کے تسلی ہمیں قیامت کی — کہ آج ہے جو تڑپ کل یہ اضطراب نہ تھا

نگاہ یاس کے صدقے رُلا دیا اُن کو — قلق نہ تھا دم رخصت کہ اضطراب نہ تھا

مری تڑپ نے نہ آنے دیا قریب انھیں — کہ برق گرتی تھی انداز اضطراب تھا

ہمیں بھی صبح شب وصل بے قراری تھی — خدا گواہ تمھارا سا اضطراب نہ تھا

داغ۔ نگاہ شوق پہ الزام بے قراری کا — تمھاری برق تجلے کو اضطراب نہ تھا

کہا انھوں نے شب غم کا ماجرا سن کر — ترے مزاج کی شوخی تھی اضطراب نہ تھا

پیامبر کی زباں بات بات پر جو رُکی — شریک حال مرے دل کا اضطراب نہ تھا

کل اُس نگاہ میں شوخی تھی کس قیامت کی — لڑا ہوا تو مرے دل کا اضطراب نہ تھا

جلال نے چوتھا اور پانچواں شعر سب سے اچھا کہا ہے۔

امیر۔ اُسے جو شوق سزا ہے مجھے ضرور ہے جرم — کہ کوئی یہ نہ کہے قابل عذاب نہ تھا

جلالؔ ترتیب فاتحہ آکر پڑھے غضب آیا — لحد میں ہم پر ابھی تک تو کچھ عذاب نہ تھا
اٹھاکے رنج پکارا یہ کوئے یار میں دل — بہشت میں تو الٰہی کوئی عذاب نہ تھا

داغؔ اگرچہ بادہ کشی بھی گناہ اے زاہد — جو تجھ سے چھینکے پیتا تو کچھ عذاب نہ تھا
ازل میں عشق کے بدلے ملا نہ کیوں دوزخ — اگر عذاب ہی دینا تھا داں عذاب نہ تھا

داغؔ کے پہلے شعر میں بے تکلفی کے ساتھ شوخی ہے (شاید گناہ کی جگہ بھی عذاب کہتے ہوں) مگر جلالؔ نے پہلے اور دوسرے شعر میں ایک نئی بات شوخی میں پیدا کی ہے

امیرؔ۔ دماغ بحث تھا کس کو دگرنہ اے ناصح — دہن نہ تھا کہ دہن میں مرے جواب نہ تھا
سوال وصل کیا یا سوال قتل کیا — دہاں نہیں کے سوا دوسرا جواب نہ تھا
امیرؔ اب ہیں یہ باتیں جب اٹھ گیا وہ شوخ — حضور یار کے منہ میں ترے جواب نہ تھا
لپٹ کے چوم لیا منہ مٹا دیا انکار — نہیں کا ان کی سوا اس کے کچھ جواب نہ تھا
جو لاش بھیجی تھی قاصد کی بھیجتے خط بھی — رسید وہ تو مرے خط کی تھی جواب نہ تھا

جلالؔ کسے خبر جو ہوئیں مجھ میں یار میں باتیں — یہاں خطاب نہ تھا کچھ دہاں جواب نہ تھا
دہن کا حال دل گم شدہ بتا دیتا — جو تم نہ بولتے کیا غیب کا جواب نہ تھا
کلیم نے جو سنیں لن ترانیاں سر طور — اِدھر اُدھر کی صدا تھی ترا جواب نہ تھا
پیام بر نے کہا اُس سے کچھ تو مجھ سے کچھ — مرا پیام نہ تھا یار کا جواب نہ تھا

داغؔ مرے سوال کے معنے وہ مجھ سے کہہ دیتے — مگر سوال کا میرے کوئی جواب نہ تھا
ہمارے حال کو جس نے سنا کہا سب جھوٹ — کوئی زبان نہ تھی جس پہ یہ جواب نہ تھا
پیامبر تجھے لاکھوں سوال کرنے تھے — نہ تھا ہزار میں اک بات کا جواب نہ تھا

جلالؔ کا پہلا شعر خوب ہے مگر امیرؔ کا چوتھا اور پانچواں شعر حاصل زمین ہے۔

امیرؔ۔ وہ کہتے ہیں شب وعدہ میں کس کے پاس آتا — تجھے تو ہوش ہی اے خانماں خراب نہ تھا
یہ بار بار جو کرتا تھا ذکر مے واعظ — پیے ہوئے تو کہیں خانماں خراب نہ تھا

جلالؔ یہ ہوش عشق میں اے نشۂ شباب نہ تھا — کہ تھا بغل میں کبھی یا دل خراب نہ تھا
برا شراب کو واعظ کہا کیا سر بزم — بھلے کو کوئی خرابات کا خراب نہ تھا

داغ۔ یہ داغ رند کب آلودۂ شراب نہ تھا   خراب آج ہوا آج تک خراب نہ تھا
بغیر داغ کے جنت تمھاری بزم رہی   ہزار شکر کہ وہ خانماں خراب نہ تھا

امیر نے دوسرا شعر شوخی کے ساتھ بہت ہی بے تکلف کہا ہے۔

امیر۔ فلک نے افسر خورشید سر پہ کیوں رکھا   سبوئے بادہ نہ تھا ساغر شراب نہ تھا
غضب کیا کہ اسے تو نے محتسب توڑا   ارے یہ دل تھا مرا شیشۂ شراب نہ تھا
دعا ہے تو یہ بھی ہم نے پڑھی تو مے پیکر   مزہ ہی ہم کو کسی شے کا بے شراب نہ تھا
جلال۔ مزہ تھا عہد ہی کے توڑنے میں کیوں ساقی   ہماری توبہ نہ تھی شیشۂ شراب نہ تھا
اٹھا دیا جو خرابا تیوں نے محفل سے   خدانخواستہ میں تارک شراب نہ تھا
داغ۔ سنا کلام جو رندوں کا شیخ چکرایا   وہاں تو بات کا چھٹنا بھی بے شراب نہ تھا

امیر کے تیسرے شعر میں غضب کی شوخی ہے۔

امیر۔ مرے جنازے پہ اب آتے شرم آتی ہے   حلال کرنے کو بیٹھے تھے جب حجاب نہ تھا
جلال۔ جلال پاس سے اس کے ہٹی نہ روز وصال   حیا کی آنکھ میں اُس دن ذرا حجاب نہ تھا
ہماری آنکھوں پہ بھی باندھنی نہ تھی پٹی   اگر تمھیں کو دم قتل کچھ حجاب نہ تھا
داغ۔ ہزار پردوں میں مشتاق دیکھ لیتے ہیں   اسے حجاب تھا موسےٰ کو تو حجاب نہ تھا

اس قافیے کو جلال نے امیر و داغ سے اچھا کہا ہے۔

امیر۔ نصیب جاگ اٹھے سو گئے جو پانو مرے   تمھارے کوچے سے بہتر مقام خواب نہ تھا
جلال۔ جھپک کے آنکھ مری وصل یار میں جو کھلی   وہ شب نہ تھی وہ فسانے تھے وہ خواب تھا
ہماری آنکھ ہوئی جاتی تھی جو رات کو بند   ورد تھا کسی پردہ نشیں کا خواب نہ تھا
دکھا گئی ہے تماشے ہمیں جو غفلت عشق   وہ سب ہیں یاد کوئی بھولنے کا خواب نہ تھا
خیال یار میں نیند آکے دونوں آنکھوں کو   فریب دے گئی سچا کسی کا خواب نہ تھا
داغ۔ وہ رات کون سی گزری جو اضطراب نہ تھا   جب آنکھ دی تھی خدا نے مجھے تو خواب نہ تھا
لگی نہ آنکھ مری چشم پاسباں کی قسم   شب فراق کہیں دیکھنے کو خواب نہ تھا

گو امیر نے خوب بات پیدا کی ہے مگر جلال نے دوسرا اور چوتھا شعر سب سے

اچھا کہا ہے۔

امیر۔ زمانہ وصل میں لیتا ہے کروٹیں کیا کیا — فراق یار کے دن ایک انقلاب نہ تھا

جلال۔ گرا میں کوچۂ جاناں میں سر کے بل چل کر — سنبھالتا مجھے ایسا یہ انقلاب نہ تھا

پھری بھی آنکھ وہاں دل یہاں بدل جاتا — مرے شریک زمانے کا انقلاب نہ تھا

داغ۔ وہ جب چلے تو قیامت بپا تھی چار طرف — ٹھہر گئے تو زمانے کو انقلاب نہ تھا

یہ قافیہ بھی جلال نے سب سے اچھا کہا ہے۔

ذیل کے قافیوں میں امیر و جلال کے شعر ہیں داغ نے یہ قافیے نہیں کہے۔

امیر۔ ہزار بار گلا رکھ دیا تہ شمشیر — میں کیا کروں تری قسمت ہی میں ثواب نہ تھا

جلال۔ جو راہ میکدہ زاہد ہمیں بتا دیتا — گناہ بھی نہ ٹھہرتا اگر ثواب نہ تھا

امیر نے بے تکلفی کے ساتھ ایک عجیب مزہ شعر میں بھر دیا ہے۔

امیر۔ وہ بیٹھے بیٹھے جو دے بیٹھے قتل عام کا حکم — ہنسی بھی ان کی کسی پر کوئی عتاب نہ تھا

جلال۔ نگاہ یار ہی پہچاننا تو مشکل ہے — جلال لطف سے خالی کبھی عتاب نہ تھا

جلال نے امیر سے اچھا کہا ہے۔

امیر۔ کلیم شکر کرو حشر تک نہ ہوش آتا — ہوئی یہ خیر کہ وہ شوخ بے نقاب نہ تھا

کہا جو میں نے کہ یوسف کو یہ حجاب نہ تھا — تو ہنس کے بولے وہ منہ قابل نقاب نہ تھا

شب وصال بھی وہ شوخ بے حجاب نہ تھا — نقاب الٹ کے بھی دیکھا تو بے نقاب نہ تھا

میں روئے یار کا مشتاق ہو کے آیا تھا — ترے جمال کا شیدا تو اے نقاب نہ تھا

جلال۔ تمھارے حسن کا شوخی نے پردہ فاش کیا — یہ رنگ چھپنے ہی والا تہ نقاب نہ تھا

یہ قافیہ امیر نے جلال سے اچھا کہا ہے۔

اسی طرح ذیل کے قافیوں میں جلال و داغ نے شعر کہے ہیں۔ امیر کے یہاں یہ قافیے نہیں ہیں۔

جلال۔ کبھی کسی پہ نہ سوز جگر ہوا ظاہر — ٹپکتے آنکھ سے آنسو میں وہ کباب نہ تھا

داغ۔ ملا ہمیں دل پر داغ کا نشان اتنا — جلے کباب کی بو تھی مگر کباب نہ تھا

جلال نے داغ سے اچھا کہا ہے۔

جلال۔ دیے ہیں غم ہمیں کتنے وہ یاد کیوں رکھتے ۔۔۔ ہمارے داغ تھے بوسوں کا یہ حساب نہ تھا
تمہارے تیروں کے پیکاں تو پھر ہیں گنتی کے ۔۔۔ دیے تھے ہم نے دل اتنے کہ کچھ حساب نہ تھا
گناہ بولے جو گھبرا گیا میں روز حساب ۔۔۔ ابھی تو پرسش اعمال بھی حساب نہ تھا

داغ۔ نہ پوچھ مجھ سے مرے جرم داور محشر ۔۔۔ مرے گناہوں کا دنیا میں بھی حساب نہ تھا

پہلا شعر جلال نے داغ سے اچھا کہا ہے۔ دو قافیے صرف جلال ہی نے کہے ہیں۔

جلال۔ ارادہ کرتے تو جان حزیں نکل جاتی ۔۔۔ ہجوم غم شب فرقت میں سدّ باب نہ تھا
بتوں کے عشق میں دونوں جہان کا ننگ ہوں میں ۔۔۔ کسی سے ایک خدائی کو اجتناب نہ تھا

داغ نے بھی دو قافیے سب سے الگ کہے ہیں۔

داغ۔ ہزار شکر مرا چشم تر نے ساتھ دیا ۔۔۔ وہ عدم میں کہیں ایک قطرہ آب نہ تھا
مرے سوا تری محفل میں رات کو ظالم ۔۔۔ وہ کون تھا کس و ناکس جو باریاب نہ تھا

امیر نے چند قافیے اور بھی تنہا کہے ہیں۔

امیر۔ شکایت اُن سے کوئی گالیوں کی کیا کرتا ۔۔۔ کسی کا نام کسی کی طرف خطاب نہ تھا
غرض یہ ہے کہ ہو عیش تمام باعث مرگ ۔۔۔ دگرنہ میں تو کبھی قابل خطاب نہ تھا
تمھیں نے قتل کیا ہے مجھے جو تنتے ہو ۔۔۔ اکیلے تھے ملک الموت ہم رکاب نہ تھا
ثبات بحر جہاں میں نہیں کسی کو امیر ۔۔۔ اِدھر نمود ہوا اور اُدھر حباب نہ تھا

امیر۔ شوق خلوت میں بھی ہے انجمن آرائی کا ۔۔۔ آئینہ خانہ ہے گوشہ مری تنہائی کا
پانو صحرا میں ٹکا کب ترے سودائی کا ۔۔۔ دل میں لالے کے رہا داغ ہی تنہائی کا
شفق شام نہیں ہے یہ مرے ماتم میں ۔۔۔ منہ کو آیا ہے کلیجہ شب تنہائی کا
لامکاں پر طلب احمدؐ کو خدا نے بھی کیا ۔۔۔ متحمل ہو بشر کیا غم تنہائی کا
دل کفار اسی سے کیے اللہ نے خلق ۔۔۔ بچ رہا کچھ جو اندھیرا شب تنہائی کا

کوئی آتا نہیں مجھ تک جو بجز یاد خدا — لامکاں گوشہ ہے شاید مری تنہائی کا
صحبت مردم بے حس میں بہلتا نہیں دل — لاکھ تصویریں ہوں پر رنج ہے تنہائی کا
اے اجل جلد خبر لے کہ ڈراتا ہے مجھے — دیو بن بن کے اندھیرا شب تنہائی کا
جلالؔ۔ ساتھ چھوڑا ابھی جو دل نے تو شب فرقت میں — دھیان کچھ اس کو نہ آیا مری تنہائی کا
داغؔ۔ اس قدر ناز ہے کیوں آپ کو یکتائی کا — دوسرا نام ہے وہ بھی مری تنہائی کا
خوگر رنج و بلا حشر کے دن کیا خوش ہوں — کہ وصال آج ہوا ہے شب تنہائی کا
بن گیا داغ جگر پھر قیامت لے داغؔ — پر ابھی رنگ وہی ہے شب تنہائی کا

یہ قافیہ امیرؔ کا حصہ ہو گیا۔ کیا کیا شعر کہے ہیں! اللہ اللہ!! ؎ لامکاں پر طلب احدؐ کو خدا نے بھی کیا ؛ متحمل ہو بشر کیا غم تنہائی کا کیا عرش پیما فکر ہے!!!

امیرؔ۔ پانو پر تیرے جو سر ہے ترے شیدائی کا — بوسہ مقصود ہے پردہ ہے جبیں سائی کا
عین سجدے میں میسر ہے نظارا اس کا — چشم بینا ہے کہ داغ اپنی جبیں سائی کا
جلالؔ۔ لاکھ تقدیر کے لکھے کو مٹایا نہ مٹا — داغ ہم لے کے چلے اپنی جبیں سائی کا
داغؔ۔ یوں نہ مقبول ہوا ہو گا کسی کا سجدہ — بت کو ارمان رہا میری جبیں سائی کا

اس قافیے میں بھی جلالؔ اور داغؔ سے امیرؔ کہیں بڑھ کے رہے ہیں۔

امیرؔ۔ ہم ترے حسن کے بازار سے پھر جائیں کہاں — طور ٹھیکا ہو جو موسے سے تماشائی کا
تیغ مژگاں کا غضب ہاتھ لگایا تم نے — کٹ گیا پائے نگہ چشم تماشائی کا
جس نے دیکھا ہے تجھے دیکھتے ہیں سب اسکو — خلق ہے جمع تماشہ ہے تماشائی کا
آئینہ دیکھ کے آئے ہیں مزے میں ایسے — خود وہ منہ چومتے ہیں اپنے تماشائی کا
تو بھی آئے تو نہ وہ آنکھ اٹھا کر دیکھے — اور ہی رنگ ہے اب تیرے تماشائی کا
چیخ اٹھا لوٹ گیا تو نے اٹھا دی جو نقاب — آج جی چھوٹ گیا تیرے تماشائی کا
تجکو بھی جلوہ گہہ ناز میں روکا تھا ما — حوصلہ دیکھ لیا اپنے تماشائی کا
دوڑ کر برق تجلے نے سنبھالا اس کو — لڑکھڑایا جو قدم تیرے تماشائی کا
جلالؔ۔ آنکھ خورشید قیامت سے نہیں جھپکاتا — دیکھنا ڈھیٹ پنا اپنے تماشائی کا

جب سے دیکھا اُسے ہر دم نئی آفت دیکھی ‌‌ ‌ رو سیہ خلق میں ہو چشم تماشائی کا

داغ۔ ہو گیا پرتو رخسار سے کچھ اور ہی رنگ ‌ ‌ ‌ میں نے منہ چوم لیا تیرے تماشائی کا

داغ نے اپنے شعر میں خوب بات پیدا کی ہے۔ امیر نے بہتر سے بہتر شعر کہے ہیں۔ مگر چوتھے شعر نے تو داغ کے شعر کو مٹا دیا۔

امیر۔ دست گستاخ سے کر دامن یوسف کو نہ چاک ‌ ‌ ‌ اے زلیخا ہے یہ کوچہ تری رسوائی کا

شوق سے تیغ لگاؤ مجھے لیکن ہے یہ ڈر ‌ ‌ ‌ خندۂ زخم ڈھنڈورا نہ ہو رسوائی کا

جلال۔ خانہ ویراں دل وارفتہ و سودائی کا ‌ ‌ ‌ کیا سمجھتے تھے کہ گھر ہے یہی رسوائی کا

داغ۔ کیا چھپے راز الٰہی دل شیدائی کا ‌ ‌ ‌ عرصۂ حشر تو بازار ہے رسوائی کا

کیا غرض ہے مری تقدیر کو مجھ سے پوچھے ‌ ‌ ‌ آبرو کا ہے طلب گار کہ رسوائی کا

امیر کے دونوں شعر جلال اور داغ سے بہت اچھے ہیں۔

امیر۔ دل مرا سینے میں کیا اب تو دو عالم میں نہیں ‌ ‌ ‌ چل دیا بن کے خیال اُس بت ہرجائی کا

پھرتی ہے حسرت پابوس دو عالم میں تباہ ‌ ‌ ‌ اک جگہ پانو ٹھہرتا نہیں ہرجائی کا

دشت میں لالہ ہے گلزار میں گل بزم میں شمع ‌ ‌ ‌ ہر جگہ رنگ نیا ہے مرے ہرجائی کا

سر شب روز جو وحشت سے ہے چکر میں امیر ‌ ‌ ‌ یہ بھی شاید ہے قدم اس بت ہرجائی کا

داغ۔ ہر گلی کوچے میں پامال اسے ہو جانا ‌ ‌ ‌ دل ہے یا نقش قدم ہے کسی ہرجائی کا

داغ کے شعر میں بے تکلفی بہت ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ امیر کے سب شعر بڑھے ہوئے ہیں۔ امیر نے چند قافیے اور بھی کہے ہیں جو داغ کے یہاں نہیں ہیں مگر جلال کے یہاں ہیں۔

امیر۔ شوق دیدار میں اٹھتی ہے جو ہر وقت نگاہ ‌ ‌ ‌ ناتواں ہیں انھیں شبہہ ہے توانائی کا

جلال۔ ہوں وہ کاہیدہ جو دیتا ہے سہارا تنکا ‌ ‌ ‌ جانتا ہوں میں عصا اس کو توانائی کا

امیر نے جلال سے اچھا کہا ہے۔ غالب کے اس شعر کے بعد ؎ اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق + وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔ امیر ہی کا یہ شعر نظر آیا

امیر۔ ٹال جاتے ہیں مجھے دیکھ کے وہ خلق کہاں ‌ ‌ ‌ رنگ ہے مفلس و منعم کی شناسائی کا

جلالؔ آپ اپنے کو تو پہچان نہیں سکتا ہوں — کیا میں اقرار کروں تیری شناسائی کا

جلال نے جس رنگ میں کہا ہے بہت اچھا کہا ہے لیکن امیرؔ نے مفلس و منعم کی شناسائی کا رنگ کہکے قافیے کو اپنا کر لیا ہے۔

امیرؔ۔ بے ثباتی چمن حیرت نرگس سے کھلی — مل گیا کور سے سرمہ ہمیں بینائی کا
اس رُخ صاف کو دیکھوں تو بڑھے اور فروغ — سرمہ ہو گرد نظر آنکھ کی بینائی کا

جلالؔ لاکھ پنہاں ہو مگر حسن دکھاتا ہے جھلک — سات پردوں سے عیاں نور ہے بینائی کا

امیرؔ نے دونوں شعروں میں شاعری خوب کی ہے۔ مگر جلالؔ نے حقیقت کو عجب حسن سے بیان کیا ہے اور امیرؔ سے بڑھ گئے ہیں۔

داغؔ نے بھی دو قافیے اور کہے ہیں جو امیرؔ کے یہاں نہیں البتہ "مسیحائی" کا قافیہ جلالؔ کے یہاں ہے۔ شکیبائی کا قافیہ اُن کے یہاں بھی نہیں ہے۔

جلالؔ۔ مرتے کیسے لب جاں بخش سے اس بت کے جلا — نام زندہ ہے مسیحا کی مسیحائی کا

داغؔ زندہ ہے نام شہادت کا اسی کے دم سے — تیرے کشتے نے کیا کام مسیحائی کا

وہ یہ کہتے ہیں مرا صبر پڑے گا تجھ پر — اب مجھے رنج نہیں اپنی شکیبائی کا
تھم گئے جم گئے آنکھوں میں لہو کے قطرے — خون ظاہر ہے مرے صبر و شکیبائی کا

نام زندہ ہے دونوں نے کہا ہے مگر جلالؔ داغؔ سے جیت گئے ہیں۔

جلالؔ نے چند اور قافیے کہے ہیں جو امیرؔ و داغؔ دونوں کے یہاں نہیں ہیں۔

جلالؔ کون اُن سے کہے قصہ شب تنہائی کا — شمع خاموش کو یارا نہیں گویائی کا
مار ڈالے گی دورنگی تری اے دہر دورنگ — ڈھنگ ہے یہ کسی معشوق کی رعنائی کا
بیڑیاں دیکھ کے ڈھارس مجھے دیتا ہے جنوں — دل نہ بھاری ہو کہ زیور ہے یہ سودائی کا
نخل طوبےٰ ہے ترے قد سہی کی تصویر — باب فردوس ہے نقشہ تری انگڑائی کا

امیرؔ۔ ظاہر میں ہم فریفتہ حسن بتاں کے ہیں — پر کیا کہیں نگاہ میں جلوے کہاں کے ہیں
سات آسماں کو توڑ کے تا عرش جا چکا — اے تیر آہ بس اب ارادے کہاں کے ہیں

شکوہ شب وصال میں تا چند چپ بھی ہو — لے دل نکالے تو نے یہ جھگڑے کہاں کے ہیں
دنیا میں بھی سفر ہمیں عقبےٰ میں بھی سفر — ہم لوگ رہنے والے الٰہی کہاں کے ہیں
خنجر کو چوس چوس کے کہتے ہیں میرے زخم — ظالم مزے بھرے ہوئے تجھ میں کہاں کے ہیں
یاں جان پر بنی ہے تجھے ہیں رکاوٹیں — اے تیغ یار چل بھی یہ غمزے کہاں کے ہیں
ان ابروؤں سے حضرت دل روز سامنا — کہیے تو آپ ایسے بہادر کہاں کے ہیں

جلال۔ رکتا ہے دم نفاق عجب جسم و جاں کے ہیں — کیوں اے فراق دوست یہ جھگڑے کہاں کے ہیں
کیا جانے لے چلی ہے کدھر بیخودی ہمیں — خود پوچھتے ہیں ہم کہ ارادے کہاں کے ہیں

داغ۔ جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں — مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں[ل] کے ہیں
کیا اضطراب شوق نے مجھ کو خجل کیا — وہ پوچھتے ہیں کہیے ارادے کہاں کے ہیں
عاشق ترے عدم کو گئے کس قدر تباہ — پوچھا ہر ایک نے یہ مسافر کہاں کے ہیں

اس قافیے میں امیر نے بہت ہی اچھے شعر کہے ہیں۔ البتہ "ارادے کہاں کے ہیں" اس میں جلال امیر و داغ دونوں سے آگے نکل گئے ہیں۔

امیر۔ وہ اور وعدہ وصل کا۔ قاصد۔ نہیں نہیں — سچ سچ بتا یہ لفظ انھیں کی زباں کے ہیں

جلال۔ چھپتے نہیں گواہ جو سوز نہاں کے ہیں — چند اشک گرم ہیں کئی چھالے زباں کے ہیں

داغ۔ کھلتے نہیں ہیں راز جو سوز نہاں کے ہیں — کیا پھوٹنے کے واسطے چھالے زباں کے ہیں
ناصح کے سامنے کبھی سچ بولتا نہیں — میری زباں میں رنگ تمھاری زباں کے ہیں
کیسا جواب حضرت دل دیکھیے ذرا — پیغام بر کے ہاتھ میں ٹکڑے زباں کے ہیں

امیر نے بول چال سے واقعہ سامنے کر دیا ہے یہ قافیہ اُن کے حصے کا ہو گیا۔

امیر۔ گھبرا کے جب فراق میں مانگی دعائے وصل — آئی صدا ابھی تو مقام امتحاں کے ہیں
سمجھے یہ ہم جو خلد میں حور آ گئی نظر — شاید ابھی مقام میں ہم امتحاں کے ہیں

جلال۔ ہلچل میں حشر کی وہی اپنی جگہ پہ تھے — ثابت قدم جو معرکۂ امتحاں کے ہیں

ل۔ لکھنؤ میں اس محاورے کے ساتھ اس صفت کا بھی کہنا ضروری بات ہے جس کی طرف اشارہ ہو۔ جیسے وہ کہاں کے ایسے گئے گزرے تھے۔ وہ کہاں کے ایسے سخی ہیں۔ امیر نے بھی ساتویں شعر میں کہا ہے۔

دل دیکھنے کو کہتے تھے دل پھیر لیجیے　پہلو نئے نئے تھیں یا د امتحاں کے ہیں

داغ۔ کرتے ہیں قتل وہ طلب مغفرت کے بعد　جو تھے دعا کے ہاتھ وہی امتحاں کے ہیں

بازو دکھائے تم نے لگا کر ہزار ہاتھ　پورے پڑیں تو دو بھی بہت امتحاں کے ہیں

امیر نے دونوں شعر لاجواب کہے ہیں۔ داغ کے یہاں تکلف اور آورد معلوم ہوتی ہے۔ داغ سے تو جلال کے شعر اچھے ہیں۔

امیر۔ شہرے جو دور دور ہماری فغاں کے ہیں　دہشت سے ہوش اڑے ہوئے نہ آسماں کے ہیں

اس ہرزہ کو کیا میں لکھوں شرح اشتیاق　اے کلک کل یہ سات ورق آسماں کے ہیں

جلال۔ اے آہ اُن سے پہلے سمجھ ہجر یار میں　آزار دینے میں جو شریک آسماں کے ہیں

عاشق تری گلی سے نجائیں گے بے مٹے　نقش زمیں ہیں داغ دل آسماں کے ہیں

داغ۔ جس دن سے کچھ شریک ہوئی میری مشت خاک　اس روز سے زمیں پہ ستم آسماں کے ہیں

اس قافیے میں جلال نے امیر و داغ دونوں سے اچھے شعر کہے ہیں۔

امیر۔ یاران رفتہ سے کبھی جا ہی ملیں گے ہم　آخر تو پیچھے پیچھے اسی کارواں کے ہیں

جلال۔ منزل میں رہ کے بیٹھ گیا ہے ہجوم یاس　تھکتے نہ ہم تھکائے ہوئے کارواں کے ہیں

اس قافیے میں داغ کا شعر نہیں ہے۔

اس قافیے میں امیر جلال سے بڑھے ہوئے ہیں۔

امیر۔ اس طفل تند خو سے جو ملتا ہوں اے امیر　کہتے ہیں لوگ ڈھنگ بُرے اس جواں کے ہیں

جلال۔ خود آرزوے وصل میں بوڑھے ہوئے ہوئے　صدمے تو نامرادی بخت جواں کے ہیں

اس قافیے میں داغ کا شعر نہیں ہے۔

اپنے اپنے رنگ میں دونوں کے شعر اچھے ہیں۔

جلال۔ نذر مژہ ٹھہر گئے عارض پہ رہ گئے　رنگ آنسوؤں کی چال میں مجھ ناتواں کے ہیں

داغ۔ قاصد یہاں سے برق تھا پر نصف راہ سے[1]　بیمار کی ہے چال قدم ناتواں کے ہیں

اس قافیے میں امیر کا شعر نہیں ہے۔

---

[1] یہ مضمون اگر قاصد کی واپسی میں ہوتا تو میرے خیال میں دو پہلو نکلتے اور لطف دوبالا ہو جاتا۔

جلال کا شعر داغ کے شعر سے اچھا ہے۔

امیر نے چند اور قافیے کہے ہیں جو جلال اور داغ کے یہاں نہیں ہیں۔

امیر۔ ڈوبے ہوئے لہو میں نظر آئیں کیوں نہ گل — سینچے ہوئے مری مژۂ خونفشاں کے ہیں
ناوک فگن چمک یہ ترے عارضوں کی ہے — دو آئنے لگے ہوئے گھر میں کماں کے ہیں
ٹھکرا کے میرے سر کو وہ کہتے ہیں ناز سے — لو ایسے مفت سجدے مرے آستاں کے ہیں
طاقت ہماری گھٹ گئی ہمت نہیں گھٹی — پیچھا کریں تو آگے ہی عمر رواں کے ہیں
مرکر بھی ہم کو مے سے تعلق وہی رہا — تختے لحد میں پیر مغاں کی دکاں کے ہیں
روشن چراغ برق سے رہتا ہے رات بھر — چمکے ہوئے نصیب مرے آشیاں کے ہیں
اے ہمت بلند ابھی تو کمی نہ کر — جلوے جو خاص ہیں وہ اُدھر لامکاں کے ہیں
بلبل کو عشق گل تھا نہ قمری کو عشق سرو — سارے یہ گل کھلائے ہوئے باغباں کے ہیں

جلال نے چند اور قافیے کہے ہیں جو امیر اور داغ کے یہاں نہیں ہیں۔

جلال۔ کس طرح ادا کرتے ہیں میں بھول ہی گیا — احسان مجھ غریب پہ ضبط فغاں کے ہیں
فریاد ہم خدا سے کریں بھی تو کیا کریں — مارے ہوئے تغافل جور بتاں کے ہیں
گزرے خبر جو غیر کے دل میں بھی تم پہ چھپو — ہرکارے ہر جگہ مرے وہم و گماں کے ہیں
اپنا غم فراق نے دونوں کو کر لیا — اب دل جگر ہمارے نہیں میہماں کے ہیں
نقش قدم پکارتے ہیں راہ عشق میں — مٹ جائے حوصلے جسے نام و نشاں کے ہیں
حسرت ہے بسملوں کو بھی دم توڑ لیں تو یوں — انداز جانکنی وہ ترے نیم جاں کے ہیں
کیونکر اٹھائیں گنبد مدفن کا بوجھ وہ — شاکی تہ مزار جو خواب گراں کے ہیں
کیا دوستوں سے بھاگتے پھرتے ہیں اے جنوں — ہم موسم بہار میں پتے خزاں کے ہیں
واعظ سے شخص کو بھی زباں سے نہ بد کہا — کیا نیک لوگ صحبت پیر مغاں کے ہیں
سنتا ہے کچھ نہ شیخ ہماری نہ برہمن — ناقوس کیسے پھکتے ہیں کیا غل اذاں کے ہیں
بت اہل دیر کہتے ہیں کعبے میں سب خدا — دو اک پتے یہ اُس صنم بے نشاں کے ہیں
رحمت کچھ آگے بڑھ کے انھیں لے گی اے جلال — جو پیچھے پیچھے حشر میں پیر مغاں کے ہیں

امیر۔ صورت غنچہ کہاں تاب تکلم مجکو
منہ کے سو ٹکڑے ہوں آئے جو تبسم مجکو

زرد دکھلاتی ہے دنیا کا سپید اور سیاہ
اس کی شام مسی و صبح تبسم مجکو

غنچہ سان نزہت خاطر سے عدم کو پہنچا
بال و پر ہو گئے لب وقت تبسم مجکو

ہو مرے قتل کی یارب یہ خوشی قاتل کو
بڑھ کے دے چار قدم تیغ تبسم مجکو

تجکو قاتل ہی کے لعل لب خنداں کی قسم
نیم جاں چھوڑ نہ اے تیغ تبسم مجکو

شمع سان محفل عالم میں ہوں وہ سوختہ بخت
دل بھر آتا ہے جو آتا ہے تبسم مجکو

جلال۔ کیا ہنسی ہے دہن یار کا اب گم رہنا
کچھ نشاں دے گئے آثار تبسم مجکو

غم نصیبوں میں محبت کے خوشی کا کیا کام
کہیں ہنسنے تو نہ آیا ہو تبسم مجکو

چھپتے ہیں صبح شب وصل کے آثار کہیں
پہلے دیتا ہے خبر تیرا تبسم مجکو

زخم ہوں میں کوئی اے تیغ جفائے ہجراں
خون روتا ہوں جو آتا ہے تبسم مجکو

لوگ جاں بخش کہیں جنبش لب کو تیری
قتل کرتی ہے یہی بن کے تبسم مجکو

گریہ کیا جانے مرا زخم میں کیا جانوں ہنسی
اس کو رونا میں بتا دوں وہ تبسم مجکو

داغ۔ سہم جاتی ہے خوشی ڈرتی ہے فرحت مجھ سے
کبھی آتا ہے تو دزدیدہ تبسم مجکو

ہنستے ہنستے کبھی روتا ہوں تصور میں ترے
روتے روتے کبھی آتا ہے تبسم مجکو

غم و شادی کے لئے شرط ہے الفت تیری
نالۂ بلبل مجھے دے غنچہ تبسم مجکو

میں بھی حیران ہوں اے داغ کہ یہ ہے کیا بات
وعدہ وہ کرتے ہیں آتا ہے تبسم مجکو

مسکرائے مری میت پہ وہ منہ پھیر کے داغ
حشر تک یاد رہے گا یہ تبسم مجکو

امیر نے خوب تشبیہیں اور استعارے تبسم کے لئے نکالے خصوصاً چوتھے شعر میں مگر جلال کے پہلے اور تیسرے شعر نے اور داغ کے چوتھے اور پانچویں شعر نے ستم ڈھایا ہے۔

امیر۔ مر کے راحت تو ملی پر ہے یہ کھٹکا باقی
آکے عیسیٰ سر بالیں نہ کہیں قم مجکو

زندہ اعجاز مسیحا سے تو ہو سکتا ہوں
ضعف سے اٹھ نہ سکوں گا نہ کہیں قم مجکو

جلال۔ اپنے کوچے سے اٹھاتے نہیں اک تم مجکو
آئے عیسیٰ بھی تو فرماتے ہوئے قم مجکو

کون آیا تھا دم نزع کہ میں جی اٹھا | ہوگئی موت کی ہچکی کی صدا قم مجکو
کشتہ اک رشک مسیحا کے تغافل کا ہوں | جو قیامت بھی اٹھائے تو کہے قم مجکو

داغ۔ معجزہ حضرت عیسےٰ کا غلط بھی تو نہیں | درد اٹھتا ہے وہ کہتے ہیں اگر قم مجکو

جلال امیر اور داغ دونوں سے بڑھ گئے ہیں۔

امیر۔ لے گئی کل ہوس مے جو سر خم مجکو | ہوش کی طرح سے مستی نے کیا گم مجکو
وقت فرصت تھا میں عبرت کدہ ہستی میں | کف افسوس ملے جس نے کیا گم مجکو
ہوں وہ مضموں کہ زمانے کو اگر ہاتھ آؤں | صورت گوہر نایاب کرے گم مجکو
واہ اے بیخودی شوق کیا خوب سلوک | اس کو جب ڈھونڈ نکالا تو کیا گم مجکو
میں ترا عکس تھا اس آئینۂ ہستی میں | تو نے کیا پھیر لیا منہ کہ کیا گم مجکو
ہوں میں نقش قدم اس رہ گزر ہستی میں | ایک ظاہر جو کرے چار کریں گم مجکو
لے چلی ہے تو سنبھالے ہوئے لے چل اے یار | بیخودی راہ میں کرنا نہ کہیں گم مجکو
دیکھ لوں ان کو ذرا نزع میں آلینے دے | دم اسے بے خبری کر نہ ابھی گم مجکو

جلال۔ خضر اس راہ میں لے چلتے نہیں تم مجکو | گم کردوں ہوش کو میں ہوش کرے گم مجکو
خواہش دل ہے کہ کھو آؤ ہمیں جا کے جلال | عقل کہتی ہے وہاں پہلے کرو گم مجکو
اب میں جاتا ہوں کہاں داغ جگر کہتا ہے | دل نہیں ہوں کہ جو کردو گے کہیں گم مجکو
کیا ہجوم نگہ شوق ہے رکھا جس نے | چشم اغیار سے محفل میں تری گم مجکو

داغ۔ جب گئی کہہ کے گئی میری دعا سے تاثیر | گم کرے تجکو خدا تو نے کیا گم مجکو
ضعف نے نام کو تھوڑا سا نشاں رکھا تھا | تو نے اے بیخودی شوق کیا گم مجکو
دل نے سرمایۂ صد راحت و آرام و نشاط | کھو کے پایا تھا اُسے پا کے کیا گم مجکو

جلال اور داغ نے بھی اس قافیے میں خوب خوب شاعری کی ہے مگر امیر کو اس میں تفوق حاصل ہے۔ شعر نمبر ۴۔ ۵ اور ۶ سب سے اچھے کہے ہیں۔

امیر۔ اشک ساں خاک میں ملنا بھی مجھے طاعت ہے | لاکھ سجدے کے برابر ہے تیمم مجکو
کعبۂ رخ کی طرف پڑھنی ہے آنکھوں سے نماز | چاہیئے گرد نظر بہر تیمم مجکو

شوقِ طوفِ حرمِ عشق میں باندھی ہے کمر　　گردِ غربت سے مناسب ہے تیمم مجکو
ہو سرِ عجز سے تا مشل گہر سجدہ قبول　　چاہیے گردِ یتیمی سے تیمم مجکو

جلال۔ دامن دست جنوں پر بجھے پڑھنی ہے نماز　　تربت قیس پہ کرنا ہے تیمم مجکو

داغ۔ دیکھ لے وادی ایمن بجھے وہ خاک ہوں میں　　کہ فرشتوں نے لیا بھر تیمم مجکو
آتش تر سے یہ میخانہ ہے آتش خانہ　　یاں وضو چاہیے زاہد کہ تیمم مجکو

تیمم کے لیے آمیر کی فکر فلک پیما نے کیسی کیسی گرد تلاش کی اور کیا کیا مضامین عالی پیدا کیے ہیں۔ داغ کی طبیعت نے تیمم کرنے میں بھی شوخی کی ہے۔

آمیر۔ قطرۂ مے نے کیا ہوش صفت گم مجکو　　ہر حباب سے پر زور ہو اخُم مجکو
آبرو یہ ہے مری پیر مغاں کے آگے　　منہ سے ساغر جو نکل جائے تو دے خم مجکو
مجلس وعظ میں میں مست اگر جا بیٹھوں　　مغبچے کھینچ کے لے جائیں سر خم مجکو
خم مے تھا کبھی اک قطرے سے کم اے ساقی　　اب وہی میں ہوں کہ ہے قطرۂ مے خم مجکو
میں جو مر جاؤں تو اے پیر مغاں کہہ دینا　　مغبچے کھینچ کے ڈال آئیں پس خم مجکو
ہوں وہ میکش جو کروں رُخ در توبہ کی طرف　　بہکے جاتے ہو پکارے دہن خم مجکو
بحث کو آئے جو واعظ مجھے آجائے یہ جوش　　لب ملیں ساغر مے کے دہن خم مجکو
ہوں میں وہ رند کہ مسجد میں لگاؤں زاہد　　ہاتھ آجائے اگر خشت سر خم مجکو

جلال۔ یارب آباد رہیں زیر فلک بادہ پرست　　لا کے میخانے میں گاڑا ہے تہ خم مجکو
دل سرشار بغل میں ہے مری جائے سبو　　سر شوریدہ ملا ہے عوض خم مجکو
دل مرا از حقِ ساقی میں بھرا آتا ہے　　یوں نہ خالی نظر آئے تھے بھرے خم مجکو
ہوش کو اس میں فلاطوں کی طرح گم کرتا　　اس خرابات میں ملتا جو کوئی خم مجکو

داغ۔ دیکھے مستی میں جو سرگرم تکلم مجکو　　کہے واعظ بھی کہ اللہ کوئی خم مجکو
ساقیا اس میں کھنچی کیا کسی مجذوب کی رُوح　　کوئی کھینچے لیے جاتا ہے سوئے خم مجکو
ساقیا تشنۂ مے کیا تری آنکھیں کم ہیں　　کہ ملے جام مجھے شیشہ مجھے خم مجکو
لطف توبہ کا مزا توبہ کا یہ ہے زاہد　　ضد سے ساقی نے پلائے ہیں کئی خم مجکو

کیوں گنہ لیتے ہیں تھوڑی سی پلانے والے ‏ کل ملے کوثر اسے آج جو دے خم مجکو
دیکھنا پیر مغاں حضرت زاہد تو نہیں ‏ کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پس خم مجکو

امیر و جلال نے بھی اچھے اچھے شعر کہے ہیں مگر داغ دوسرے اور چوتھے شعر سے جیت گئے ہیں۔

امیر۔ وحشت دل سے زمانے میں پھروں مثل نگاہ ‏ سات پردوں میں کریں قید جو مردم مجکو
شمع کی طرح میں وہ سوختہ قسمت ہوں امیر ‏ مول لے لے کے جلا دیتے ہیں مردم مجکو
مردمک ہوں کہ سویدا ہوں الٰہی کیا ہوں ‏ دیدہ و دل میں جگہ دیتے ہیں مردم مجکو
خط نکلنے سے ترے سوگ نشیں ہیں آنکھیں ‏ کھل گئی وجہ سیہ پوشی مردم مجکو

جلال سب کی آنکھوں کی میں پتلی ہوں وہ بت کہتا ہے ‏ دیکھ سکتے نہیں اس وجہ سے مردم مجکو
آپ میں کون ہے سمجھاتے ہیں کس کو یہ جلال ‏ آدمی سمجھے ہوئے ہیں ابھی مردم مجکو

داغ۔ رشک نے جلوۂ دیدار سے رکھا محروم ‏ کہ رہے مد نظر[1] دیدۂ مردم مجکو

اس قافیے میں جلال کا پہلا شعر سب سے اچھا ہے۔

امیر۔ ہوں میں مشتاق شہادت کہیں حسرت تو مٹے ‏ خاطر غیر ہی سے قتل کرو تم مجکو
خلوت وصل میں کچھ کام نہیں ساقی کا ‏ جام مے بھر کے پلاؤں میں تمھیں تم مجکو
میں تو کیا عکس سے وہ آئینہ رد کہتا ہے ‏ پیار کی آنکھ سے دیکھا نہ کرو تم مجکو
دی صدا دل کو جو اس بزم میں تنہا چھوڑا ‏ ساتھ لائے تھے اسی دن کے لئے تم مجکو
صاف کہدو نہیں دیدار دکھانا ہے اگر ‏ کعبہ و دیر میں دوڑاتے ہو کیوں تم مجکو

جلال شوق کی بیخودیوں نے یہ کیا گم مجکو ‏ ڈھونڈھتا ہوں میں تمھیں ڈھونڈتے ہو تم مجکو
حشر میں چھپ نہ سکا حسرت دیدار کا راز ‏ آنکھ کمبخت سے پہچان گئے تم مجکو

داغ۔ عرصۂ[2] حشر میں اللہ کرے گم مجکو ‏ اور پھر ڈھونڈتے گھبرائے ہوئے تم مجکو
غیرت ماہ کہے خسرو انجم مجکو ‏ نام کو داغ ہوں کیا جانتے ہو تم مجکو

---

[1] مد نظر میں رعایت لفظی تو ضرور ہے مگر یہ لفظ اس جگہ زبان اردو میں کچھ بے موقع سا معلوم ہوتا ہے۔

[2]۔ مذاق سلیم سے گزر گئے۔

اپنے رونے پہ پھر آیا جو تبسم مجھکو | یاد نے اس کی کہا بھول گئے تم مجھکو
دیکھنا پھیڑ سر حشر مرے پاس آکر | کہتے ہیں کون ہوں میں جانتے ہو تم مجھکو
اس تمنا سے مرے در پے آزار نہ ہو | کہ مجھے ہو یہ گماں چاہتے ہو تم مجھکو
کیوں نہ حیران پریشان ہوں سننے والے | میں بھلا تم کو کہوں اور برا تم مجھکو

آمیر نے پہلا تیسرا اور چوتھا شعر لاجواب کہا ہے۔

آمیر۔ ہوں میں وہ قطرہ جو نیساں کی بغل سے چھوٹوں | کھینچ لے شوق سے آغوش میں قلزم مجھکو
لالہ و گل ہوں خس و خار ہوں یارب کیا ہوں | ڈوبتا ہوں تو ڈبوتا نہیں قلزم مجھکو

جلال۔ گریۂ عشق کی نیرنگ نمائی دیکھو | چند قطروں نے دکھائے کئی قلزم مجھکو

داغ۔ جم گئی گرد رہ میکدہ مجھ پر واعظ | خاک سے پاک کرے بحر نہ قلزم مجھکو
کیا کرے دیکھیے کوثر پہ مری تشنہ لبی | سوکھ جاتا ہے یہاں دیکھ کے قلزم مجھکو

اس قافیے کو دیکھیے اور داغ کے پہلے شعر کی شوخی کو۔

آمیر۔ نہیں معلوم وہ مہمان ہوئے ہیں کس کے | آج گھر گھر لیے پھرتا ہے توہم مجھکو
نظر بد نہ لگے یار کی صفائی کو | قتل ہونے نہیں دیتا یہ توہم مجھکو

جلال۔ بیخودی سی جو شب وصل ہے چھ دونوں طرف | بدگمانی انھیں ہوتی ہے توہم مجھکو
خاطر غیر کہاں میری جگہ اس میں کہاں | ساتھ اُن کے لیے پھرتا ہے توہم مجھکو
لامکاں ہی میں اُسے ڈھونڈتا ہوں میں پھر کر | بے ٹھکانے کی سجھاتا ہے توہم مجھکو

داغ۔ جب آنکھوں میں سمائی ہیں وہ کافر نظریں | رات دن اپنی نظر سے ہے توہم مجھکو
تم کہاں غیر کہاں جھوٹ غلط محض دروغ | خفقاں ہے یہ جنوں ہے یہ توہم مجھکو

جلال کا پہلا اور دوسرا شعر اور داغ کا پہلا شعر بہت ہی اچھا ہے مگر آمیر اپنے پہلے شعر سے سب میں اول رہے ہیں۔ ایک واقعہ ہے[1] نہیں معلوم وہ مہمان ہوئے ہیں کس کے ؎ آج گھر گھر لیے پھرتا ہے توہم مجھکو۔

آمیر۔ اشک ساں جنبش مژگاں نے کیا گم مجھکو | لغزش پا ہوئی دریا کا تلاطم مجھکو

[1] ۔ دوسرے مصرع پر یہ لفظ پھبتا نہیں۔ اس سے تو شاید فکر اچھا ہوتا۔

جلال۔ بخت دل مضطر بانہ کوئی آیا سو چشم | دے رہا ہے خبر اشکوں کا تلاطم مجکو
جوشش گریہ میں اللہ رے بیتابئ دل | لے نہ ڈوبے کہیں کشتی کا تلاطم مجکو
داغ۔ کیا ڈبوئے گا ترے عشق کا قلزم مجکو | موج ساحل ہے سفینہ ہے تلاطم مجکو

جلال نے دونوں شعر خوب کہے ہیں مگر امیر کا مطلع بڑھ گیا ہے۔

امیر۔ اس قدر طول خموشی کو ہوا عزلت میں | بزم میں بھول گئی طرز تکلم مجکو
جلال۔ اکثر اس بات پہ آتا ہے تبسم مجکو | دہن ان کو نہ ملا تاب تکلم مجکو
دل کو سمجھاتی تھی کچھ یاد تری سینے میں | رات بھر آئی ہے آواز تکلم مجکو
لاکھ احسان تری بزم میں خاموشی کے | بھولتے جاتے ہیں انداز تکلم مجکو
گفتگو طور پہ باہم نہ کچھ آجائے کلیم | شوق دیدار تھیں شوق تکلم مجکو
داغ۔ یا سنادے مرے مطلب کی کوئی اے ناصح | یا یہ کہدے کہ نہیں تاب تکلم مجکو
میں نے اس حال پہ بھی دل کو بہت سمجھایا | ضعف سے گرچہ نہ تھی تاب تکلم مجکو
ضبط وہ شے ہے کہ اے حضرت موسیٰ دیکھو | آپ وہ دیتے ہیں تکلیف تکلم مجکو

جلال کی فکر نے تیسرے شعر میں خوب کام کیا مگر امیر کی فکر اس سے بہتر کام کر گئی ہے

امیر۔ اور تھا کون شب ہجر مصیبت کا شریک | دیکھ لیتا تھا میں انجم کو تو انجم مجکو
بے ثباتی میں نہیں کون سی جا میری نمود | ذرے چنتے ہیں مجھے گنتے ہیں انجم مجکو
برسوں جھیلی ہے مصیبت شب تنہائی کی | مدتیں گزری ہیں گنتے ہوئے انجم مجکو
شب کو نکلوں جو میں لاغر تو وہیں مثل کمند | کھینچ لے جائے شعاع مہ و انجم مجکو
جلال۔ اک تماشا نگہ یاس ہوئی تھی شب ہجر | دیکھتا تھا میں فلک کو مہ و انجم مجکو
کوکب بخت سیہ کے یہ اشارے تھے فلک | آنکھ شب بھر جو دکھایا کیے انجم مجکو
وصل کی شب سے جو کہتا ہوں ٹھہر کہتی ہے | جب ٹھہرنے بھی تو دے گردش انجم مجکو
دیکھ کر انجمن آرا مجھے جلتا ہے فلک | داغ یا رب دیے ہوتے اُسے انجم مجکو
امیر۔ نگہ مہر کہاں یار جفا پیشہ کہاں | ملک الموت سے ہے چشم ترحم مجکو
دیکھتا ہوں کبھی آئینہ تو روتا ہوں امیر | اپنی صورت پہ خود آتا ہے ترحم مجکو

وائے قسمت کہ یہاں قتل کی حسرت ہے امیرؔ — اور وہ سمجھے ہیں سزا وار ترحم مجکو
جلالؔ۔ دل کو تعزیر نہ دو قتل کرو تم مجکو — حال دشمن پہ بھی آتا ہے ترحم مجکو
کاٹنا حلق کا آساں تمھیں لیکن مشکل — قطع کرنی ادھر امید ترحم مجکو
امیرؔ۔ اثر طالع واژوں سے عجب کیا ہے اگر — تیغ بن جائے مرا دست تظلم مجکو
جلالؔ۔ عشق منصف بھی ہے ایسا کہ بتاتا ہے تو ساتھ — ظلم کے ڈھنگ اُسے آئیں تظلم مجکو

یہ قافیے داغؔ کے یہاں نہیں ہیں۔

"انجم" اور "ترحم" دونوں قافیے امیرؔ نے جلالؔ سے اچھے کہے ہیں۔ اور "تظلم" کا قافیہ اپنے اپنے رنگ میں دونوں نے اچھا کہا ہے۔

امیرؔ نے کچھ قافیے اور بھی کہے ہیں۔

امیرؔ۔ ایک کو ایک سے بڑھکر ترے جلوے کا ہے شوق — آنکھ کہتی ہے نگہ پر ہو تقدم مجکو
جانتے ہیں جو حقیقت سے ہیں آگاہ امیرؔ — کن کے کلمے پہ بھی معنیٰ ہے تقدم مجکو
حشر میں وجد کناں قبر سے یارب نکلوں — نفخۂ صور ہو آواز ترنم مجکو
سوز دل وجد کا باعث ہے یہاں مثل سپند — میری فریاد ہے آواز ترنم مجکو
دھوکا کھائے ہوئے آدم کو زمانہ گزرا — ہنستے ہیں دیکھ کے اب تک لب گندم[1] مجکو

جلالؔ نے ایک "کژدم" کا قافیہ اور کہا ہے۔

جلالؔ۔ مستعد نیش زنی پر رگ جاں ہجر میں ہے — سانس کہتی ہے کہ سمجھے رہو کژدم مجکو
ڈنک سے پڑتے ہیں ہر گام ترے کوچے میں — غیر کے نقش قدم ہو گئے کژدم مجکو
کجروی مجھ سے زمانے کی چلی جاتی ہے — چھیڑے جاتا ہے شب دردزیہ کژدم مجکو

امیرؔ ابرو یار نہ بھولے کبھی دل شاد رہے — خوب مطلع ہے یہ اللہ کرے یاد رہے
یہ کہوں گا یہ کہوں گا یہ ابھی کہتے ہو — سامنے اُن کے بھی جب حضرت دل یاد رہے
حشر میں غدر گنہ کیا ہے بتا تو رکھو — کہ مبادا تمھیں بھولے تو مجھے یاد رہے
میں اگر غیر کوئی ہوں تو مجھے وہ بھولے — وہ اگر اور کوئی ہو تو مجھے یاد رہے

[1] ۔ اس ردیف کے ساتھ اس بتذل قافیے کو دیکھئے اور امیرؔ کی فکر عالی کو۔

طول فرقت سے مزے وصل کے سب بھول گئے — نہ وہ باتیں نہ وہ راتیں نہ وہ دن یاد رہے
ہجر میں یار نے پوچھا نہ اجل نے ہم کو — نہ اُسے یاد رہے ہم نہ اسے یاد رہے
کیا عجب بھول گئے ہم جو کلام اپنا امیر — یاد رہنے کے جو قابل ہو کیا یاد رہے

جلال۔ شکوۂ جور بتوں سے نہ کروں گا لیکن — بھول جانے کا گلہ وہ بھی اگر یاد رہے
یار کی ایک جفا کے مرے دل میں سو داغ — سو وفائیں مری اور اک نہ اُسے یاد رہے
نزع میں موت اگر بھول گئی بھول گئی — بار بار آتی ہے ہچکی کو تو ہم یاد رہے
خود فراموش ہی الفت میں کسی کی رہیے — کچھ تو دنیا میں وہ کر جائیے جو یاد رہے

داغ۔ رنج وہ رنج ہے جس میں نہ بتوں کو بھولیں — عیش وہ عیش ہے جس میں نہ خدا یاد رہے
وعدۂ حشر پہ کیا صبر ہو تم کہہ دو گے — ایسے ہنگامۂ جانکاہ میں کیا یاد رہے
باہم اک وعدۂ فردا پہ نوشتہ ہو جائے — کہ مری سہو کی عادت ہے مجھے یاد رہے
اس دل تنگ میں کس کس کو جگہ دوں یارب — غم رہے دم رہے فریاد رہے یاد رہے
تم نے اے داغ محبت سے کیا ہے انکار — یہ سخن یاد رہے یاد رہے یاد رہے

امیر نے خوب خوب شعر کہے ہیں اور تیسرا شعر تو اپنا جواب نہیں رکھتا ہے

حشر میں عذر گنہ کیا ہے بتا تو رکھو — کہ مبادا تمھیں بھولے تو مجھے یاد رہے

امیر۔ زعفراں زار میں بھی گر دل ناشاد رہے — یہی گریہ یہی نالہ یہی فریاد رہے
لامکاں میں نہ ٹھکانا نہ مکاں میں وسعت — دل سے نکلے تو کہاں جا کے یہ فریاد رہے
شادی و رنج زمانے میں ہیں توام اے دل — کچھ تو ہونٹوں پہ ہنسی بھی دم فریاد رہے

جلال۔ زندگی بھر مزۂ ضبط فغاں یاد رہے — کوئی چٹکی بھی تو لے دل میں جو فریاد رہے
طوق گردن میں ہماری بھی ہو قمری کی طرح — اک گلا گھونٹنے والا دم فریاد رہے
جو خدا بھی نہ سنے اس بت کافر کی طرح — نہ ادھر کی نہ اُدھر کی مری فریاد رہے
ہے یقیں حشر میں الجھائے کسی سے وحشت — صور سے دست و گریباں مری فریاد رہے
زندگی اس کی ہو کیونکر جو محبت میں جلال — منہ سے اف کر نہ سکے حسرت فریاد رہے

داغ۔ یار کا پاس نزاکت دل ناشاد رہے — نالہ رکتا ہوا تھمتی ہوئی فریاد رہے

ہوں وہ ناکام تمنا جو اثر ہاتھ بھی آئے ۔ مجھ سے دامن میں چھپائے مری فریاد رہے
یہ رہا عرش تولے حوصلۂ دل دیکھا ۔ میں نہ کہتا تھا کہ سینے ہی میں فریاد رہے
خاک آیا جو مرے منہ کو کلیجا آیا ۔ کوئی دن کاش یہ مُہرِ لبِ فریاد رہے

اس قافیے میں داغ نے امیر اور جلال سے اچھے شعر کہے ہیں۔

امیر۔ ہوں وہ مقتول مُرے قتل کی ایسی ہو خوشی ۔ رقص میں تیغ رہے وجد میں جلاد رہے
بسملوں کی نگہِ یاس بری ہوتی ہے ۔ اک ذرا دل کو سنبھالے ہوئے جلاد رہے
قتل بے خنجر و شمشیر جو ہو مدِّ نظر ۔ اک ذرا آپ کو کھینچے ہوئے جلاد رہے
روزِ جانباز لڑے شوقِ شہادت میں امیر ۔ کیسے ہنگامے سر کوچۂ جلاد رہے
جلال۔ آتی ہے سوکھے ہوئے حلق سے کشتوں کی صدا ۔ آبروئے برشِ خنجرِ جلاد رہے
خلق جو ر ملک الموت سے پا جائے نجات ۔ جانستانی پہ جو آمادہ وہ جلاد رہے
داغ۔ کوئی مشتاقِ شہادت نہ کہیں سر ہو جائے ۔ بس بہت حق میں ہر اک شخص کے جلاد رہے

امیر نے دوسرا اور تیسرا شعر خوب کہا ہے۔

امیر۔ رشک ہے بعدِ فنا مجکو فلک سے تو یہ ہے ۔ میں ستم کش نہ رہوں یہ ستم ایجاد رہے
داغ۔ تنگ آیا تو مرے منہ سے شکایت نکلی ۔ لب پہ آئی ہوئی کیونکر ستم ایجاد رہے

امیر نے داغ سے اچھا کہا ہے۔

امیر۔ ہم جو پہنچے تو لبِ گور سے آئی یہ صدا ۔ آیئے آیئے حضرت بہت آزاد رہے
جلال۔ بے تعشق کوئی ہوتا نہیں وارفتہ مزاج ۔ کچھ تعلق کہیں پیدا ہو تو آزاد رہے
زندہ اللہ نے دیوانہ بنایا بت نے ۔ جس کے بندے تھے جھگڑوں سے ہم آزاد رہے
داغ۔ اس کے پھندے میں پھنسے دیکھیے کیونکر نکلیں ۔ جو نہ آزاد رکھے اور نہ آزاد رہے
داغ آزاد منش وہ ہے کہ لے بندہ نواز ۔ آپ کا بندہ رہے اور پھر آزاد رہے
کھو دیا عیشِ قفس اپنی وفاداری نے ۔ لطفِ صیاد سے ہم رات دن آزاد رہے

اس قافیے میں امیر نے ایک ہی شعر کہا ہے۔ مگر خوب کہا ہے "آیئے آیئے حضرت بہت آزاد رہے"۔ سامنے کا واقعہ معلوم ہوتا ہے۔

امیر۔ آنکھیں مرجانے کو کہتی ہیں یہ لب جینے کو | کیسے وہ حکم رہے کیسے یہ ارشاد رہے
داغ۔ کوئی پہلو تو رہے کہہ کے پلٹ جانے کا | آنکھ سے وہ نہ رہے لب سے جو ارشاد رہے

امیر نے داغ سے اچھا کہا ہے۔

امیر۔ اس کی تصویر میں اس درجہ نزاکت کا ہو صرف | لوح باقی نہ قلم میں ترے بہزاد رہے
کھنچ گئی یار کی تصویر تو اللہ رے خوشی | ہم بغل دیر تلک مانی و بہزاد رہے
جلال۔ دل کھنچے آتے تھے کیا کھنچتے اکی تصویر | سینوں پر ہاتھ دھرے مانی و بہزاد رہے
داغ۔ عکس رخسار سے بن جائے مصور تصویر | دیکھ لے تجکو تو بہزاد نہ بہزاد رہے

داغ نے امیر و جلال دونوں سے اچھا کہا ہے۔

امیر۔ دل اُن آنکھوں کے تصور سے مرا شاد رہے | قاف پریوں سے جہاں حور سے آباد رہے
آشیانے سے نہ مطلب ہے نہ گلشن سے غرض | گھر الٰہی مرے صیاد کا آباد رہے
جلال۔ دل کو پوچھا غم دلدار بہت شاد رہے | رہنے والا مرے ویرانے کا آباد رہے
کعبہ ہو بتکدہ ہو عرش بریں ہو دل ہو | جو مکاں جلوہ گہ یار رہے آباد رہے
اک پرستان ہے عاشق کے بھی دل کی بستی | اتنا ٹکڑا یہ غنیمت ہے جو آباد رہے
نگہ ابھی خانہ خرابی تری لائے گی جلال | دل سلامت رہے الفت کا گھر آباد رہے
داغ۔ کون تسنیم کے چھینٹوں پہ عبث شاد رہے | کچھ کمی یاں بھی نہیں میکدہ آباد رہے
دیکھ لی سیر حرم حضرت زاہد رخصت | آپ کا کعبہ مرا بتکدہ آباد رہے

یہ قافیہ جلال نے سب سے اچھا کہا ہے۔

امیر۔ ہوں وہ غم دوست کہ رو رو کے دعا کرتا ہوں | درد کا دل نہ دُکھے خاطر غم شاد رہے
جلال۔ نامرادوں کی ہوئیں آج مرادیں پوری | ہم کو ناشاد لقب اس نے دیا شاد رہے
داغ کے گھڑی چین سے تو لے دل ناشاد[1] رہے | تیرے سینے میں جو میرا دل ناشاد رہے

---

[1] میرے پاس مرجان رقم کا لکھا ہوا اور رام پور کے تاج المطابع میں ۱۲۹۶ھ کا چھپا ہوا گلزار داغ ہے اس میں یہ شعر اسی طرح لکھا ہے۔ کوئی غلط نامہ بھی شامل نہیں ہے۔ فصیح الملک مرحوم سے ایسی غلطی ہو جانا ممکن نہیں جس سے مطلع کا مطلب بھی خبط ہوتا ہے۔ شاید پہلے مصرع میں دل ناشاد کی جگہ ستم ایجاد کہا ہوگا۔

اُن سے شہرت نہ ہمی مجھ سے طبیعت نہ رکی   جانے[ا] والے نہ کبھی لے دل ناشاد رہے

"ناشاد رہے" میں داغ نے خوب بات پیدا کی ہے۔

امیر۔ بحرہستی میں حباب لب دریا کی طرح   ہم رہے کب جو کسے کوئی کہ برباد رہے

جب کیا ہم نے گلہ اپنی پریشانی کا   زلف جاناں نے کہا ہم بھی تو برباد رہے

گھل گیا غم سے اگر تن تو بنا شکل حباب   ہم ہوئے خاک سے پانی بھی تو برباد رہے

جلال۔ رائگاں سعی ہوا وہوس وحرص ہوئی   کچھ بگولے تھے کہ سرگشتہ وبرباد رہے

روح جنت میں نہ دل ہم میں نہ ہم مدفن میں   تیرے آوارہ پس مرگ بھی برباد رہے

نامہ بر بھی جو بنایا تو صبا کو ہم نے   خط کی تقدیر میں لکھا تھا کہ برباد رہے

داغ۔ خلد میں بھی نہ لگا دل ترے دیوانوں کا   یاں رہے واں رہے ویراں رہے برباد رہے

امیر کے تینوں شعر داغ وجلال کے شعروں سے اچھے ہیں۔

امیر۔ کانٹے اُلجھیں نہ کہیں دامن آزادی میں   دامن اس ڈر سے سمیٹے ہوئے شمشاد رہے

داغ۔ طبع آزاد اگر ہو قد آزاد کے ساتھ   ایک ہی پانو سے گلگشت میں شمشاد رہے

جلال کے یہاں یہ قافیہ نہیں۔

امیر نے داغ سے اچھا کہا ہے۔

امیر اور جلال نے کچھ اور قافیے بھی کہے ہیں۔

امیر۔ واہ رے شوق اسیری کہ دعا کرتا ہوں   منہ دم ذبح سُوِ خانۂ صیاد رہے

جلال۔ پر بھی ہو جائیں گے مرغان قفس کے پیدا   نظر پرورش افزائی صیاد رہے

ہم صفیر آکے نہ اس قرب پہ پوچھیں مجکو   زیر دیوار چمن خانۂ صیاد رہے

امیر۔ پھر بہار آئی چلے سوے چمن دیوانے   کہدو ہر باغ کے دروازے پر فصاد رہے

جلال۔ پانو دیتے رہے کانٹوں کو جنوں میں ایذا   ہاتھ تکلیف دہ نشتر فصاد رہے

امیر۔ ہم وہ قیدی ہیں جو لکھے وہ خط آزادی   ہے یقیں حرفوں میں شان خط صیاد رہے

[ا] جانے والوں میں ایک شہرت دوسری طبیعت ہے تو دونوں کی نسبت جانا نہیں کہہ سکتے۔ اگر کلیے کے طور پر سمجھا جائے تو میرے خیال میں رہے کی جگہ رُکے یا ٹھہرے چمک کر آتا ہے۔

جلال۔ تپش دل سے نہ ٹھہرے کبھی زنجیر میں پانو — شور آہن تفتیدہ حداد رہے
امیر۔ ایک دل ہجر میں کس کس کے یہ ناشاد رہے — قیس کا داغ کہ اس میں غم فرہاد رہے
جلال۔ ہر جگہ بھیس نیا عشق میں بدلا ہم نے — کہیں مجنوں کہیں وامق کہیں فرہاد رہے

"صیاد"۔ "فصاد" اور "حداد" تینوں قافیے امیر نے جلال سے اچھے کہے ہیں اور "فرہاد" کے قافیے میں جلال کا شعر امیر کے مطلع سے اچھا ہے۔

امیر۔ ہے یقیں پھر دل عاشق نہ کبھی غم میں رہے — عشق جا کر جو ترے حسن کے عالم میں رہے
دو جہاں چھوڑ کے عشاق ترے غم میں رہے — دونوں عالم سے جدا تیسرے عالم میں رہے
بیخودی سے ہمیں یہ حال نہ تا زیست کھلا — ایک عالم میں رہے ہم کہ دو عالم میں رہے
صرصر مرگ اڑا لے گئی سب پھولوں کو — خار ہی خار فقط گلشن عالم میں رہے
جس طرح ریگ رہے شیشۂ ساعت میں رواں — چلتے پھرتے ترے مشتاق دو عالم میں رہے
دیکھ لے ہجر میں عالم جو مرے جینے کا — مر نہ جائے تو اجل نزع کے عالم میں رہے
جلال۔ عشق بیخود جو کرے پھر نہ خودی ہم میں رہے — یہ بھی معلوم نہ ہو کون سے عالم میں رہے
کروٹیں اب تو نہ بدلے کہ شب ہجر آئی — آج سے دہر دو رنگ ایک ہی عالم میں رہے
نہ کھلے غلغلۂ حشر سے بھی آنکھ لے دل — ایک عالم تری غفلت کا دو عالم میں رہے
دیکھنا پیر مغاں کی نظر لطف کا فیض — عمر بھر رند جوانی ہی کے عالم میں رہے
ڈھونڈتے پھرتے ہیں ہم اس صنم یکتا کو — سب سے مل کر جو الگ سب سے دو عالم میں رہے
داغ۔ حور کے واسطے پریاں نہ چھٹیں گی زاہد — اس کی امید کہ جو دوسرے عالم میں رہے
گردش چشم بلا شوخی رفتار غضب — ایسے چلتے ہوئے فتنے اسی عالم میں رہے

جلال کا پانچواں شعر اور داغ کا پہلا شعر خوب ہے مگر امیر کے دوسرے اور تیسرے شعر پر اور ہی عالم ہے۔

امیر۔ مرگ دشمن کی خبر سن کے بھی ماتم میں رہے — ہم خوشی میں بھی رہے یوں کہ کوئی غم میں رہے
غم کہاں جا کے رہے گا نہ رہیں گے جب ہم — ہم تو جب تک رہے عالم میں اسی غم میں رہے
جلال۔ دل عاشق میں فلک نے کبھی رہنے نہ دیا — کہتی پھرتی ہے خوشی ہم تو اسی غم میں رہے

داغ۔ عاشق و شیفتہ و والہ و شیدا وہ ہے — رات دن لاکھ خوشی سے جو ترے غم میں رہے

جس نے جس رنگ میں کہا ہے خوب کہا ہے۔

امیر۔ حسن مرنے کا یہ ہے حسن مرے غم میں رہے — سوگ میں بیٹھے ادا ناز بھی ماتم میں رہے
شاد دل غم میں رہے عید محرم میں رہے — کچھ سپیدی بھی مرے جامۂ ماتم میں رہے
گر غریب الوطنی بھی نہ مرے غم میں رہے — اور پھر کون ہے غربت میں جو ماتم میں رہے
تم بھی رو دیا مجھے پیمانہ بھی رو دیا مجھکو — جتنے تھے چھوٹے بڑے سب مرے ماتم میں رہے
اور کوئی تو عزادار نہ تھا غربت میں — میرے کاندھوں کے فرشتے مرے ماتم میں رہے
حیف ہے تم مرے مرنے کا ذرا غم نہ کرو — آنکھ تر شمع کی پروانے کے ماتم میں رہے
چوڑیاں ٹوٹی ہوئی نیل بدن پر ہیں تمام — بزم دشمن میں کہ تم مجلس ماتم میں رہے
زعفران کی بھی پیالی ہو کوئی پھولوں میں — اثر خندۂ شادی مرے ماتم میں رہے
مرگ عاشق کی خبر آئی تو جھنجھلا کے کہا — روز سو مرتے ہیں کب تک کوئی ماتم میں رہے
ہنس ہی دیں وہ مرے پھولوں میں تو رونق ہی سہی — تازگی کچھ تو مری مجلس ماتم میں رہے

جلال۔ رات بھر سینے سے آئی ہے صدائے شیون — چند ارمان دل مردہ کے ماتم میں رہے
قتل پر میرے اٹھے ہاتھ جو اس کا یارب — پھر وہ کچھ کام نہ آسکے مرے ماتم میں رہے
ایڑیاں رگڑیں ہمیشہ وہ ملے پانو جلال — ہاتھ وہ پائے جو برسوں مرے ماتم میں رہے

داغ۔ مرگ دشمن کی دعا مانگ کے پچھتاتا ہوں — کہیں ایسا نہ ہو وہ غیر کے ماتم میں رہے
نغمۂ عیش سے یاد آ گئے نالے ہم کو — بزم شادی میں رہے تو بھی تو ماتم میں رہے

سب نے اچھے اچھے شعر کہے ہیں مگر امیر کا پہلا مطلع اور پانچواں ساتواں، نواں اور دسواں شعر سب سے اچھا ہے۔

امیر۔ غنچۂ گل کو چمن میں یہ ہوا ہے لے گل — عطرداں بن کے ترے گیسو پر خم میں رہے
کنگھی چوٹی میں مری جان دکھا دو وہ ادا — پھنس کے مشاطہ کا دل گیسو پر خم میں رہے
وصل کا دن ہے سنورنے کو بگڑنا کیسا — جا کے اب چین جبیں گیسو پر خم میں رہے

ل۔ یہ شعر صادق آگیا۔

میرے گھر کیا ہے شب ہجر جو روز آتی ہے یہ بلا جا کے کسی گیسو پرخم میں رہے

جلال۔ اپنے زخمی کی طرف دیکھ لیا کر او ترک ترچھے زخموں کی ادا ابرووں کے خم میں رہے

داغ۔ عقدۂ بند قبا کھول دے ظالم شب وصل یہ گرہ کاش ترے گیسو پرخم میں رہے

داغ نے بھی فکر سے خوب شعر کہا ہے مگر امیر کا تیسرا شعر بہت بے تکلف ہے۔

امیر۔ محو تصویر کی صورت یہ ترے غم میں رہے نہ رہے اتنے بھی باقی کہ خودی ہم میں رہے

شوخیوں نے کسی قاتل کی کیا ہے بسمل مر بھی جائیں تو یقیں ہے کہ تڑپ ہم میں رہے

شرم کے ساتھ ہو شوخی بھی تھیں میں کیا خوب لطف تو جب ہے کہ وہ تم میں تو یہ ہم میں رہے

اُن کے تڑپانے کی طاقت جو نہیں ہم میں نہو کاش اپنے ہی تڑپنے کی سکت ہم میں رہے

یاس اس کو بھی تو رہنے نہیں دیتی دل میں کاش امید ہی ملنے کی تری ہم میں رہے

ہم وہ ہیں زندگی کا نہ لے نام امیر آکے دو دن پسر نوح اگر ہم میں رہے

جلال۔ یہی آنکھوں کی دعا ہے کہ تری حسرت دید دل سے اکتا کے جو نکلے بھی تو پھر ہم میں رہے

یہ دعا کرتے ہیں ناصح کو سنا کر عاشق وہ بھی ہو جائے ہمیں سا جو کوئی ہم میں رہے

ہوش میں مجکو جو پاتے ہیں تو کہتے ہیں یہ شوخ جو کبھی آپ میں رہتا نہو وہ ہم میں رہے

داغ۔ چھین لیں حشر کے دن تم سے نہ حوریں مجکو ان کو حسرت ہے کہ یہ ہم کو ملے ہم میں رہے

دل میں مہمان دل آزار بہت رہتے ہیں کوئی ایسا نہیں جو دل کی طرح ہم میں رہے

جلال نے تیسرا شعر سب سے اچھا کہا ہے۔

امیر۔ دل میں عصیاں کے یہ ہے ایک نہو داخل خلد عفو کہتا ہے کہ کوئی نہ جہنم میں رہے

باتیں ناصح کی سنیں یار کے نظارے کئے آنکھیں جنت میں رہیں کان جہنم میں رہے

گریۂ ہجر میں یاد آئی جو اُن آنکھوں کی لے کے آغوش میں حوروں کو جہنم میں رہے

جلال۔ آگ میں کود پڑے ساتھ مرے سوز فراق یہ وہ ساتھی ہے جو ہمراہ جہنم میں رہے

آدم اچھے رہے جنت سے نکل کر پھر بھی ہم گلی سے ترے نکلے تو جہنم میں رہے

گل بنے داغ جگر چاہے بنے انگارا چاہے جنت میں رہے چاہے جہنم میں رہے

داغ۔ رشک نے آگ لگا دی تپش غم میں رہے بزم دشمن میں رہے ہم کہ جہنم میں رہے

مجرم عشق کو کیا حکم ہے اے داور حشر — داغ جنت میں رہے یا کہ جہنم میں رہے

اس بُرے قافیے کو امیرؔ ہی کی فکر نے اچھا کر دیا ہے۔

امیرؔ۔ باغ جنت سے اسی کی تو بدولت نکلے — کیوں نہ شق سینۂ گندم غم آدم میں رہے
روح تا چند رہے تن میں کچھ انصاف بھی ہے — قید کب تک یہ پری قالب آدم میں رہے

جلالؔ۔ اس پری رو کے ہیں مشتاق غنیمت جانیں — آدمیت ہی جو ان حضرت آدم میں رہے

داغؔ۔ واعظ ارمان کروں کیا یہ بہت مشکل ہے — آدمی بن کے کوئی جنت آدم میں رہے

امیرؔ نے گندم کے پہلے مضمون کو (گندم مجکو) کیا خوب الٹا ہے۔ اس قافیے میں بھی وہ سب سے اچھے رہے ہیں۔

امیرؔ۔ عاقبت میں ہو تو خود عیش یہاں غم میں رہے — ڈوب کر خندۂ گل گریۂ شبنم میں رہے
آکے بگڑی ہوئی اس باغ کی دیکھی جو ہوا — مشورے کوچ کے شب بھر گل و شبنم میں رہے
غیر کے رنگ میں ملتے ہیں کہیں اہل صفا — سبزۂ گل پہ سپیدی وہی شبنم میں رہے
جذب الفت جو ہوا اپنی چمن میں باندھے — ہر تجلی کی طرح دیدۂ شبنم میں رہے

جلالؔ۔ اشک بلبل وہ نہیں ہو جو چمن میں بے قدر — گر کے رہنے کی روش قطرۂ شبنم میں رہے

داغؔ۔ غیر کا غم اُسے اشکوں میں ڈبوے رکھے — جو نزاکت سے گھڑی بھر بھی نہ شبنم میں رہے
تیرے چھینٹوں سے فلک تازہ رہا کب پھول — آگ لگ جائے گل داغ جو شبنم میں رہے

تینوں استادوں نے فکر کی مگر کوئی دلنواز شعر نہ ہوا۔ پھر بھی امیرؔ کی فکر سب سے اچھی رہی ہے۔

امیرؔ۔ تو الجھتا ہے الجھنے سے اگر بالوں کے — بھیجدے مجکو یہ الجھن بھی مرے دم میں رہے
جان اس کشمکش نزع پہ صدقے ہے امیرؔ — رنگ اگر اس کی کھچاوٹ کا بھی کچھ دم میں رہے

جلالؔ۔ غم نہیں اے فلک اس کا جو نہ کچھ ہم میں رہے — جذب دل میں اثر آہوں میں کشش دم میں رہے
یار آئے تو یہ سینے سے ہمارے نکلے — کچھ وفا کا بھی چلن اکھڑے ہوئے دم میں رہے
جان کہتی تھی دغا دوں گی نہ میں دل کی طرح — کر گئی کام وہ اپنا ہم اسی دم میں رہے
یار سوجی ہوں تو صدقے تری جاں بخشی پر — لاکھ دم عاشق جانباز کے اک دم میں رہے

داغ۔ وعدۂ وصل پہ ہر اک کو لگائے رکھیے کہ زمانہ اسی دھوکے میں اسی دم میں رہے

اس قافیے میں جلال کی فکر سب سے زیادہ کامیاب رہی ہے۔

امیر۔ پاس عصمت سے یہ ہے حکم مرے ساقی کا دامن دختر رز بہ نجبر مریم میں رہے

لب جاں بخش کی ہے یاد تو مرنا کیسا موت کیونکر عمل عیسی مریم میں رہے

داغ۔ تیری اتری ہوئی مہندی جو لسے ہاتھ لگے ید بیضا کا نشاں پنجۂ مریم میں رہے

یہ قافیہ جلال کے یہاں نہیں ہے۔

امیر نے دوسرا شعر داغ سے اچھا کہا ہے۔

امیر۔ کبھی کعبے میں چلے دور کبھی جنت میں کشتی مے کبھی کوثر کبھی زمزم میں رہے

پانی جتنا تھا وہ سب پی گئے پینے والے خاک اڑانے کو ہمیں چشمۂ زمزم میں رہے

داغ۔ مجھ سے مے نوش کو پلواؤ یہ میرا ذمہ بوند پانی کی اگر کوثر و زمزم میں رہے

یہ قافیہ بھی جلال کے یہاں نہیں۔ امیر نے پہلا شعر داغ سے اچھا کہا ہے۔

امیر۔ چارہ گر مشک نہیں سودۂ الماس سہی جزو کوئی مزۂ زخم کا مرہم میں رہے

جلال۔ سرد مہری مرے داغوں کی دکھائے وہ بہار بو محبت کی نہ کافور کے مرہم میں رہے

ناخنوں کا مرے پڑ جائے کبھی صبر ایسا زخم بھر لانے کی تاثیر نہ مرہم میں رہے

امیر۔ بانکی چتون سے کنکھیوں میں کرو مجکو شکار نوک کی بات بھی کوئی نگہ کم میں رہے

جلال۔ گزری یوں اپنی شب وصل کہ جھگڑتے تا صبح دست کوتاہ میں اور حوصلہ کم میں رہے

یہ قافیے داغ کے یہاں نہیں ہیں۔

"مرہم" کا قافیہ امیر نے اور "کم" کا قافیہ جلال نے اچھا کہا ہے۔

امیر نے ایک قافیہ اور کہا ہے جو داغ اور جلال دونوں کے یہاں نہیں ہے۔

امیر۔ جمع ہیں سائل دشنام ذرا منہ کھولو ہے غضب قفل جو دروازۂ حاتم میں رہے

کچھ قافیے جلال نے وہ کہے ہیں جو امیر و داغ کے یہاں نہیں ہیں۔

جلال۔ ذکر ان پلکوں کی کاوش کا شب غم میں رہے چھیڑ اک لطف کی مجھ میں مرے ہمدم میں رہے

یا خدا خوش رہے جب تک وہ مرے غم میں رہے رو دیے ہنس ہنس کے مجھے عید محرم میں رہے

آنکھ سے بچ کے وہ آتے ہیں دل شیدا میں | پردہ منظور رہے نامحرم و محرم میں رہے
رہیے دل زلف میں کام آئے گا کیا انکے جلال | خوب سینے کو ابھارے جو وہ محرم میں رہے
شوق ہے اس کو بھری بزم میں رہنے کا اگر | دل پرغم میں رہے دیدۂ پرنم میں رہے
شب کی الجھن کا سنو ہم نفسو مجھ سے نہ حال | اُن سے پوچھو جو مرے خاطر برہم میں رہے
اس کے قابو سے نکل آئے جو قابو پا جائے | دل سے یہ چال نہ بیتابیٔ پیہم میں رہے

منشی صاحبؒ کبھی کبھی فارسی میں بھی غزل کہا کرتے تھے[لہ]۔ میں نے اپنے لڑکپن میں (غالباً ۷۳-۱۸۷۲ء) اُن کی ایک غزل سنی تھی جس کے یہ چند شعر مجھے یاد ہیں۔

کشت از نگاہ شوخ و حیا را بہانہ ساخت | خود ریخت خون خلق و حنا را بہانہ ساخت
از روئے غمزہ کرد بسویم نگاہ و کشت | ویں غمزہ دگر کہ قضا را بہانہ ساخت
یکتائیش نخواست کہ بیند نظیر خویش | آئینہ را شکست و حیا را بہانہ ساخت
زانو گزاشت شب بسر زانو رقیب | دا از اہل بزم تنگیٔ جا را بہانہ ساخت
زاہد بہ رہگزار تو در آرزوئے دید | از پا نشست و لغزش پا را بہانہ ساخت
راضی نشد بہ وصلت پروانہ ہم ز رشک | خاموش کرد شمع و ہوا را بہانہ ساخت
برداشت ہر دو دست کہ می گیرد از مغاں | زاہد مرا چو دید دعا را بہانہ ساخت
خود راز بوئے زلف بہ عالم نمود فاش | غمازی نسیم و صبا را بہانہ ساخت
زاہد بہ جلوۂ صنمے مست بود امیر | نظارۂ جمال خدا را بہانہ ساخت

لہ لطیفہ۔ منشی صاحبؒ فرماتے تھے کہ ایک بار آغا نثار نے کہا "ہندی کا فارسی شعر چھپا نہیں رہتا صاف معلوم ہو جاتا ہے"۔ اس پر بہت دیر تک بحث رہی آخر یہ قرار پایا کہ آغا صاحب سے شناخت کرائی جائے۔ دوسرے دن دو تین غزلوں میں شعرائے اہل زبان اور منشی صاحبؒ وغیرہ کے اشعار خلط ملط کر کے آغا صاحب کو وہ غزلیں دی گئیں کہ ان میں ہندی کے جو شعر ہوں اُن پر ہندی اور ایرانی کے شعروں پر ایرانی لکھ دیجئے۔ آغا صاحب نے ہندی کے اکثر شعروں پر ایرانی اور ایرانی کے شعروں پر ہندی لکھ دیا۔ جب آغا صاحب کو بتایا گیا تو بہت ہی کھوئے گئے اور ایک قہقہہ پڑا۔

نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اپنے تذکرۂ شمع انجمن کے لئے امیرؔ سے ان کا کلام طلب فرمایا تھا۔ اس کے جواب میں جو کچھ لکھا تھا نواب مغفور کے صاحبزادے نے اپنے تذکرۂ نگارستان سخن میں اس کو اس طرح لکھا ہے۔

"درمیں طبع تذکرۂ شمع انجمن حضرت والد دام مجدہم بواسطۂ جناب مولوی عبدالحق صاحب بن مولوی فضل حق صاحب خیرآبادی اشعار جناب امیر را از رام پور خواستگار شدند۔ بیاسخش منشی صاحب معزز دسہ غزل خویش کہ غزال وادی بلاغت وطاؤس چمن فصاحت اند معرفت جناب موصوف لطف نمودند و نوشتند کہ۔ ملازمان سامی مے دانند کہ فقیر را اگاہے اتفاق نظم فارسی نمی شود۔ سابقاً برخوردار حافظ علی سلمہ خواہرزادۂ من کہ در بھوپال وابستۂ دامن دولت سرکار و ملازم آنجا اند برائے فرستادن اشعار فارسی زبان بمن تحریر کردہ بودند معذور ماندم و نہ فرصت فکر بدست آمد کہ مے چاودیدم۔ اکنون کہ آن مکرم ایما فرمودند عزیزاز جان شیخ فصیح الزماں اشعارے چندکہ از من بدنام یادگار داشتند نگاشتہ آوردند آنرا بخدمت ہمی فرستم روانہ فرمایند۔ منکہ ننگ بزم سخنم "تالیف من چہ مایۂ آں دارد کہ بزبان خامہ و خامۂ زبان ہجو والاپایہ عالیجاہ فلک بارگاہ نواب والاجاہ امیرالملک بہادر بگزرد و آثارم از آفتاب مشہور ترشود۔ فاماتابش نیراعظم بذرۂ خاک عجب ندارد"۔ (نگارستان سخن)۔

رفتہ رفتہ فارسی غزلیں بہت سی جمع ہو گئیں۔

فداؔ مرحوم بیان کرتے تھے کہ ایک بار منشی صاحبؒ بیمار ہوئے۔ اس بیماری میں دو مہینے تک سرکار میں حاضری معاف رہی اس فرصت کو منشی صاحبؒ نے غنیمت جان کر اپنا فارسی دیوان پورا کرلیا۔ اسیرؔ مرحوم اور عزیز احباب عیادت کو جاتے تو آپ ان کو اپنی تازہ فارسی غزلیں سناتے۔ اسیرؔ مرحوم نے دو ایک بار کہا بھی کہ ہم تمھاری مزاج پرسی کو آتے ہیں یا تمھارا کلام سننے کو؟ بیماری میں دل ودماغ کو اور آرام دینا چاہیئے نہ کہ فکر سخن کرنا۔ آپ نے کہا یہ ارشاد بجا ہے مگر کیا کروں پڑے پڑے جی گھبراتا ہے تو کچھ شعر ہی کہتا رہتا ہوں شاید فارسی دیوان پورا ہو جائے۔

یہ مرتب اور صاف شدہ دیوان میں نے خود بار بار دیکھا ہے مگر افسوس ہے کہ اب تک

چھپوایا نہیں گیا اور اب تو اس کے طبع ہونے سے بالکل مایوسی نظر آتی ہے۔
یہ دو چار غزلیں اور کچھ شعر بہت کوشش کرنے سے مجکو مل سکے جو نذر ناظرین ہیں۔

مائیم و حشر و رحمت پروردگار ما — دیگر ہر آنچہ ہست نیاید بکار ما
از بسکہ بیخود است دل بے قرار ما — معشوق می کشد ہمہ شب انتظار ما
دل بردو داد بہتر ازاں گلعذار ما — جائے دل است داغ دل اندر کنار ما
چوں غنچۂ کہ نشگفد و از چمن برند — نذر تبسمے شدہ عمر بہار ما
صد سال گل بردید و خوں گردد و چکد — یک نالہ بر کشد بہ چمن گر ہزار ما
زانگہ کہ دیدہ ایم ترا با تو بودہ ایم — در دل توئی و دل بود اندر کنار ما

میرد بذوق مرگ ز افسردگی امیر
بو کردہ است ہر کہ گلے از مزار ما

از یاس ہم گرہ نکشاید ز کار ما — دیگر کجا رود دل امیدوار ما
در جلوہ گاہ کیست دل بے قرار ما — صد برق طور می تپد اندر کنار ما
در خاک ہم ہنوز اثر نشۂ کسے است — مستانہ خیزد از سر کویش غبار ما
حیرت ازاں خوش است بعبرت سرائے دہر — کز بستن مژہ گرہ افتد بکار ما
ہستی ماست از دو طرف نیستی نصیب — غلطد بروے خاک چو دریا کنار ما
برخاست تا ز کوے تو از لامکاں گزشت — در خاکدان دہر نباشد غبار ما
افسردگی ماست ہماں در شب وصال — رنگ از رخ خزاں نہ پرد در بہار ما

داریم آب دانۂ خود در گرہ امیر
بر دوش خویش ہمچو گہر ہست بار ما

غماز راز گلشن می سازد آشکارا — در غنچہ بند سازم چوں بوے گل صبارا
او مست جام حسن و من مست ساغر عشق — دعوی ہمسری ہاست با شاہ ایں گدارا
آئینہ ایست ممکن بہر جمال واجب — از بہر خود نمائی پیدا نمود مارا
در مشرب محبت از اشک آبرو نیست — خون دل است غازہ رخسار مدعارا

درچشم چون نظرها درشوق جلوهٔ او | درخانه ایم واز خود خالی کنیم جا را
چندان تلاطم عشق اعضاے ما شکسته است | چون موج وقت رفتن برسر نهیم پا را
گر دید جسم وجانم یوسف بعشق یوسف | باور اگر نداری بو کن لباس ما را

گل چیدن ار نخواهی کن اے امیر پیشه
با عندلیب یاری با باغبان مدارا

گل نه تنها چاک تا دامن گریبان کرد ورفت | لاله هم زین باغ خون خود بداماں کرد ورفت
بعد عمرے دوش اندر سینه ام پیکان یار | آمد ولختے نشست وخون ارماں کرد ورفت
گل چرا افسرده تر مرد از من اے گلچیں مپرس | منفعل شد ز آمدن سر در گریباں کرد ورفت
خواب اندر چشم باشد یا درون دل خیال | هر که آمد اندکے ما را پریشاں کرد ورفت
نوجوانی فرصت بوس وکنار اذنداشت | یک نظر سیر رخ وگیسوے جاناں کرد ورفت
یک نگاه گرم لیلے در بیابان جنوں | خاک مجنوں سرمهٔ چشم غزالاں کرد ورفت
عشق تا آمد به دل دل گم شد از پهلوے ما | میزباں این تازه شوخیها به مهماں کرد ورفت
از سر هر موے من ذوق تپیدن جوش زد | آن نگه با هر رگ من کار مژگاں کرد ورفت
آید از هر گور در گور غریباں این صدا | آه عمر رفته ما را اندر زنداں کرد ورفت

سر برون آورد سنبل از ته خاک وا امیر
دید رنگ باغ وموے خود پریشاں کرد ورفت

ناصح بدل هزار نصیحت نمود ودل | آهسته گفت هائے بت نازنیں وشوخ
دمے که وحدت طاعت آرزو میکرد | حرم بنود وسرم سجده چارسوے کرد
هنوز حسن پس پرده بود ووحشت من | گل وجود مرا مے سرشت وبوے کرد
نماز قاتلم البته می شدے مقبول | بخون تازهٔ بسمل اگر وضوی کرد
مزاج حسن تو گر تاب همسری می داشت | سکندر از بغل آئینه دو برو می کرد
گزشتی از طرف باغ وباغ از حسرت | ز چشم فتنه تماشائے رنگ وبو می کرد
اگر عنایت ساقی بُدے بحال امیر | ز جام باز چرا باده در سبوے کرد

عجب مدار اگر صوفیان چنیں مستند | بکنہ خویش رسیدند و از خودی رستند
زتیر آہ کہ خست است سینۂ افلاک | کہ بر شکستن دلہا چنیں کمر بستند
بذوق کعبہ دویدیم در رہ غلط کردیم | گزر بہ بتکدہ افتاد و در فرو بستند
گریز نیست ز پیوند عاشقانت را | اگر ز خویش گسستند با تو پیوستند
زبہر آں کہ بیاران رفتگاں نرسیم | درِ حریم فنا ہم بروے ما بستند
دفا مخواہ دلا از بتان مست شباب | ہزار پند کنی نشنوند تا مستند

درین بلاکدہ از درد و غم مترس امیر
کدام دل کہ ز سنگ بلاش نشکستند

شاہد حسن نیازم چو شود ناز فروش | سجدہ قصد بدر یار رود سر من بردوش
قطرہ آبے زدم تیغ بمن ہم قاتل | تشنہ میرم بلب ساحل و دریاست بجوش
منم آں کشتۂ نازے کہ اگر روئے کنم | حور عین از در فردوس کشاید آغوش
تاب دیدار تو آئینہ ندارد اے دوست | تو بخود جلوہ کن اینجا نہ دماغیست نہ ہوش
عاشق از مست شد از جلوۂ خود طعنہ مزن | دارد آویزۂ آوازۂ حسنت در گوش
ہوش در میکدۂ عشق نباشد چیزے | نیمے از جرعۂ مے گر بدہندت بفروش
عشق چوں حسن نماید بنگاہ معشوق | خویشتن را بخیال تو کشم در آغوش
مدد اے ہمت مردانہ نیفتم از پائے | یک کف خاکم و غمہائے دو عالم بردوش
چرخ عمریست کہ مینائے مرا بر سر سنگ | میزند صد رہ و ہر بار بگوید کہ خموش
برشگال است و دہد جام بدستم ساقی | برق گوید کہ بگیر ابر بگوید کہ بنوش
گر تو خواہی کہ شوی محرم اسرار ازل | ساغر از پیر مغاں گیر و برو از سر ہوش

مستی دیر ہم از کعبہ بود دست امیر
برہمن بادہ کش و شیخ حرم بادہ فروش

داد در دست اجل ہجر تو ام در محفل | بود گوئی زدو صف تیغ دو پیکر محفل
در جہاں رنج یکے باعث عیش دگر است | خون دارا شد و آراست سکندر محفل

پردهٔ شمع اثر عشق چناں سوخت کہ شمع — گریہ اندر غم پروانہ سر ہر محفل
میکش نرگس مخمور تو بر خاک انداخت — جام گل در چمن و ساغر گل در محفل
پاے در سلسلۂ اشک و بسر داغ جنوں — شمع سوزاں منم و دہر سراسر محفل
بود ہر چند تجلی کدہ از شمع و چراغ — یافت نور دگر از شیشہ و ساغر محفل
ہیچ کس را بر تو نیست نگاہے بہ دگر — ہم کنار است بہ ہنگامۂ محشر محفل
جاں ربودند و دل و تن ہمہ داغ است ہنوز — شمع بردند و ہنوز است منور محفل

اندریں تیرہ سرا سینۂ پرسوز امیر
ہمچو شمعے است کہ سوزد ہمہ شب در محفل

جاں بلب آمدہ از شدت بیماریٔ دل — ہمدم امروز تمام است پرستاریٔ دل

بلبلے نالہ کناں گرد گلے می گردید
گفتمش چیست غمت گفت گرفتاریٔ دل

شب وصلے کہ بود امشب کہ من از خویشتن رفتم — بدیں شوخی کہ آید در کنار من کہ من رفتم
ہزاراں داغ بر دل خوردم و زیں انجمن رفتم — چمن گل کردم از آغوش و بیروں از چمن رفتم
تلون ہاے او بحریست موجے می زند غافل — تو پنداری کہ دیروز آمدم امروز من رفتم
سراپا داغم اندر جلوہ گاہ او نمی دانم — چمن آمد درون من کہ من اندر چمن رفتم
بدور چشم او مے خواستن ترک ادب باشد — نہادم سر بپاے ساقی و از خویشتن رفتم
تو چوں خورشید و من چوں سایہ ممکن نیست وصل تو — کہ من از رفتن تو آمدم و ز آمدن رفتم
سبک روحی من بار خجالت برنمی تابد — پرید از روے من تا رنگ بیروں از چمن رفتم
نباشد ہمچو شمعم امتیازے در غم و شادی — بہر بزمے کہ رفتم در ہواے سوختن رفتم
مجال جنبشم کو از دو نور ناتوانیہا — بدوش بیخودی رفتم اگر از خویشتن رفتم
چہ دور است اینکہ چوں از فکر مضمونے ہمی خواہم — سخن گوید کہ من با قدر دانان سخن رفتم
خیال عصمت آں پاک دامن آنچناں دارم — کہ با رخت کفن من پیرہن در پیرہن رفتم
امیر از سوز عشق من دل دیگر نمی سوزد — شرار کاغذم بر جان خود آتش فگن رفتم

سر بپائے تو نہم نیست سرے بہتر ازین — روم از خویش نباشد سفرے بہتر ازین
خنجر ناز نیابد جگرے بہتر ازین — اے بقربان تو ظالم نظرے بہتر ازیں
یار سرمست و ہوا سرد و مے ناب بجوش — ساقیا باز نیابی سحرے بہتر ازیں
ہرچہ از بسمل تو روز جزا پرسیدند — او ہماں گفت کہ زخم دگرے بہتر ازیں
مے برد دل بہ ادائے کہ ندانند کہ برد — غمزہ اش یاد ندارد ہنرے بہتر ازیں
ہمرہ ناوکش از سینہ بروں واے دل — نیست در راہ سفر ہمسفرے بہتر ازیں
بر در دل بنشیں پائے منہ بر در کس — دولت ار مے طلبی نیست درے بہتر ازیں
در چمن رفتی و ہر گل بگل دیگر گفت — کہ ندیدم گل نازک کمرے بہتر ازیں
نگہے کردی و دل بردی و جانم باقیست — جان من گرد تو گردم نظرے بہتر ازیں
بوسہ دادی و لب خویش مکیدی از ناز — اے شکر لب بہ ادائے دگرے بہتر ازیں

بیخودی برد بسر منزل مقصود امیر
نیست در راہ جنوں راہبرے بہتر ازیں

جوش دل است مژدہ رسان لقائے تو — اشکے کہ می چکد دہد آواز پائے تو
مشتاق جلوہ خلق دود در قفائے تو — شور قیامت است کہ بانگ درائے تو
از خود تہی شویم چناں در ہوائے تو — گیریم در کنار ترا چوں قبائے تو
مردن بہ عشق تست بہ از زندگی مرا — مرگ ست زندگی چو نمیرم برائے تو
سر از تو سینہ از تو دل و جاں ہمہ ز تو — از من چہ بودہ است کہ سازم فدائے تو
یک جلوہ ساختی و ہجوم نگاہ شوق — صد پردہ بست بر در دولت سرائے تو
دارد جنون عشق بلاخیز عالمے — خلقے ست در قفائے من و من قفائے تو
صد گونہ التفات بہ نا آشنا کنی — بیچارہ آں دلے کہ بود آشنائے تو
در روز حشر پردہ نیفتد ز روئے خلق — رسوائی کسے نہ پسندد حیائے تو
نیمے نگہ بہائے من و جان من بس است — صد جان و صد جہاں نسزد در بہائے تو
سر بر زنم بہ سنگ کہ سنگے زنم بسر — آید ہماں بگوش من آواز پائے تو

برذرہ ہم چو ماہ بود التفات مہر — ظرف وسیع و تنگ نہ بیند عطائے تو
زاہد بیا مصالحہ کن تا کجا نزاع — میخانہ جائے من بود و خلد جائے تو

یارب بہ بخش جرم و مپرس از امیر ہیچ
سرزد خطا از و بہ امید عطائے تو

قصاید

منشی صاحبؒ نے قصیدے بھی بہت سے کہے۔ جن میں سے پانچ نعت و منقبت میں (محامد خاتم النبیین میں) اور سات قصیدے مدح نواب خلد آشیاں میں (مرآۃ الغیب میں) چھپ چکے ہیں۔ باقی اور بہت سے قصیدے غیر مطبوعہ ہیں (اب وہ کیا چھپیں گے!)

حضرت امیرؒ کی قادر الکلامی اور سخن سرائی کے کمالات تنگنائے غزل میں تو آپ دیکھ چکے اب ان کی فکر فلک پیما کے اعجاز قصاید میں ملاحظہ ہوں۔ اس صنف شاعری میں طبع آزمائی ہر شاعر کا کام نہیں اور یہیں شاعر کے درجۂ کمال کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

حضرت امیرؒ کا ہر قصیدہ ایک عجیب شان اور نئی آن بان رکھتا ہے۔ ایک رنگین بیانی و مضمون آفرینی کا نادر نمونہ ہے تو دوسرا معنی آرائی اور معجز کلامی کا آئینہ۔ بعض قصیدے بہت مشکل اور پامال زمینوں میں ہیں جن سے امیرؒ کی قوت گویائی کا اندازہ ہوتا اور قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ صنائع و بدائع، شکوہ الفاظ، مضمون آفرینی، ندرت تشبیہات، زور بیان وغیرہ جو قصیدے کے خصوصیات ہیں ان سے ان کے تمام قصاید مالا مال ہیں اور لطف یہ ہے کہ اس کے باوجود فصاحت بیان اور لطافت زبان ہاتھ سے نہیں جانے دی ہے۔ یہ قدرت اور کمال امیرؒ ہی کا حصہ ہے۔ تشبیب میں بھی جو قصیدے کی جان ہوتی ہے بہت زور اور ایک خاص شان نظر آتی ہے۔ کئی قصیدوں میں تشبیب کی نئی نئی راہیں نکال کر اس کو نہایت ہی لطیف اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ گریز میں مضمون کا تسلسل ٹوٹنے نہیں پایا ہے۔ غرض اس صنف شاعری میں بھی شوکت الفاظ، اعلےٰ مضامین اور نازک خیالی کے ساتھ ساتھ بندش کی چستی اور زبان کی سلاست، محاورات کی بارش اور روانی سے اردو شعرا میں ان کا مرتبہ بہت ممتاز اور برتر نظر آتا ہے۔

جا سکتے ہیں کب اڑ کے کہیں مرغ مضامین
وابستۂ فتراک ہیں سب صورت نخچیر

دل صاف زباں صاف سخن صاف ہے میرا
موتی کی لڑی ہے کہ مسلسل مری تقریر

دیتے ہیں مزہ قدر شناسان سخن کو
یہ لفظ یہ معنی جو ہیں مثل شکر و شیر

ہو صاحب معنی تو معانی مرے سمجھے
ہو صاحب توقیر تو جانے مری توقیر

کہتا ہوں وہ سنتا ہوں جو استاد ازل سے
ہوں صورت طوطی پس آئینۂ تقدیر

یہ شاعرانہ تعلی اور مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

نعت میں

تفکر امتیاز جان و جاناں میں کیا حد کا
عروض اب تک نہ آیا ہاتھ اس بیت معقد کا

نفخت فیہ من روحی کے معنی سے ہوا ثابت
خزانہ ہے محیط اس چشمۂ روح مجرد کا

گیا شبہہ سمجھ میں آ یہ حبل الورید آیا
رگ گردن مقام خاص ہے محبوب سرمد کا

سمٹنا تھا بھنور کا جو وہی تھا موج کا بڑھنا
کھلیں آنکھیں تو عالم ایک دیکھا جزر کا مد کا

سوا حیرت کے کیا ہے فکرت کنہ حقیقت میں
یہ وہ گھر ہے کہ جس میں بند دروازہ ہے مقصد کا

نہ بن ناداں نہ کر کچھ فکر آخر کچھ نہ ٹھہرے گا
خرد ہے گیند اس کی ذات میں عالم ہے گنبد کا

لحاظ ضبط معنی چاہیے مشتاق معنی کو
جدا کرنا ہے بے جا لفظ میں حرف مشدد کا

نہ کیوں سوے مقدم ہو رجوع دل موخر کی
کہ مرکز ہے ہر اک مسند الیہ اسناد مسند کا

صفائے قلب حاصل کر وہ کسب زہد و تقویٰ سے
کہ عالم پیکر خاکی میں ہو روح مجرد کا

نہ آ ہرگز زیب محفل آرایان نخوت میں
کہ گاؤ سامری ہے گاؤ تکیہ ان کی مسند کا

بچھائیں فرش کی جا ٹسر کا یہ پوست کھنچوا کر
خیال آئے جو بالش کا تو سر منگوائیں سرمد کا

وہ ہیں مقبول حق جو نا قبول اہل عالم ہیں
ملا ہے منزل مقصود سے جادہ خط رد کا

مطلع

الف آدم میں ہے مد دو احمد میں ہے بے مد کا
سبب یہ ہے کہ واں سایہ تھا یاں سایہ نہ تھا قد کا

مطلع

بلاؤں سے بچے جو نام لے دل سے محمد کا
اثر میم مشدد میں ہے ذو القرنین کی سد کا

جو آنکھیں ہوں تو نام پاک سے پیدا ہے یکتائی
کہ آغوش احد میں جلوہ گر ہے میم احمد کا

زہے خاطر جو دنیا سے بلایا حق نے پاس اپنے
رواں ہمراہ قاصد کے کیا ہدیہ خوشامد کا

دوئی کیسی کہاں ثانی کہ یہ دونوں ہیں لاثانی
خدا کا دوسرا کوئی نہ سایا آپؐ کے قد کا

ہوے ہیں جمع امکان و قدم ذات مقدس میں
محمدؐ میں یہی مطلب تو ہے میم مشدد کا

خدا کے نور کے ہمراہ نور مصطفےٰؐ دیکھا
مزہ موسےٰؑ سے پوچھا چاہیے تکرار ابجد کا

شکم پر سنگ اسود اور فاقے سے شکم خالی
ہوا ثابت کہ کعبہ بھی مقلد ہے محمدؐ کا

دکھائی قوت بازو کمان قرب یوں کھینچی
کہ عالم دونوں گوشوں پر ہوا حرف مشدد کا

کہا جو کچھ کہ کہنا تھا سنا جو کچھ کہ سننا تھا
وہی قایل وہی سامع سماں آواز گنبد کا

نعت

خضر کی طرح یہ طاعت کو ملی عمر دراز
کہ قضا ہو نہیں سکتی ہے مصلی کی نماز

حکم اس کا ہو تو شل بگہ چشم ابھی
آئے پھر منہ کی طرف منہ سے نکل کر آواز

مدح روضۂ انور

در و دیوار سے اس گھر میں برستا ہے یہ نور
ہو روا شرع میں شب کو جو پڑھیں دن کی نماز

دل محمود لیے قبر سے آتا ہے یہاں
بہر جاروب کشی سلسلۂ زلف ایاز

در مدح نواب خلد آشیاں

مناظرہ شانہ و آئینہ

مژدہ اے اہل تماشا کہ ہے ہنگام نظر
بزم عشرت میں ہوئے جمع حسیں رشک قمر

صرف آرائش زینت ہیں حسینان جہاں
بدلے جاتے ہیں لباس اور مرصع زیور

شانہ ہوتا ہے طلب آئنہ آتا ہے حضور
بنتے ہیں گیسو و رخ کرتے ہیں جو بن پہ نظر

شانہ و آئنہ ہیں بسکہ مصاحب دونوں
ایک سے ایک نے باندھی ہے رقابت پہ کمر

آئنہ شانے سے کہتا ہے کہ سر چڑھ نہ بہت
منہ کی کھائے نہ کہیں چاک نہ تیرا ہو جگر

دیکھ مجکو کہ جگہ گو کہ ہے زانو پہ مری
حیرت حسن سے مہرے کی طرح ہوں ششدر

مرتبہ جو ہے مرا تجکو وہ حاصل ہے کہاں صاف طینت ہوں صفائی کا ہے مجھ میں جوہر
کون سی بزم میں ہوتی نہیں حاجت میری خانہ بر دوش ہوں پر دل میرا بیسر دکی ہے گھر
یُمن ہے اہل جہاں کو مرا نظارۂ رخ دیکھتے ہیں مجھے جب دیکھتے ہیں ماہ صفر
صافی قلب سے پایا ہے یہ رتبہ میں نے چاندی سونے کا دیا ہے مجھے اللہ نے گھر
نہیں رکھتا ہوں لگی حال بد و نیک میں کچھ صاف کہدیتا ہوں آتا ہے جو کچھ پیش نظر
ہاتھ سے دامن دولت نہ کسی دم چھوٹا اہل دولت ہی کے زانو پہ ہوئی عمر بسر
اہل تنجیم کی آنکھوں میں بھی ہے قدر مری ہوں کبھی مشتری و زہرہ کبھی شمس و قمر
بولتا ہے مری تائید سے طوطی اس کا ورنہ طوطی میں کہاں ہے کوئی سرخاب کا پر
خاکساری ہے ان اوصاف پہ مجھ میں ایسی غازۂ چہرہ نہیں اور بجز خاکستر
ایک تو ہے کہ نہیں تجھ میں ذرا نام کو نور زحل آسا ترے طالع کا سیہ ہے اختر
پارۂ چوب، جگر چاک، دنی، بے قیمت چار پیسے کو جسے مول نہ لیں اہل ہنر
بال بیکا ہو حسینوں کا تو توڑیں ترے دانت دانت دینے لگیں ایذا تو شکستہ بہتر
پنجۂ شل سے نکلتا نہیں ہرگز کوئی کام خشک ہو شاخ تو اس سے نہیں امید ثمر
بال یوں منہ میں ترے ٹوٹ کے رہ جاتا ہے جس طرح شانۂ ضحاک میں تھا سانپ کا گھر
کرکری تیزی دنداں سے ہوئی اور تری جس میں دندانے پڑیں تیغ ہے وہ بے جوہر
کشمکش نے تری کانٹوں میں گھسیٹا ہے تجھے پہلوؤں میں ہیں ترے خار اِدھر اور اُدھر
سو زبانیں ہیں ترے منہ میں تو حاصل کیا ہے گنگ کی طرح سے خاموش ہے تو آٹھ پہر
اس لیاقت پہ یہ دعوے تجھے کیا مال ہے تو کہ چڑھے لالہ رخان سمن اندام کے سر
صاف صاف آئینے نے بڑھ کے کیا جب کلام غیر کے عیب سب اظہار کیے اپنے ہنر
کھپ گیا شانہ ملامت کا نشانہ ہو کر موے تن راست ہوے تیر کی صورت یکسر
ہمہ تن ہو کے زباں کہنے لگا یوں سر دست منہ بنا چاہیے عاقل کو تعلی سے حذر
رتبہ میرا تجھے معلوم نہیں سن مجھ سے منحصر ہے صفت عقدہ کشائی مجھ پر
ہے حسینوں میں رسائی تری گاہے گاہے کوچۂ زلف میں میری ہے جگہ آٹھ پہر

رات دن خندۂ شادی سے عیاں ہیں گُرے دانت — اپنی تقدیر کو روتا ہے تری آنکھ ہے تر
میری ہی شکل سے مقبول دل عالم ہے — پنجہ مرجاں کا ہو یا پنجۂ خورشید سحر
کی ہے تشدید نے پیدا جو شباہت میری — لفظ اللہ میں شامل ہے وہ کر خوب نظر
صاحب ریش نہ جب تک کہ کرے شانہ کشی — ہو نہ حاصل شرف پیروی پیغمبر
اس میں بھی لفظ ہے شانے کا یہ عزّ و شرف — جل شانہ جو ہے توصیف خدائے اکبر
سوچ تو دل میں ذرا عیب ہیں تجھ میں کتنے — سادہ و شوخ و دریدہ دہن و بدگوہر
روبرو اور ترا حال ہے غیبت میں کچھ اور — صاف عالم کی دورنگی کا ہے تجھ میں بھی اثر
چشمۂ آب تو ظاہر میں ہے باطن میں سراب — دھو کے پیاسوں کو دیا کرتا ہے تو شام و سحر
خودنمائی کے سوا تجھ میں نہیں کوئی صفت — سادہ لوحی کے سوا اُس میں نہیں کوئی ہنر
نہ جچے پر نہ جچے شکل جو ہو ذہن نشیں — نہ مٹے پر نہ مٹے بال پڑے دل میں اگر
قصہ کوتاہ زیادہ ہوئی دونوں میں جو بحث — تھے جو اُن دونوں کے حامی انھیں پہنچی یہ خبر
آئنے کا تو رخ صاف طرفدار ہوا — باندھ لی زلف نے شانے کی حمایت پہ کمر
لشکر روز تو زیر علم خسرو رخ — فوج شب بادشہ گیسو پرچیں کی سپر
اک طرف ماہ ہوا ایک طرف پرتو مہر — اک طرف شام ہوئی ایک طرف نور سحر
یہ سنبل و شب بو طرف زلف سیاہ — لشکر لالہ و گل جانب روئے انور
پیر گردوں نے کہا طرفہ قیامت آئی — اب کوئی آن میں ہوتا ہے جہاں زیر و زبر
بیچ میں پڑ کے کہا خوب نہیں ہے یہ فساد — صلح اس جنگ سے ہر ایک طرح ہے بہتر
حق میں دونوں کے یہ اولیٰ ہے کہ پاس اُس کے چلو — صاحب حکم جو ہے اور عدالت گستر
کون وہ کلب علی خان بہادر نامی — منبع جود و سخا زیب دہ علم و ہنر

در مدح نواب سیّد محمد حامد علی خاں

بالقابہ

کارزار بہار و خزاں

سلطان شرق نے جو بصد عزّ و افتخار — برج حمل کو آکے کیا تخت زرنگار

پہنچے خط شعاع کہ سب مستعد رہیں
جتنے قوائے نامیہ کے ہیں رسالدار

دربار گرم تھا کہ خبر دی یہ ناگہاں
ہرکارے نے صبا کے کہ اے شاہ نامدار

غارتگر خزاں نے کیا ملک کو خراب
اڑتی ہے خاک شہر میں ویران ہے دیار

جمعیت کثیر سے آیا ہے لوٹنے
دیکھو جدھر علم ہیں بگولوں کے آشکار

اتنی سپاہ ہے کہ نہیں انتہا کہیں
ذرات کے پیادے ہیں خاشاک کے سوار

افسر ہیں فوج میمنہ و میسرہ کے دو
اس کا سموم نام ہے اس کا لقب غبار

اوراق خشک نوبت و نقارہ کی جگہ
گویا ہوا کے گھوڑے پہ ہیں نوبتی سوار

کالی ہیں ردیاں کہیں خاکی ہیں وردیاں
اک زاغ کا گروہ ہے اک بوم کی قطار

آندھی کا اس کے ساتھ ہے اک خیمۂ سیاہ
صرصر رسن ستون شجر خشک و خار دار

یہ سن کے غیظ خسرو خاور کو آگیا
زماں ہوا کہ جمع ہو سب لشکر بہار

گولے ڈھلیں تگرگ کے کہہ دو سحاب سے
توپیں ہوں برق و رعد کی سر وقت کارزار

پھولوں کی پلٹنوں کو ملیں سرخ وردیاں
پہنیں لباس سبز سواران شاخسار

موجوں کے ہر طرف سے زرہ پوش آئیں جلد
ترکش سجیں بدن پہ دلیران آبشار

نامی جو ہیں سپاہ میں وہ انتخاب ہوں
لشکر کے افسروں کا الگ چاہیے شمار

شمشیر خان بید سرافراز خان سرو
آزاد بیگ سوسن و میر آتش چنار

خیرات بیگ خیری و گل بیگ جعفری
آقا بداغ لالہ حسن خان کوکنار

شاداب بیگ سبزہ صفا بیگ نسترن
خواجہ ملیح زنبق و خواجہ بزرگ نار

صد برگ کی زرہ ہو تو سنبل کی ہو کمند
گل کی سپر ہو شاخ کی شمشیر آبدار

بیحد بٹیں سپاہ میں غنچوں کی پیچکیں
سورج مکھی کے خود ہوں تقسیم بے شمار

چار آئینے سہ برگی کے تن پر کریں درست
کیلوں کے نیزے پائیں جوانان نیزہ دار

اس فوج کے سوا بھی کچھ آئے کمک کو فوج
سو ایک سمت سے تو کسی سمت سے ہزار

شاہین و باز و جرہ کلنگ و خروس و بط
کبک و تدرو و فاختہ و طوطی و ہزار

قازوں کا اک گروہ عقابوں کی ایک صف
ٹکڑی ہو کوئلوں کی پپیہوں کی بھی قطار

زمان شاہ شرق سے پھر بعد جایزہ — لشکر ہوا روانہ پے قصد کارزار
گھوڑے ہوا کے جھونکوں لکوں کے فیل مست — لاکھوں گل پیادہ ہزاروں گل سوار
فوج خزاں اُدھر تھی جمائے ہوئے پرے — آمادہ ہر گروہ ہر اک صف ہر اک قطار
آنکھوں پہ ایسے پڑ گئے پردے غرور کے — ذروں کی فوج لے کے بڑھا افسر غبار
سوجھا نہ کچھ کسی کو زمانہ ہوا سیاہ — آندھی کی طرح چھا گئی وہ فوج نابکار
ایسے ہوئے بلند علم گردباد کے — چکر میں آ گئی خرد چرخ کج مدار
فوج بہار نے بھی کیا قصد کشت و خون — جنبش ہوئی بڑھے علم سرو جویبار
لکوں کے احدیوں نے اٹھائے جو بادپا — ترکانہ ترک و تاز سے محشر تھا آشکار
توپیں ہزارہا جو چلیں رعد و برق کی — تھا زلزلہ زمیں کو ہوے کوہ رعشہ دار
سر اڑ گئے جدھر گئے گولے تگرگ کے — قطروں کی گولیاں ہوئیں ان کے جگر کے پار
پھولوں کے سرخ پوشوں نے ایسی لگائی آگ — جل جل کے خاک ہو گئے وہ تیرہ روزگار
غربال چھن کے ہو گئے اُن ناکسوں کے تن — غنچوں کے گلچلوں نے یہ دی گولیوں کی مار
جو جھاڑیاں تھیں جھاڑ کے مانند جل اٹھیں — اوراق خشک جل کے بنے پھلجھڑی انار
اس فوج میں سیہ جو بگولوں کے تھے علم — طاؤس سب نگل گئے ان کو سمجھ کے مار
گرجا جو ابر فتح کا نقارہ بج گیا — تھا شادیانہ زمزمۂ قمری و ہزار
سامان بزم ہو گیا میدان رزم میں — کیا کیا مے طرب کے چلے جام خوشگوار
فرش زمردیں جو بچھا سبزہ زار میں — مسند لگائی لالہ و ریحاں نے بوٹے دار
مطرب تھی عندلیب تو قوال فاختہ — طاؤس رقص کرتے تھے محفل میں بار بار
غنچے سبو تھے لالہ و گل ساغر شراب — مینائے سبز فام ہر اک سرو جویبار
شبنم نے پائے گوہر غلطاں گلوں نے زر — جاری ہوا یہ فیض سے ابر نوبہار
دکھایہ[1] رنگ میں نے پہنچ کر جو باغ میں — اور پوچھی وجہ جشن تو یہ بول اٹھی ہزار
یہ جشن اس کی فتح کا ہے جو سپاہ ہے — زیر لوائے حضرت نواب نامدار

[1] تشبیب کے اشعار میں نے کم لکھے ہیں۔

حامد علی خان بہا در فلک شکوہ زیبا ہے جس کی شان میں مطلع یہ آبدار
اے شان حیدری ز جبین تو آشکار
نام تو در نبرد کند کار ذوالفقار

صفت معشوق خیالی

پتلیاں آنکھوں کی در پردہ اشاروں سے کہیں ناچنے ہی کو جو نکلے تو کہاں کا گھونگھٹ
جلوہ گرم دم چشم وصف مژگاں سے صاف جو بیٹھی ہے در خلد پہ کھولے ہوئے پٹ
رحم دکھلائے جو منہ در سے پھر جائے نگاہ شرم آ جائے تو آنکھیں کہیں چل دور ہو ہٹ
مستی حسن سے گردن میں کبھی ڈال دے ہاتھ بے چھوئے گاہ لجالو کی طرح جائے سمٹ
طاق کاکل وہ پھبکتی ہیں کہ سر کی کوئی چوٹ روک لے مڑ کے تو وہ جھک کے لگائے پالٹ
ہاتھ چھو جائے جو گیسو کو تو کھائے یوں پیچ جس طرح کاٹ کے کالا کوئی جاتا ہے پلٹ
دیکھ کر ابرو پیوستہ یہ ہوتا تھا گماں پہلواں دو ہیں کہ کشتی میں ہوئے ہیں غٹ پٹ

ہائے رے ناز لچکتی تھی نزاکت سے کمر پھر جو کاندھے سے دوپٹے کا ڈھلا تھا آنچل

صفت بہار

طوبے سے جا کے خلد میں پیوند ہو گئی ایسی بڑھی ہر ایک گل دیاسمن کی شاخ
اللہ رے بہار کہ رنگت میں بڑھ گئی مرجاں کی شاخ سے بھی غزال ختن کی شاخ

دست مژگاں سے سنبھالے تھیں نگہ کو آنکھیں پھر بھی دیوار پہ جب چڑھتی تھی جاتی تھی پھسل
اور شاخوں کا تو کیا ذکر یہ ہے فیض نمو نکلے گر بات میں بھی شاخ تو پھوٹے کونپل
آ گیا گل کی صفائی کا جو بلبل کو خیال سر بھی بیضے سے نہ نکلا کہ گیا پانو پھسل
چمن دل میں جو عارف کے چلے واں کی نسیم گل صد برگ بنے غنچۂ اسرار ازل

مدح ممدوح

تب بنی اس سے تری خاک قدم کی اکسیر چرخ نے ماہ کو شق کر کے کیا جب سمپٹ

سکۂ شمس و قمر میں جو کہیں نام نہیں — کر دیا کیا تری چٹکی نے مسل کر سلیٹ
چین آتا نہیں جب تک کہ عروس دولت — دیکھ لیتی نہیں یہ چہرہ اٹھا کر گھونگھٹ

دستار فرق شیر پہ از فرط ربط سے — کلگی کی جا ہے طرہ غزال ختن کی شاخ
انگشتری اگر کبھی پہنے عدوے زشت — پھبتی لگائے نخل عقیق یمن کی شاخ

آسماں بھر عدو ڈھونڈ رہا ہے لیکن — ایک ذرہ نہیں ملتی ہے کہیں گرد ملال

رخش گردوں کی طرح گاڑ زمیں چل نکلے — منہ سے تیرے کہیں اتنا جو نکل جائے کہ چل
جس طرح داغ ہے آغوش میں لالے کے نہاں — ڈر کے مریخ کے سینے سے لپٹ جائے زحل

حملہ در فوج عدو پر وہ اگر ہو دم جنگ — باندھ کر چست کمر کھینچ کے شمشیر دو دم
کھیت کشتوں کا نہ تیار بھی ہونے پائے — ہو چکے تیغ و قضا میں برضا بیع سلم

کس قدر دریا تری دریا دلی کا ہے وسیع — مثل نیلوفر نظر آتا ہے اس میں آسماں
خلق پر تو مہرباں ہے خلق تیری خیر خواہ — تجھ میں خلق اللہ میں گویا خدا ہے درمیاں

پڑے جو عکس تری شان عیب پوشی کا — دکھائے جوہر آئینہ شان ستاری
دہن ہو خانۂ زنداں زبان شاعر کو — سخن جو رنگ کو پکڑے سمجھ کے بیگاری
بدوں میں بھی یہ اثر اب ہے حسن نیکی کا — بکیں گناہ تو توبہ کرے خریداری

انگشتری کا اس کی دو پلکا ہے اک نگیں — کرتے ہیں جس کو دولت کونین اعتبار
منہ پر چڑھے معاند مرحب سرشت کیا — اس کی نگاہ قہر مکرر ہے ذوالفقار

لے آسمان تیری طرف اس کی ہے نگاہ | گلدستہ باندھ تار شعاعی سے اسپ وار
اے زہرہ چاہیے جو تجھے اپنی آبرو | کر نغمہ ہائے ترکی رواں جلد جویبار

صفت تیغ

کھنچ گئی معرکۂ جنگ میں جب میان سے وہ | ردھیں پیاسوں کی ہوئیں جمع جھمکر پنگھٹ
پاٹ کر لاشوں سے میدان کو لیتی ہے جو دم | ملک الموت سے کہتی ہے کہ بول آکے رہٹ

جنگ میں کرتی ہے یہ تیغ سپر دو ٹکڑے | جس طرح چرخ پہ انگشت پیمبر سے قمر
ہو جو اونچی تو کرے شیر فلک کو چورنگ | ہو جو نیچی تو کٹے گاو زمیں کا پیکر

حشر برپا جنگ میں جس دم کرے آواز تیغ | صور اسرافیل اور آکر ملائے ہاں میں ہاں

صفت اسپ

تیزی کا تصور دلِ مجرم میں جو گزرے | ٹھہرائے سے قاضی کے نہ ٹھہرے کبھی تقصیر

ہو یاسمن پہ اسپ سبکرو اگر رواں | سمٹے نہ یاسمن نہ ہلے یاسمن کی شاخ

اپنے مجمع میں کہیں دو مجھے تھوڑی سی جگہ | چوٹیوں سے ہے یہی طور کی چوٹی کا کلام
چشم بر چہرۂ محبوب ہے حلقوں سے رکاب | دست در گردن معشوق ہے تسموں سے لجام
پائداری میں محبت ہے تڑپ میں عاشق | جانے میں وصل کا دن آنے میں ہے ہجر کی شام
جسم صاف اس کا نہیں آئنہ صاف سے کم | سامنا راہ میں اشیا کا جو ہو وقت خرام
عکس پڑنے کا کرے قصد نہ پہنچے اس تک | مے تو شیشے سے گرے ہو نہ مگر داخل جام

لالے کے پھول کو آغوش صبا میں دیکھا | نظر آیا جسے رفتار میں وہ داغ کفل

صفت فیل

دست صرصر سے گیا پردۂ ظلمات سمٹ
دم رفتار خضر بھی اُسے دیکھیں تو کہیں

مار خرطوم ہے دنداں ہیں درخت صندل
اور تشبیہ نئی اک مجھے سوجھی ہے ابھی

نائے کی طرح سلاسل سے وہ جاتا ہے نکل
پابہ زنجیر ہے ہر چند مگر ہے آزاد

واسوخت

منشی صاحبؒ نے واسوخت بھی سات کہے۔ ان میں سے چھ شعلۂ جوالہ (مجموعۂ واسوخت) میں منشی نولکشور آنجہانی کے مطبع میں پہلے چھپ چکے تھے۔ اس مجموعے کا تاریخی نام "مضامین دل آشوب" ہے اور ان کا سال طبع "مرآۃ الغیب" سے پہلے سنہ ۱۲۸۴ھ ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا نام بھی تاریخی ہے۔ (واسوخت اردو ۱۲۸۴ھ۔ شکایت رنجش ۱۲۸۴ھ۔ غبار طبع ۱۲۸۴ھ۔ حسد اغیار ۱۲۸۴ھ۔ صفیر آتشبار۔ بانگ اضطرار)۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی سال کے نتائج افکار ہیں۔ اللہ اللہ کیا قدرت حاصل تھی۔ پھر سنہ ۱۹۲۱ء میں دائرۂ ادبیہ لکھنؤ نے "مینائے سخن" کے نام سے یہ واسوخت اسی مطبع میں چھپوائے ہیں اور شائع کرکے اردو زبان کی شاعری پر دائمی احسان کیا ہے۔

لطیفہ۔ ایک واسوخت چھپنے سے رہ گیا۔ ایک دن میں نے دیکھا اور عرض کی "اس کو بھی چھپوا دیجئے" مسکرا کر فرمایا "بیٹا یہ واسوخت بھی جوانی میں کہا تھا۔ اب تو اس سفید ڈاڑھی پر واسوخت کی اشاعت نہیں پھبتی ہے۔"

واسوخت میں جو کچھ کہنے کا دستور تھا وہی ان واسوختوں میں بھی ہے اور چونکہ اس زمانے میں واسوخت امانت کی دھوم تھی اس لئے امیرؒ نے بھی رعایات لفظی کا خیال رکھا ہے۔ شوکت الفاظ اور زور بیان کے ساتھ اکثر مضامین نادر ہیں۔ غرض امیرؒ نے جس صنف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے اس کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔

واسوخت میں باہمی شکوے شکایت اور نوک جھوک کے وقت داستان مزے پر

آتی ہے۔ امیرؔ نے اس موقع کی ایسی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ واقعہ سامنے آ جاتا ہے۔ مختلف واسوختوں سے کہیں کہیں کے کچھ بند لکھے جاتے ہیں۔

صفت عشق

دھوم ہے خسرو اقلیم جنوں آتا ہے
فوج غم ساتھ ہے آمادہ خوں آتا ہے
خلل انداز صف صبر و سکوں آتا ہے
صاحب لشکر نیرنگ و فسوں آتا ہے
قابل دید تماشا حشم و جاہ کا ہے
داخلہ تخت گہ دل میں شہنشاہ کا ہے

وہ فلک قدر شہنشاہ زمن کون کہ عشق
تیغ زن تیر فگن قلعہ شکن کون کہ عشق
رستم معرکۂ رنج و محن کون کہ عشق
مالک ملک دل و جان و بدن کون کہ عشق
گرد میں ہے روش باد بہاری دیکھو
حضرت عشق کی آتی ہے سواری دیکھو

کیا جلوس اس کی سواری کا دکھاتا ہے بہار
فیل آفت کے جلو میں ہیں ستم کے رہوار
آگے آگے علم نالۂ خورشید نثار
زرفشاں اس کا پھریرہ کہ دھواں آتشبار
دل جو ٹوٹے ہیں نقیب آہ کے للکارے ہیں
آبلے سینۂ عشاق کے نقارے ہیں

چشم تر اشک کا چھڑکاؤ لگائے سر راہ
صرف جاروب کشی زلف سے ہو بخت سیاہ
غم و اندوہ کی استادہ و روریہ ہو سپاہ
دوڑ کر لائے خبر جلد کہو بیک نگاہ
ہے ابھی دور کہ پہنچی ہے سواری نزدیک
کس قدر باغ سے ہے باد بہاری نزدیک

تہنیت کی یہ ہر اک ساز سے نکلے آواز
تم سلامت رہو تابع ہوں عراق اور حجاز
وہ بھی قایم رہیں شہزادے جو ہیں سوز و گداز
حسن جو آپ کی معشوقہ ہے عمر اس کی دراز
آپ کو وصلت جانانہ مبارک شاہا
خلق کو مرگ جوانانہ مبارک شاہا

کشتیاں پیش جواہر کی ہوئیں بوقلموں	جن پہ قربان کرے گوہر انجم گردوں
سرخ یاقوت ہزاروں صفت قطرۂ خوں	چہرۂ زرد کے پکھراج بھی گنتی سے فزوں
لخت دل لعل تھے نیلم تھے کہ تبخالے تھے
تار اشکوں کے نہ تھے موتیوں کے مالے تھے

خسرو عشق کو آیا دم رخصت یہ خیال	دل کی اقلیم حقیقت میں ہے زر ریز کمال
معتدل آب د ہوا جس سے طبیعت ہے نہال	چھوڑیے کیوں اسے دولت سے یہ ہے مالامال
قطعے قطعے میں طرب خیزی گلشن ہے یہاں
گوشے گوشے میں زر داغ کا مخزن ہے یہاں

صبر نامی ہے جو اس کشور آباد کا شاہ	کیجئے قید کسی طرح اسے رکھ کے گناہ
اس کو پوشیدہ خبر اس کی جو پہنچی ناگاہ	نہ تھمے پانو کہا دل میں کہ انا للہ
رعب غالب یہ ہوا ڈر کے وطن چھوڑ دیا
خوف صیاد سے طائر نے چمن چھوڑ دیا

پاس ناموس کا رہتا ہے نہ غیرت کا خیال	دل سے اڑ جاتا ہے بدنامی و ذلت کا خیال
پند ناصح کا نہ واعظ کی ملامت کا خیال	دشت پر خار کا یا وادی وحشت کا خیال
جوش کم سنگ ملامت سے کہاں ہوتا ہے
تیغ وحشت کو بھی سنگ فساں ہوتا ہے

اب تو چہرے سے نمایاں ہیں یہ وحشت کے اثر	ڈر کے اڑ جاتے ہیں طائر بھی میں جاتا ہوں جدھر
نہیں خائف مری صورت سے فقط جن و بشر	راہ سے خار تلک اڑ گئے ناگن بن کر
دیکھے وحشت تو رمیدہ ابھی آہو ہو جائے
پڑھ کے نام اپنا جدھر چھو میں کروں ہو ہو جائے

سراپائے معشوق

باغ خوبی میں ہے کتنا قد رعنا موزوں	جس کی تعریف میں ہے نثر سراپا موزوں
مصرعۂ سرو کو سمجھیں شعرا کیا موزوں	تو لیے عقل کی میزان میں تو ہے ناموزوں

ہے جو انساں ہے اُسے یہ قدِ آزاد پسند
جانور فاختہ ہے اس سے ہے شمشاد پسند

آنکھ میں سرمے کی تحریر جو آتی ہے نظر
مست کے ہاتھ میں گویا کہ کھنچا ہے خنجر
نگہِ ناز مگر رصفت تیر دو سر
موے مژگاں نہیں گویا انھیں تیر دکے ہیں پر
خوں ہوئے لعل جو خنداں لب خوش رنگ ہوئے
دانت شمشیر تبسم کے لئے سنگ ہوئے

اس کے بالوں میں ہیں اس طرح پرئے گوہر
نکل آتے ہیں شب تار میں جیسے اختر
سنبل گلشن خوبی پہ ہے یا شبنم تر
رہ گئی یا شب گیسو متبسم ہو کر
چوٹی میں نقرئی موباف عجب زیبا ہے
دامن شب سے گریبان سحر ٹانکا ہے

ساغر بادۂ گلرنگ ہے آنکھوں پہ نثار
مستی حسن سے سرمست ہوئے ہیں ہشیار
ڈورے آنکھوں میں نہیں جمع ہوئے ہیں میخوار
صاف ہے چہرۂ رنگیں پہ گلستاں کی بہار
مست سمجھیں جو وہ آنکھیں نظر آئیں کالی
گھر کے آئی ہیں گلستاں میں گھٹائیں کالی

وصف وہ کیجیے چشم و مژہ و ابرو کا
جو سنے صاف کہے صل علیٰ صل علےٰ
موے مژگاں نہیں آنکھوں پہ یہ ہیں دستِ دعا
زیر محراب اٹھائے ہیں بامید شفا
جنبش ہر مژہ آفت ہے خدا خیر کرے
نبض بیمار کی سرعت ہے خدا خیر کرے

ایسا مضموں بندھے ابرو و بینی کا کہ واہ
نوبتیں بجنے لگیں سب کہیں سبحان اللہ
چاندنی رات ہے افشاں سے وہ گیسوے سیاہ
دیکھنے ہوں جسے تارے وہ کرے خوب نگاہ
واہ کیا شکلیں ہیں قابل ہیں یہ تصویروں کے
دیکھو نکلی ہے زرہ سایے میں شمشیروں کے[1]

---

[1] اس تشبیہ کو جب میر انیس مغفور نے سنا تو نہایت ہی محظوظ ہوئے اور بہت تعریف کی۔

دہن تنگ میں تنگی سے نہیں جائے سخن
شرم ہے چور مگر اس نے چرایا ہے دہن
پر چھپائے سے کہیں چھپتے ہیں ایسے بھی چلن
حسن دعوے جو کرے صاف ہو مضموں دشمن
بات پوشیدہ نہیں ہے سندیں ظاہر ہیں
ہونٹ دونوں تو گواہی کے لئے حاضر ہیں

باہمی نوک چوک

رات دن صحبت اغیار رہا کرتی ہے
بزم انھیں لوگوں سے بازار رہا کرتی ہے
طبع تم سے مری بیزار رہا کرتی ہے
گرد غم بیچ میں دیوار رہا کرتی ہے
خیر کیا واسطہ بہتر ہو اگر دور سے تم
ناز اٹھواؤ یہ بیجا کسی مزدور سے تم
بر بلا تم ہو تو ہیں ایک بلاکش ہم بھی
برق وش تم ہو تو پرکالۂ آتش ہم بھی
تم کو پروا نہیں تو تم پہ نہیں غش ہم بھی
ڈھونڈلیں گے کوئی محبوب پریوش ہم بھی
دل ہے بلبل تو کہاں چہرۂ گلرنگ نہیں
پانو میں لنگ نہیں ملک خدا تنگ نہیں
سن کے اس بات کو جلدی سے بڑھا نہ تمثال
پھینکدی نوچ کے چلمن کہ پریشاں تھا کمال
در میں رکھا جو قدم کو تو ہوا آئنہ حال
چار سو پھیل گئی روشنی شمع جمال
مجکو دیکھا تو کہا واہ یہ چوری ہم سے
بت بنے بیٹھے ہو اللہ یہ چوری ہم سے
خام سمجھا تھا تمھیں تم ہو بڑے ہی پکے
مجھ سے کہتے ہو کہاں آج کدھر آ نکلے
انھیں باتوں سے تو میں ہار گیا تم جیتے
انھیں چالوں سے تو صاحب مجھے چھوٹے چھکے
بس بہت بڑھ نہ چلو سوچو تو اپنے جی میں
رات بھر میری گزر جاتی ہے بےچینی میں
خیر ہے خیر ہے بیباک ہوا کیا تجکو
پیکے آیا ہے کہ سودے کا ہے دورا تجکو
بات کرنے کا بھی آیا نہ سلیقا تجکو
منہ اسی سے نہ کبھی میں نے لگایا تجکو

واہ جی زور یہ شوخی ہے نئی گرمی ہے
منہ بناؤ کہ زباں خوب ہی چل نکلی ہے

یاد ہے آگے بھی ہم پر کبھی منہ آتے تھے — آگے بھی ہم سے کبھی فقرے کیے جاتے تھے
آگے بھی آپ اسی انداز سے اتراتے تھے — آگے بھی ہم پہ اسی طرح سے جھنجھلاتے تھے

برہمی کی کبھی آگے بھی لیا کرتے تھے
اس ڈھٹائی سے کبھی بات کیا کرتے تھے

شان اللہ کی یہ اور جلائیں گے ہمیں — راستہ بھولے ہوئے راہ بتائیں گے ہمیں
آشنا غیر کے ہوں گے یہ ستائیں گے ہمیں — ہم جو آنے کو کہیں گے نہ بلائیں گے ہمیں

ہیں ابھی سے یہ زمانہ تہ و بالا کرتے
پوچھتا کوئی جوان کو تو کہو کیا کرتے [1]

---

[1] مولوی محبوب علی صاحب (ناظم دائرۂ ادبیہ) نے ان واسوختوں پر تبصرہ کیا ہے۔ اس کے آخر میں جو کچھ لکھا ہے اس کی بابت مجھے یہ لکھنا ہے کہ ؎ خنجر ناز سے لاکھوں کے گلے کٹتے ہیں ؛ شربت مرگ کے پیاسوں میں قدح بٹتے ہیں۔ اس شعر میں کاتب نے غلطی سے "قدحے" لکھ دیا اور وہی چھپ گیا اگر اتنی بات سمجھ لی جاتی تو "قدح" کی "حا" نذر سیل ہوتی نظر نہ آتی۔ جس طرح واسوخت اردو بند ۱۹ میں کہا ہے ؎ صف مژگاں نہیں مستوں کی برابر ہے نشست ؛ نرگس مست کے بٹتے ہیں "قدح" دست بدست۔
بے شک عام طور پر لوگ "قدحا" بولتے ہیں مگر امیرؔ کی زبان پر نہ تھا وہ نثر میں بھی "قدح" لکھتے تھے۔ حکیم عابد علی کوثر کو لکھتے ہیں "سفوف پھانک لینا آسان مگر یہ عرقیات کا قدح پینا محال" (خطوط منشی امیر احمد ص۱۱)
؎ ہم سے عیار بنا آپ کا کیا کہنا واہ ؛ یہی حیلے ہیں تو کیا ہوگا محبت کا نباہ۔ اس شعر میں غالباً عیار بنا ہی کو ہلکا لفظ کہا گیا ہے مگر یہ لفظ تو معشوق بازاری کی زبان سے نکلا تھا امیر کو اس کی بول چال میں دخل دینے کی کیا ضرورت تھی۔
؎ چار چاند آپ کو دیکھو تو لگائے ہم نے ؛ ناز بردار بنے ناز اٹھائے ہم نے۔ اس شعر میں "خوان سخن کا نشتر گربہ زلہ رُبا" نہیں ہے بلکہ جس زمانے کے یہ واسوخت کہے ہوئے ہیں اس زمانے تک اختلاف خطاب جائز تھا۔ تجرؔ ؎ اب مجھ سے الّیام کی باتیں نہ کیجیے ؛ (بقیہ حاشیہ ص۲۸۶)

مسدس

ذکر شاہ انبیا وغیرہ نعتیہ مسدسوں کے علاوہ امیرؔ نے مدح میں بھی کئی مسدس کہے ہیں۔ مسدس میں ایک کے بعد دوسرا مصرع بڑھتا گیا ہے۔ ٹیپ بہت اچھی ہوئی ہے۔ اور یہی وصف مسدس کی شان بلکہ اس کی جان ہے۔ اکثر ٹیپیں تو میر انیسؔ مغفور اور میرزا دبیرؔ مرحوم کی کہی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ان مسدسوں میں بھی ندرت مضامین، نازک خیالی اور قوت فکر وغیرہ کے نمونے ایک سے ایک بہتر ہیں اور اس صنف شاعری میں بھی امیرؔ کا مرتبہ بہت بلند نظر آتا ہے۔ جو مسدس حیدر آباد جاتے ہوئے نواب میر محبوب علی خاں طاب ثراہ کی مدح میں کہا تھا۔ اس کے پیش کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ موت کی نذر ہو گیا یہ اس نظر سے ان کا آخری کلام ہے کہ اس کے بعد توجہ اور فکر سے کچھ نہیں کہا۔ اس مسدس کے دو چار بند یہ ہیں۔

لی مقدر نے یہ کروٹ یا کسی دلدار نے ۔۔۔ لے لیا بوسہ جبیں کا دولت بیدار نے
رخ سے برقع کو ہٹایا شاہد اسرار نے ۔۔۔ منہ چھپایا دامن اقبال میں ادبار نے
باغ امکاں میں بہار کامرانی آگئی
پیر گردوں پر نئے سر سے جوانی آگئی

کون گھر سے اس طرح نکلا ہے نکلے جیسے ہم ۔۔۔ دل سے نکلی آرزو نکلا جگر سے خار غم
سر پہ گرد راہ چھائی صورت ابر کرم ۔۔۔ دست ہمت بن کے کانٹوں نے لیے پنے قدم
صبح غربت ہے کہ حور آغوش پھیلائے ہوئے
شام غربت ہے کہ لیلے زلف بکھرائے ہوئے

(بقیہ حاشیہ ص۲۸۵) دل تم سے پھٹ گیا جگر انگار ہو گیا۔ تحریر ۵ ہم نے معشوق بنایا تھیں محبوب کیا: اس کے بدلے میں سلوک آپ نے کیا خوب کیا ۵ آدمیت سے نہیں آپ کو مس دیکھ لیا: پیار کر کے تمھیں دس بیس برس دیکھ لیا۔ زندہ ہمارے آپ کے بس آج سے ہنسی موقوف: ذرا سی بات میں غصہ ہے تم کو آجاتا

سرو قد تعظیم دیتے ہیں بگولے دشت میں — گرد اٹھتی ہے کہ دامن بڑھ کے چھولے دشت میں
انس کی بو دے رہے ہیں پھول پھولے دشت میں — خضر ہے یہ بو اُسے جو راہ بھولے دشت میں
دشت ایمن کی طرح ہر سو ہے بارش نور کی
شاخ آہو ہے کہ ڈالی ہے نہال طور کی

بخت کو کھلنا مبارک بندھ گئی ہمت مری — اس فضا میں خوب کھل کھیلے گی اب حسرت مری
محو کر دے گی وطن کی یاد کو غربت مری — چوکڑی بھولے گی آہو کی طرح وحشت مری
وادی امید کا طے مرحلہ ہے آج ہی
عمر بھر کی آرزو کا فیصلہ ہے آج ہی

شاعری کا رنگ اچھلے رنگ محفل کی طرح — کاٹ پیدا ہو زباں میں تیغ قاتل کی طرح
آئے ہر مضموں تڑپتا لوٹتا دل کی طرح — معنی باریک پھڑکیں نبض بسمل کی طرح
طبع میں آئے بلندی طالع بیدار کی
آسماں لاکھوں کرے پیدا زمیں اشعار کی

مخمس، ترجیع بند اور رباعیاں وغیرہ

منشی صاحبؒ نے مخمس ترکیب بند ترجیع بند بہت سے کہے مگر اکثر نعت میں ہیں۔ رباعیاں اور قطعات البتہ عاشقانہ وغیرہ بھی ہیں اور مدح میں بھی۔ شعر پر مصرعے لگانا امیرؒ کا حصہ تھا۔ وہ شعر کو گویا اپنا کر لیتے تھے اور آخر کا مصرع بول اٹھتا تھا۔ اور یہی تضمین کا کمال و حسن ہے۔

مخمس بر غزل خواجہ حافظ شیراز رحمۃ اللہ علیہ

میگساران نبی نعرۂ مستانہ زدند — طعنہ از بے خردی مردم بیگانہ زدند
گفت جبریل کہ ایں زمزمہ بیجانہ زدند — دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند
گل آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند

قول سلطان رسالت سے ہیں واقف کہ و مہ — ایک خرقہ ہے بہتر میں فقط قابل زہ

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ   وا ہوئی ناخن عشاق سے محکم یہ گرہ
چون ندید ند حقیقت رہ افسانہ زدند

رہے حیران ملک بات ہے یہ بے کم و کاست   عرش سے بڑھ کے جو لی ختم رسل نے وہ راست
کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجاست   کہا جبریل نے عیسٰیؑ سے یہ جب درخواست
این قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

مخمس بطور ترجیع بند

تجھ سا کہاں پیمبر صاحب کتاب ہے   دیوان کائنات میں تو انتخاب ہے
پر مختصر سی بات یہ لب لباب ہے   ہر چند نعت حمد صفت بے حساب ہے
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

امکان کا وجوب کا مجمع ہے تیری ذات   دیکھا جو چشم غور سے اے فخر کائنات
مدحت میں تیری اور تو کچھ نہیں ہے بات   تجھ میں ہیں وہ صفات جو خالق میں ہیں صفات
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

تضمین شعر سعدی علیہ الرحمتہ

عذبت عیون مقالہ عظمت شیون جلالہ   حصل الشفا بخیالہ وصل الاسٰے بوصالہ
شرف الثرٰے بظلالہ سمک السما بنعالہ   نصبت لوائے نوالہ حمدت جمیع فعالہ
بلغ العلٰے بکمالہ کشف الدجٰے بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ صلو علیہ و آلہ

جو حباب بن کے جدا ہوا وہی قطرہ عین بقا ہوا   جو ادھر سے شوق لقا ہوا تو ادھر سے ذوق سوا ہوا
نہ کرو گماں کہ یہ کیا ہوا سر عرش ہے یہ لکھا ہوا   الف ایک تھا نہ دوتا ہوا تھا اگرچہ مد سے بڑھا ہوا
بلغ العلٰے بکمالہ کشف الدجٰے بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ صلو علیہ و آلہ

ہوے آپ داخل بزم ہو وہ چمن کہ رنگ ہائے بو | نبی و ملائک نیک خو رہے آستانے پہ سرخرد
رہی سب کے کانوں کو آرزو نہ سنی کسی نے وہ گفتگو | جو پھرے وہاں سے وہ سرخرو یہی غلغلہ تھا ہر ایک سو

بلغ العلےٰ بکمالہٖ کشف الدجےٰ بجمالہٖ

حسنت جمیع خصالہٖ صلو علیہ و آلہٖ

تضمین شعر صائب

ہوئی جب آپ کے یاروں کو پیشتر سے خبر | کہ ہوں گے راہی معراج شاہ جن و بشر
کیا سوال کہ ہم بھی ہوں ہمرکاب سفر | دیا جواب کرو اس شرف سے قطع نظر

اگرچہ خوش بنود سیر بوستاں تنہا

گرفتہ ایم اجازت ز باغباں تنہا

ترجیع بند

اللہ کا محبوب ہے محبوب ہمارا | جو حسن میں ہے حضرت یوسفؑ سے بھی پیارا
قدسی بھی سر عرش جو کرتے ہیں نظارا | ہر ایک یہ ہر ایک سے کرتا ہے اشارا

دل کو مرے تسخیر کیا اس عربی نے

مکی مدنی ہاشمی و مطلبی نے

جس دن کہ امیر آئے نظر صبح قیامت | دیدار خدا کا ہو محمدؐ کی شفاعت
پوچھیں جو ملک مجھ سے کہ تو کس کی ہے امت | حسرت سے کہوں دیکھ کے میں جانب حضرتؐ

دل کو مرے تسخیر کیا اس عربی نے

مکی مدنی ہاشمی و مطلبی نے

آدمؑ کا یہ قول ہے میں کیا ہوں | اک لمعہ نور مصطفیٰؐ ہوں
کہتے ہیں یہ نوحؑ مالک احمدؐ | کشتی کا میں ایک ناخدا ہوں
ثابت قدم اس سخن میں ہیں خضرؑ | حضرتؐ کے سبب میں رہنما ہوں
ہے ناز خلیلؑ کو بھی اس پر | گلچین ریاض اقتدا ہوں
فخر یہ ہے کلام یوسفؑ | میں بندۂ ختم انبیاؐ ہوں

کہتے ہیں یہ تخت پر سلیماںؑ میں بھی نہ سایۂ لوا ہوں
فرماتے ہیں یہ جناب موسیٰؑ درباں ہوں کہ صاحب عصا ہوں
یہ لوگ تو کیا خدا کا ہے قول محبوب کا طالب رضا ہوں
شاہا ہے یہ بات عقل سے دور یہ سب تجھے چاہیں میں نہ چاہوں

گر بر سر و چشم من نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی

دعوت میں عجیب رتبہ پایا کیا کیا ہوئے پیشکش ہدایا
کیا بزم تھی بزم لامکانی جس بزم میں نور تھا نہ سایا
بیگانہ دوئی سے بزم وحدت اپنا تھا نہ اس جگہ پرایا
جیرہ جو ہوا طعام دعوت تنہا نہیں میہماں نے کھایا
طعم نمکیں و اکل شیریں اوروں کے لئے بھی ساتھ لایا
بے فاصلہ میزبان و مہماں کیا قرب نے بعد کو مٹایا
تحریک زباں نہ جنبش لب کچھ حال سنا تو کچھ سنایا
خود ناز کو ناز سے حکایت خود شوق کو شوق سے کنایا
کم کی جو ادب نے گرم جوشی کہہ کہہ کے یہ شوق مسکرایا

گر بر سر و چشم من نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی

تضمین اشعار ہندی

حیا اس کی اسے عاشق کے ملنے سے بچاتی ہے وہ شرمیلا ہے چشموں سے اس کو شرم آتی ہے
نگاہیں دیکھ لیتی ہیں تو آنکھ اس کی لجاتی ہے مری حسرت مجھے یہ وصل کا رستہ بتاتی ہے

نینن کی کر کوٹھری پتلی دیوں بچھائے
پلکوں کی چک ڈار دوں سائیں بھین آئے

نہیں غم گر فنا کر دے کوئی سر تا بپا مجکو کہ ہجر یار میں ہے خود مری ہستی بلا مجکو

مگر آنکھیں ہیں پیاری جانؒ دل سے بھی سوا مجکو
انھیں سے اک نظر دیدار کا ہے آسرا مجکو

کاگا سب تن کھائیو چن چن کھایو ماس
دو نینا مت کھائیو پیا ملن کی آس

خمار آلود آنکھیں ہیں مگر ہے ان میں مستی بھی
سپیدی بھی سیاہی بھی ہے اور کچھ کچھ ہے سرخی بھی
نیا نیرنگ ہے وہ جان لیتی بھی ہیں دیتی بھی
خضر بھی ہیں مسیحا بھی ہیں قاتل بھی ہیں ساقی بھی

امین ہلاہل مدھ بھرے سویت شیام رتنار
جیت مرت جھک جھک پرت جہ چتوت اکبار

شب وصل صنم ہے جان اس بیمار الفت کی
نہیں ہے زندگی میں کوئی ساعت ایسی لذت کی
الٰہی طول میں یہ رات ہوجائے قیامت کی
کہ مٹ جائے یہ دھڑکا پھر گھڑی آئے گی رخصت کی

سجن سکارے جائیں گے اور نین مرینگے رُئے
بدھنا ایسی کیجیو کہ بھور کبھو نا ہوئے

خودی میں ہو دوئی کا وہم یہ غفلت ہی غفلت ہے
خودی جب اٹھ گئی دل سے تو پھر حیرت ہی حیرت ہے
یہاں تو وصل ممکن ہی نہیں فرقت ہی فرقت ہے
غرض ہر حال اور ہر رنگ میں وحدت ہی وحدت ہے

جب ہم تھے تب ہر نہیں جب ہر ہیں تب ہم ناہن
پریم گلی ات سانکری جا میں دو نہ سمائین

رباعیات

گزرے سر عرش جب جناب والا
اللہ رے شوق دید قد بالا
طوبےٰ نے سر اٹھا کے حسرت سے کہا
مضمون قیامت گیا بالا بالا

دیگر

ہیں زیر مزار خواب راحت میں حضورؐ
اب بھی ہے مگر فیض سے عالم معمور
یہ سر خفی ہے عین اعلان و ظہور
فانوس میں شمع ساری محفل میں ہے نور

دیگر

مشکل سے تجھے اد گل رعنا پایا
کونین میں پھر کر ترا کوچا پایا
دنیا عقبےٰ سے عاشقی حاصل کی
صغرا کبرا سے یہ نتیجا پایا

دیگر

غائب بہت اے جان جہاں رہتے ہو
مانند نظر ہم سے نہاں رہتے ہو
ہر چند کہ آنکھوں میں ہو تم دل میں ہو تم
معلوم نہیں پر کہ کہاں رہتے ہو

دیگر

اوروں کو تو دنیا میں قضا نے مارا
دی زیست خدا نے پھر خدا نے مارا
بر صورت مرگ و زیست اپنی ہے جدا
اُس لب نے جلایا تھا ادا نے مارا

دیگر

کمرے میں تو شب وہ ماہ سیما آیا
اس پر بھی بجھے ہاتھ نہ تنہا آیا
چلمن جو اٹھی ہوئی تھی آتی تھی ہوا
پھڑوا دیے پردے تو پسینا آیا

دیگر

آنکھوں سے ہے رنگ مے پرستی پیدا
پلکوں سے ہے شان پیشدستی پیدا
کچھ حاجت مے نہیں کہ ہے آپ سے آپ
اُن پتلیوں سے سیاہ مستی پیدا

دیگر

معدوم اگر یہ شکل امکاں ہو جائے
آئینۂ روئے وصل ہجراں ہو جائے
دیکھا تو نقط ہے نفی عاشق معشوق
داخل ہو جو "نا" "جان" "میں" "جاناں" ہو جائے

دیگر

ہیں غنچۂ و گل اہل زباں خاروں سے
لیتا ہے عجب کام وہ بیکاروں سے
تسبیح بکف ہے حمد باری کے لئے
دریا موتی سے آسماں تاروں سے

دیگر

کیا کہئے جو انقلاب دوراں دیکھے
برباد خزاں بہت گلستاں دیکھے

سلطان کئے سیکڑوں زمانے نے گدا ۔۔۔ دربانِ درِ مورِ سلیماں دیکھے

دیگر

دنیا گزراں ہے زندگانی فانی ۔۔۔ طفلی مہمان ہے جوانی فانی
پیری میں جو ہڈیاں چٹکتی ہیں امیر ۔۔۔ کانوں میں صدا آتی ہے فانی فانی

قطعات

چشمِ عبرت سے جو دیکھا باغ کو ۔۔۔ رازِ غیبی سیکڑوں ہم پر کھلے
گل ہوئے غنچے تو ہم سمجھے امیر ۔۔۔ طائرِ رنگِ چمن کے پر کھلے

دیگر

چندے جو ذوقِ حسن پرستی رہا ہمیں ۔۔۔ ہر خوبرو میں یوسفِ ثانی کا حسن تھا
پیری میں ایک بھی نظر آتا نہیں حسین ۔۔۔ شاید وہ سب ہماری جوانی کا حسن تھا

دیگر

اے شاہ حسن جلد الٹ دے نقاب شرم ۔۔۔ اک عمر سے پڑا ہوں ترے آستان پر
یہ ناز جب اٹھیں کہ بجا ہوں دل و دماغ ۔۔۔ دل تیرے زیرِ پا ہے دماغ آسمان پر

دیگر

عجیب رازِ نہاں کھل گیا جو فصد کھلی ۔۔۔ لہو کی دھار نہیں ہے دعا کو ہاتھ بلند
رسائی رگِ جاں امیر دیکھا اے شاہ ۔۔۔ کہاں پہنچ کے کیا التجا کو ہاتھ بلند

مثنوی

"نورِ تجلی" وغیرہ کے علاوہ ایک بڑی عاشقانہ مثنوی بھی کہی ہے جو مثنوی میر حسن کی بحر میں ہے۔ قصہ بہت دلچسپ ہے۔

ایک دن میں نے اس کے چھپوا دینے کے لئے اصرار کیا۔ فرمایا "نوجوانی میں کہی تھی۔ ان دنوں عربی فارسی کے الفاظ زبان پر زیادہ چڑھے ہوئے تھے جو مثنوی کی زبان پر

نہیں بھیجتے۔ تمھیں کوئی دقت نکالو تو روزانہ کچھ اشعار اس کے سن لیا کریں۔ ایسے الفاظ بدل جائیں تو پھر چھپوانے کا مضائقہ نہیں"۔ مگر اس کام کی نوبت نہ آئی۔ چند روز کے بعد میں رام پور سے چلا آیا۔ میرے دل کے ایک گوشے میں اس آرزو کا بھی مزار ہے۔

مادہ ہائے تاریخ

منشی صاحب تاریخ کہنے سے بہت گریز کرتے تھے۔ فرماتے تھے "ممتاز یہی ایک صنف شاعری ایسی ہے جس میں منتہی اور مبتدی دونوں برابر ہیں۔ بلکہ ممکن ہے کہ مبتدی کو مادۂ تاریخ اچھے سے اچھا ہاتھ آجائے اور منتہی منہ دیکھتا رہ جائے"۔ اس کے باوجود بہت سی تاریخیں کہی ہیں اور بہتر سے بہتر مادۂ تاریخ نکالے ہیں جو ایسے ہی قادر الکلام کا کام ہے۔

ان کا یہ ارشاد تھا کہ حتی الوسع پورے مصرع سے تاریخ نکلنا چاہیے اور جہاں تک ہو سکے مصرع ایسا ہونا چاہیے جس سے اس واقعے کا کچھ نہ کچھ پتا چلے جس کی تاریخ ہے۔

وہ کسی مسلمان کا سال رحلت عیسوی سن سے نکالنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ کسی مسلمان کی اس سے بڑھ کر اور کیا بدقسمتی ہوگی کہ اس کے مرنے کی تاریخ عیسوی سن میں کہی جائے۔

میں بسبیل تذکرہ حصۂ اول میں دو چار تاریخیں لکھ چکا ہوں۔ چند تاریخیں یہاں اور بھی لکھی جاتی ہیں۔

تاریخ نزول اجلال نواب سید محمد حامد علی خاں بہادر بہ القاب

ابر کرم و بحر سخا آیا ہے ہر ایک کے درد کی دوا آیا ہے
ڈنکے سے یہ آرہی ہے آواز امیر یہ آیۂ رحمت خدا آیا ہے
۱۳۱۱ھ

کبھی کبھی خوبصورت تعمیہ اور تخرجہ بھی کیا کرتے تھے۔

للہ الحمد خیر سے آیا وارث تخت ملک کا سرتاج

× × × × × × × × × ×

اور امیر فقیر کا ہے یہ رنگ — نہیں ملتا خود اس کو اپنا مزاج
ہے مکرر زبان پر اس کی — ماہ برج شرف میں آیا آج

۹۴۷×۲
۶۱۸۹۴

دیگر

مبارک ہو یارب رعایا کو یہ دن — سو سلطنت شاہ جم جاہ آیا

× × × × × × × × × ×

یہ تاریخ بھی لاکلام اک دلہن ہے — عروس ریاست کا نو شاہ آیا

۹۱
۱۳۱۱ھ = ۹۱ - ۱۴۰۲

قطعہ تاریخ طبع صحیفہ اخبار

مخزن الاخبار کو پایا جو مالا مال حسن — لوٹنے کا در غلطاں کو بہانہ مل گیا

× × × × × × × × × × ×

سال سے ہے اوج نجم مشتری روشن امیر — جس کو یہ پرچہ مل گیا سمجھا خزانہ مل گیا

۱۲۷۳ھ

قطعہ تاریخ رحلت خاتون (اول) سید زاہد حسین صاحب زاہد

رتبۂ خاتون زاہد دیکھ امیر — آج کیا جنت میں اس کا پایہ ہے
ہے سیادت کی بدولت یہ شرف — چتر سر پر فاطمہؓ کا سایہ ہے

۱۳۱۲ھ

کبھی کبھی برجستہ بھی تاریخ کہہ دیتے تھے۔

جاڑوں کے دن تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ ہم سب دھوپ میں بیٹھے تھے اور امیر اللغات سے متعلق کچھ بات چیت ہو رہی تھی اتنے میں جنرل صاحب مرحوم کا ایک خط اس مضمون کا آیا کہ بہت لڑ بھڑ کر نواب محمود علی خاں کی کوٹھی کا معاملہ جیتا ہے۔ آپ کوئی تاریخی نام ایسا رکھدیجیے جس سے فتح بھی نکلتی ہو۔ خط پڑھ کر میری طرف بڑھا دیا اور فرمایا "دیکھو تو ظفر منزل میں عدد پورے ہوتے ہیں"۔ جوڑا تو پورے ۱۳۰۷ھ تھے۔

لطیفہ۔ ایک دن ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ تشریف لائے۔ میں نے کہا (میں سن چکا تھا)

"حضرت! ڈاکٹر صاحب کے گھر میں فرزند پیدا ہوا ہے"۔ خوش ہو کر مبارکباد دی اور فرمایا۔ "ڈاکٹر کے ڈاکٹر پیدا ہوا"۔ عدد جوڑے گئے تو پورے ۱۳۰۹ھ تھے۔

سہرے

میں واقعات کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں کہ منشی صاحبؒ نے سہرے بھی بہت سے کہے جن میں سے اکثر نواب خلد آشیاں کے فرمائشی ہیں۔ سہروں میں بھی بلندی فکر، تلاش مضمون اور قوت گویائی وغیرہ کے انمول جواہر اور بیش بہا نمونے نظر آتے ہیں۔ افسوس ہے کہ مجھے دو تین سہروں سے زیادہ نہ مل سکے۔ چند شعر یہاں لکھے جاتے ہیں۔

جلوۂ طور پہ بالا ہے چمک سہرے کی — عارض حور پہ طرّہ ہے جھلک سہرے کی
کہکشاں اور ستاروں کو ملا کر باہم — کب سے تصویر بناتا تھا فلک سہرے کی
ڈالیاں پھولوں کی فردوس میں جب لچکیں گی — یاد آ جائے گی حوروں کو لچک سہرے کی

ایسا بنتا نہیں خورشید سے پُر زر سہرا — گوندھتا تار شعاعی سے ہے دن بھر سہرا
تجھ سا نوشہ نہیں دیکھا ہے قسم کھاتا ہے — ہاتھ رکھ رکھ کے ترے مصحف رخ پر سہرا
ٹوٹی جاتی ہے پسی جاتی ہے کیا کیا ہے نثار — بدھی شانے پہ حنا پاؤں پہ سر پر سہرا

سلام

تمام اصناف سخن میں مرثیہ ہی ایک ایسی صنف ہے جس میں غالباً حضرت امیرؒ نے طبع آزمائی نہیں فرمائی۔ ممکن ہے کوئی مرثیہ کہا بھی ہو مگر ہمیں دستیاب نہیں ہوا۔ ان کا بہت سا کلام ضائع بھی ہو چکا ہے۔ البتہ اسی کی دوسری قسم میں طبع آزمائی فرمائی ہے۔ یعنی سلام کہے ہیں اور ایک دو نہیں بلکہ متعدد جن میں سے ایک یہاں لکھتا ہوں۔

سلام ان پہ جو پیدا ہوئے محن کے لئے — غریب دشت میں تڑپا کیے وطن کے لئے
اجل بھی روئی شہیدان بے وطن کے لئے — خزاں اداس ہوئی مجرئی چمن کے لئے

غضب ہے چادر تطہیر کے جو مالک ہوں — شہید ہو کے وہ محتاج ہوں کفن کے لئے
نہ اشقیا میں اوڑھائی کسی نے چادر بھی — تن حسینؓ تڑپتا رہا کفن کے لئے
اسیر ہو کے کہا شامیوں سے عابدؓ نے — بنے ہیں ساعد و بازو مرے رسن کے لئے
دکھائی اصغرؓ معصوم نے جو خشک زباں — اجل نے پیار سے بوسے لب و دہن کے لئے
حرم نے رو کے شہیدوں کے حال پر جو کہا — کہ چادریں نہ میسر ہوئیں کفن کے لئے
ق
تو آکے خلد سے حوروں نے التماس کیا — کہ حلے نور کے حاضر ہیں پیرہن کے لئے
سرِ حسینؓ اٹھا کر کہا یہ عابدؓ نے — چلے ہیں لے کے یہ سوغات ہم بہن کے لئے
سکینہؓ یاد وطن میں تھی جس طرح بیتاب — نہ عندلیب بھی تڑپے گی یوں چمن کے لئے
چھپے جو خاک میں اکبرؓ کہا یہ بانوؓ نے — ہوا تھا چاند مرا بدر اسی گہن کے لئے
دل و جگر ہی نہیں ہے تباہ اس غم میں — حواس خمسہ پریشاں ہیں پنجتنؓ کے لئے
یہ انقلاب سے عالم کے کھل گیا ہم پر — تڑپ رہا ہے زمانہ شہ زمنؓ کے لئے
عیاں ہیں سال وفات اس سے پنجتن کے اسیر — شرف عجیب یہ حاصل ہے یاسمن[1] کے لئے

پہیلیاں

حضرتؒ نے اپنے گھر کے بچوں کی خاطر چند پہیلیاں بھی نظم فرمائی تھیں اور انھیں بھی لوازمات شاعری سے محروم نہیں رکھا۔ مجھے صرف دو پہیلیاں مل سکیں جو نذر ناظرین ہیں۔

گلشن میں اک شجر ہے جو پاتا نہیں ہے چین — تن پر غم حسنؓ ہے جگر میں غم حسینؓ

(حنا)

پانچ گھوڑوں پر سوار پانو پیادہ وہ چلے — پانو بیٹھے سے نہ اٹھے ایستادہ وہ چلے
مشک لے سر پیچ کر اور مشک چھڑکے راہ میں — راہ کافوری سڑک ہو تو زیادہ وہ چلے

(قلم)

[1] سن وفات آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم و حضرت فاطمہؓ ۱۱ھ لفظ "یا" سے سن وفات حضرت علی کرم ۴۰ھ حرف "م" سے سن وفات حضرت امام حسنؓ ۵۰ھ حرف "ن" سے سن وفات حضرت امام حسینؓ ۶۰ھ حرف "س" سے۔

نثر

منشی صاحبؒ کو جو قدرت نظم پر حاصل تھی وہی نثر پر لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہ وہ خود نثر میں بھی سادگی و بے تکلفی پسند فرماتے تھے اور اس معاملے میں غالبؔ مرحوم کے ہم مشرب تھے۔

ایک زمانہ وہ تھا جب لوگ نثر میں بھی صنائع و بدائع پسند کرتے اور جب تک عبارت میں شوکت الفاظ و رنگینی نہو اس کی قدر نہ کرتے تھے۔ مقفیٰ و مسجع عبارت لکھی جاتی تھی اور لوگ اسی کے دلدادہ تھے۔ منشی صاحبؒ کی بھی رجب علی بیگ سرورؔ وغیرہ سے صحبت رہا کرتی تھی اس لئے اس زمانے میں اسی رنگ کی عبارت خود بھی لکھا کرتے تھے۔ غدر سے پہلے کی تصانیف کا تو پتا نہیں چلتا البتہ تذکرۂ "انتخاب یادگار" میں جو غدر کے کچھ ہی عرصے بعد کی تالیف ہے قریب قریب عبارت کا وہی رنگ ہے۔

"سمند قلم پر شہسوار سخن کی تاکید ہے کہ میدان حمد الٰہی میں قدم اٹھا اور تیغ زبانِ قوت ناطقہ کی تہدید ہے کہ اس معرکہ میں جوہر دکھا۔ مگر یہ منزل ایسی کڑی ہے کہ دونوں کو مشکل پڑی ہے نہ اس کا پاؤں نہ اس کا ہاتھ اٹھ سکتا ہے۔ اس عجز کو دیکھ کر عقل حیران ہے اور دل کو سکتہ ہے کہ تحریر و تقریر کا تو یہ حال ہے کہ نہ قلم کو لکھنے کی تاب نہ زبان کو گویائی کی مجال پھر کیونکر وادی ناپیدا کنار حمد تمام ہو جس کی ذات کی بدایت صفات کی نہایت نہو کس طرح اس کی ستائش کا سرانجام ہو۔ الحق وہی باطن وہی ظاہر ہے۔ وہی اول ہے وہی آخر ہے۔ گفتگوئے بے سروپا اس کی ثنا کی گنجائش کہاں پائے۔ قطرے میں دریا، ذرے میں صحرا کیونکر سمائے۔ عجب بارگاہ کبریائی ہے کہ وہاں رسائی کا طریقہ نارسائی ہے۔ انسان ہمت ہار دے اور اس بازی کو جیتے لے وادی معرفت طے ہونے کی یہی سبیل ہے۔ العجز عن الدرک ادراک اسی پر دلیل ہے۔"

(از انتخاب یادگار)

لیکن چونکہ خود سادگی و بے تکلفی کے دلدادہ تھے اس لئے جیسے جیسے زمانہ اجازت

دیا گیا ان کی نثر عبارت بھی ان تکلفات سے پاک ہوتی گئی چنانچہ "خیابان آفرینش" "زادالامیر" اور "نماز کے اسرار" وغیرہ کی عبارت نسبتاً سادہ ہے۔

"الہٰی آج کیا ہے کہ قلم اٹھاتے ہی رعب وادب سے دل کانپتا ہے ہاتھ تھرتھراتا ہے کاغذ کا رنگ فق قلم کا سینہ شق ہوا جاتا ہے۔ سیاہی شرم سے پانی پانی ہوئی جاتی ہے۔ صریر خامہ سے فریاد کی آواز آتی ہے۔ کان رکھ کر سنیے تو تَاَدَّبْ یَا قَلَمْ تَاَدَّبْ یَا قَلَمْ کا شور برپا ہے۔ شاید حمد الہٰی او نعت رسالت پناہی کا ارادہ کیا ہے۔ بھلا یہ لق و دق میدان اور اس ضعیف البنیان کی جان کہ ان میدانوں میں چلنے کا حوصلہ کرے اور وادی حمد ونعت طے کرنے کا دم بھرے جہاں انبیا علیہم الصلواۃ والسلام کو عجز کا اقرار ہے۔ مقربان ملاء اعلیٰ کو معترف بہ قصور ہونے کا اظہار ہے ...."

"خداوندا کہاں سے وہ زبان پاؤں کہ تیرے احسانات کا شکر بجا لاؤں۔ خارستان عدم سے گلستان وجود میں لایا۔ ظاہری اور باطنی حواس عطا فرما کر دنیا کے کانٹوں اور پھولوں میں تمیز کا رستہ بتایا اور آخرت کا نفع اور ضرر بتانے کے واسطے انبیا پیدا کیے جنھوں نے وہاں کے نیک و بد سے آگاہ فرمایا۔ وعظ ونصیحت کے چراغ روشن کر کے جنت کا راستہ دکھایا علی الخصوص خواجۂ ہیژدہ ہزار عالم جان جانان ملائکہ ونبی جان آدم سرور کل ہادی سبل خاتم المرسلین رحمۃ اللعالمین شفیع المذنبین انیس الغریبین حضرت احمد مجتبےٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالےٰ علیہ و آلہٖ وازواجہٖ واہل بیتہٖ وذریاتہٖ واشیاعہٖ واتباعہٖ اجمعین کو مبعوث کر کے مرتبۂ ہدایت کو کمال تک پہنچا دیا۔ اپنی رحمت کاملہ کو مجسم کر کے عاصیان سیہ کار گنہگاران تیرہ روزگار کا بیڑا پار لگا دیا۔"

"حمد وصلوٰۃ کے بعد فقیر سراپا تقصیر امیدوار رحمت رب قدیر آرزومند شفاعت بشیر و نذیر امیر احمد امیر غفرلہ اللہ السمیع البصیر عرض کرتا ہے کہ ایک مدت سے مسلمانوں میں مولد شریف پڑھنے اور حضرتؐ کے فضائل ومحامد بیان کرنے کا چرچا ہے اور یہ چرچا اگر ناجائز امور سے پاک ہو تو دین اسلام کی اس سے بہت تقویت ہوتی ہے اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت بڑھتی ہے جس کا دل محبت کی چاشنی سے ذرا بھی آشنا ہے اس کو اس محفل کے خیر وبرکات کا مزہ ملتا ہے۔ عاشقان رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے یہ مجلس ایسا

چمن ہے کہ ان کا دل یہیں آکر کھلتا ہے۔ اکثر علما نے اس کے استحسان کا اقرار کیا اور بدعت حسنہ ہونے کا فتوے دیا ہے[1]۔۔۔۔۔۔۔" (از خیابان آفرینش)۔

"اللہ تعالےٰ نے جو اپنے بندوں کے لئے زمین کو قرار گاہ بنایا ہے تو اس سے یہ غرض نہیں کہ اس پر اونچے اونچے مکان بنائیں اور عیش و عشرت میں پڑ کر غفلت میں بسر کریں بلکہ مقصود یہ ہے کہ آرام پائیں اور نفع اٹھائیں اور موانع عبادت و بندگی کو دفع کریں اور ہر نعمت کو دیکھ کر نعمائے اخروی کو پیش نظر رکھیں اور اپنے آپ کو مسافر اور دنیا کو سرائے فانی جانیں اور زمین کو اپنی کھیتی کی جگہ بنائیں اور اس سے ایسا توشہ حاصل کریں جو وطن اصلی کے سفر میں کام آسئے یعنی نیک اعمال کے تحفے دنیا سے اپنے لئے ذخیرہ کریں اور دنیا کے پھندوں اور مکروں سے بچے رہیں اور خوب سمجھ لیں کہ عمران کو یوں لیے جاتی ہے جیسے کشتی اپنے سواروں کو۔ تمام عالم یہاں مسافر ہے۔ جو پیدا ہوا اس کی پہلی منزل گہوارہ ہے اور دوسری منزل لحد ہے اور وطن دار آخرت اور عمر سفر کا فاصلہ ہے۔ ہر برس عمر کا ایک مرحلہ ہے اور ہر مہینا ایک فرسنگ اور ہر آن ایک میل اور ہر سانس ایک قدم اور اللہ کی بندگی اس سفر کی پونجی اور اوقات راس المال اور نفس کی خواہشیں اس راہ کے ڈاکو اور نفس و شیطان ڈاکوؤں کے سردار ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔" (از زاد الامیر)

"حمد و صلوٰۃ کے بعد واضح ہو کہ ارحم الراحمین نے اپنی رحمت کاملہ سے تمام مخلوقات کو کیا کیا نعمتیں عطا فرمائیں اور تمام کائنات میں انسان ضعیف البنیان کو بڑی نعمت یہ دی کہ اُسے اشرف المخلوقات کیا۔ غور کرنا چاہیے کہ انسان اشرف المخلوقات کیوں ہے اور کس صفت نے اس کو لقد کرمنا بنی آدم کا خلعت پہنایا ہے۔ اس سے تو بحسب ظاہر زیادہ عاجز اور ناقص کوئی چیز نہیں کہ نہ اس کو گرمی سردی کی برداشت ہے نہ بھوک پیاس کا تحمل ذرا سے درد میں تڑپ جاتا ہے ذرا سی مصیبت کی تاب نہیں لاتا ہے۔ اس کے علم کی طرف دیکھیے تو بالکل بے حقیقت ہے اگر ایک رگ بھی اس کے دماغ میں بے محل ہو تو صحت میں ایسا خلل ہو کہ دیوانوں کی طرح تنکے چننے لگے اور ہزار سر پٹکے مگر یہ نہ سمجھے کہ اس کا سبب

[1] حالات اور روایتوں میں عبارت اس سے بھی زیادہ سادہ ہے۔

کیا ہے۔ دوا اس کے درد کی سامنے رکھی ہو اور نادانی سے نہ جانے کہ یہ میرے درد کی دوا ہے۔ اور اگر اس کی قوت کا خیال کیجیے تو اس سے عاجز تر کوئی نہیں کہ ایک مکھی ایک پسو ایک بھنگے تک سے جیت نہیں سکتا۔ نمرود سے طاقتور بادشاہ کو مچھر نے ہلاک کر ڈالا اور اس کے اتنے بڑے لشکر کو تباہ کر دیا۔ اور اگر ہمت کا لحاظ کیجیے تو ذرا سا نقصان اس کو پریشان کر دیتا ہے۔ بھوک کے وقت غذا نہیں ملتی تو بدحواس ہو جاتا ہے ......" (از نماز کے اسرار)

اس کے بعد وہ زمانہ آیا کہ نثر میں بھی بے تکلفی اور سادگی عام طور پر پسند کی جانے لگی۔ اور اب منشی صاحبؒ بھی اپنے مذاق کے موافق نثر لکھنے میں آزاد ہو گئے۔ چنانچہ امیر اللغات کا دیباچہ اس کا شاہد ہے۔

"میں نے ہوش سنبھالا آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھا کہ اچھے اچھے اہل زبان اور زبان داں سرزمین سخن کے فرمانروا ہیں۔ انھیں صحبتوں میں اردو زبان کی چھان بنان کا شوق مجھے بھی ہوا اور اسی زمانے میں یہ آرزو پیدا ہوئی اور بڑھ کر بے چین کرنے لگی کہ اردو الفاظ کے بکھرے ہوئے موتیوں کی ایک خوشنما لڑی بناؤں۔ اتنے میں لکھنؤ کی سلطنت مٹ گئی اور غدر ہو گیا۔ وطن کی تباہی اور گھر بار کے لٹنے سے چندے حواس ہی نہ جمع ہو سکے الفاظ کیسے! لیکن اس آرزو کی آگ دل میں سلگتی رہی۔ یہاں تک کہ فردوس مکاں نواب محمد یوسف علیخاں بہادر والی رام پور نے مجھے طلب فرما کر عزت کا خلعت اور اطمینان کا سرمایہ دیا۔ اب میں پھر اپنی تمنا کے سلسلے کو بڑھانے لگا۔ مگر اس زمانے میں رام پور کی عدالت دیوانی مجھ سے متعلق تھی۔ نواب فردوس مکاں اپنے کلام میں بھی مشورہ فرماتے تھے اور فن شاعری کے مشغلے جو نئی نئی شکلوں سے پیش آتے تھے وہ یوں بھی کم فرصتی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اتنی مہلت تو میں نہ پا سکا کہ اپنے ارادے کو پورا کروں تاہم کچھ کچھ شغل چلا گیا۔ جب خلد آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر کا عہد آیا تب فرصت کی کمی اور بڑھی لیکن کچھ ہی ہوا یہاں وہی دھن بندھی رہی۔ ۱۸۸۴ء میں علوم کے قدردان سر آلفرڈ لائل صاحب بہادر نے نواب خلد آشیاں طاب ثراہ سے اردو کے ایک جامع لغت کی فرمائش کی۔ نواب خلد آشیاں نے مجھے حکم دیا۔ یہاں تو یہ تمنا ہی تھی فوراً "آنکھ" کے لفظ کا ایک نمونہ تیار کیا۔.........

افسوس یہ بیل منڈھے نہیں چڑھنے پائی تھی کہ نواب خلد آشیاں مرض الموت میں مبتلا ہو کر دنیا سے رحلت فرما گئے۔ سر آلفرڈ لائل نے بھی ہندوستان کو خیرباد کہا۔ میں سمجھا ع آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ اردو کی قسمت ہی میں یہ بدا ہے کہ سنورنے نہ پائے۔ میں اسے کیا کروں اور کوئی کیا کرے۔ ان چوٹوں سے میرا دل ٹوٹا مگر ہمت نہ ٹوٹی اور رہ رہ کر تمنا گدگدایا کی۔ میں نے دیکھا کہ اردو کی بیل پھیلتی جاتی ہے۔ دفتروں میں یہی زبان اخباروں میں یہی زبان۔ پرانی شاعری سسک رہی ہے تو کیا ہوا نئی شاعری اردو کے نئے لباس سے دلھن بن کر نکلی ہے۔ آخر باسی کڑھی میں ابال آیا اور میں نے ۱۸۸۸ء میں اس تجربے کے واسطے سفر کیا کہ دیکھوں اردو لغت کی طرف ملک کے خیالات کیسے ہیں۔ لکھنؤ فیض آباد اور بنارس ہوتا ہوا پٹنے تک گیا جس سے بات چیت ہوئی اس نے اپنی تمنا کے اظہار سے میری تمنا کو اور شہ دی۔......... جن لوگوں نے اپنی بیش بہا رایوں سے مجھے شکر گزار فرمایا انھوں نے صرف مجھ پر احسان نہیں کیا بلکہ اپنی زبان اپنے ملک پر بھی احسان کیا۔ زندگی ہے تو آئندہ جو مقدمہ ترتیب دوں گا اس میں دل کھول کر احسان کرنے والوں کا شکریہ اور ترتیب و تالیف کی مصیبتوں کا کچا چٹھا لکھوں گا ع دربر دیم عذر ما بپذیر ؛ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

یہ بات میرے بیان کی محتاج نہیں ہے کہ کوئی بڑا کام چھیڑا جاتا ہے تو پہلے اس میں اکثر دقتیں پیش آتی ہیں۔ سیکڑوں کتابوں کے ورق الٹے اپنے پچھلے سرمایے سے جو سالہائے دراز کا ذخیرہ تھا مدد لی۔ لائق لوگوں سے مشورے لیے۔ خاص کمیٹی کر کے بحثیں کیں۔ ہزار ہا روپے خرچ ہوئے تب جا کر دو برس کی جانکاہی میں اس حصے کو مرتب کر پایا جس کو آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اسے ملاحظہ فرما کر اب بھی جو کوئی نیک صلاح دے گا میں ہرگز ہٹ دھرمی سے کام نہ لوں گا بلکہ شکریے کے ساتھ آئندہ حصوں کے لئے اس کو صرف آنکھوں کے سامنے نہیں بلکہ دماغ کے خزانے میں احتیاط سے رکھوں گا۔"

بہر حال ان کی ہر قسم کی نثر رنگینی ادب، شاعرانہ لطافت اور سلاست و فصاحت کا بیش بہا گنجینہ ہے۔ ان کی انشا پردازی کا کافی سرمایہ کتاب "خطوط منشی امیر احمد" مرتبہ

حضرت ثاقب میں شائع ہو چکا ہے۔

۷ اپریل ۱۹۰۱ء کو حضرت زاہد کو لکھتے ہیں "تم نے میری انشا پردازی کی ستائش کر کے اور مجھے شرمندہ کیا۔ شرمندگی کے ساتھ تمہاری قدردانی کا (جو محض محبت سے ہے) شکرگزار ہوں خطوط جب میں فکر سے اچھے لکھتا تھا وہ ذخیرہ ایک سو کئی جزو کا میرے ایک شاگرد نے جمع کیا تھا سولہا برس ہوئے کہ وہ بیچارہ مر گیا اور اُس ذخیرے کا پتا نہ لگا" (خطوط منشی امیر احمدؒ)

اُن کے خطوط میرے پاس بھی تھے مگر افسوس ہے کہ بار بار مکان سکونت کے تبدیل کرنے میں اسباب منتقل ہونے سے کئی خط گم ہو گئے۔ دو چار جو باقی رہ گئے ہیں وہ اس کتاب میں درج کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

پیارے ممتاز — خدا تمہاری عمر دراز کرے اور اقبال بڑھائے۔

لطیف کا ٹانڈہ پہنچنا ان کے کارڈ سے معلوم ہوا ہنچولی سے چلنے کا تار ابھی نہیں آیا۔ خدا خیر سے لائے۔ راہ میں مسافروں کی کثرت سے لطیف بہت دل تنگ رہا۔ گنگا کے نہان اور اجودھیا کے میلے سے ریل میں ہر جگہ کشاکش ہوتی ہے۔ سواریوں کا ساتھ لانا نازک کام ہے۔ تمہاری والدہ کو خدا تمہاری مہاجرت اشد ضروری پر صبر کی توفیق دے کہ مجھ دردمند پر رحم فرمائیں۔ مسعود میاں خط پاکر ایسے خوش ہیں کہ پھولے نہیں سماتے۔ مانکپوری بھائی بھی تمہاری یاد میں مسرور ہیں اور آنے کے دن گن رہے ہیں۔

۳ جزو ۴ ورق کاپیوں کے آئے اور مقابلہ ہو کر آئے ہیں اس پر بھی بے مبالغہ کئی سو غلطیاں ہیں اور یہ نقصان املا کا کہ "آنکھ" کو "آنکہ" اور "ساتھ" کو "ساتہ" اور "پھ" کو "پہ" وغیرہ وغیرہ ہزاروں جگہ لکھا ہے اس کا تدارک تو ہو نہیں سکتا ہے۔ ہائے مخلوط کا دو چشمی لکھنا کیسا یائے مجہول و معروف کے لکھنے میں بھی کہیں کہیں نقصان ہے۔ "ہے" کو کہیں نصف "ے" سے لکھا ہے کہیں معکوس ہے اور "سے" کو کہیں معکوس لکھا ہے کہیں یوں لکھا ہے "سی"۔ الغرض املا کے اعتبار سے امیر اللغات مطلق قابل التفات نہیں ہے ملامت نامہ جنگی لکھ بھیجا ہے مگر کیا ہوتا ہے۔ تمہاری صلاح ہو تو حسین الدین خاں کو اکبر آباد بھیج دوں تو آئندہ کچھ اصلاح ہو۔ دفتر کا ہرج بہت ہو گا نسخہ جو صاف ہوتا تھا وہ فقط نبی احمد خاں لکھتے ہیں ان کو کنٹھ مالے کا

روگ لگا ہوا ہے کل جونکیں لگائی ہیں نصف سے زیادہ ابھی یہ نسخہ لکھنے کو باقی ہے۔ کئی دن سے جلیل اور حسین کاپیاں صحیح کر رہے ہیں اور ابھی کئی دن یہی کام ہو گا پھر خوشنویس ضحاک کو بلوا کر مطبع کی سیاہی سے کاپیاں بنواؤں گا ورنہ مجھے یقین نہیں کہ وہاں سب مقام بنائے جائیں۔ جہاں زیادہ بنانا ہوگا ان مقامات کو وہاں بنانے پر چھوڑ دوں گا۔ ممتاز احمد کا حال بدستور ہے۔ محسن کی شادی ۲۴ ماہ ۶ بی یعنی ربیع الآخر کو قرار پائی ہے۔ ۲۵ کو رخصت ٹھہری ہے خدا راست لائے زیادہ سوا دعائے حفظ و امن و صحت و عافیت سے کیا لکھوں۔ تمھاری جدائی میں گھڑیاں پہاڑ دن ہو رہی ہیں کہ کاٹے نہیں کٹتی ہیں۔ مولوی نور اللہ صاحب کا کوروی کئی دن سے تشریف لائے ہیں۔ خورشید تسلیم رساں ہیں۔ ممن خیریت سے ہیں اپنے خط کا جواب انھوں نے شاید لکھا ہو۔ میلے کے قرب سے اُن پر اور بھی زیادہ محنت ہے۔ وہاں اور سب عزیزوں کو ماوجب۔

یکم دسمبر ۹۰ء آمیر فقیر

میاں ممتاز۔ کیا لاڑھے سیفو کی دکان لکھنؤ سے امیٹھی جاتے ہوئے راہ میں پڑی تھی کہ تم نکیلے نشتر بجلی سے چمکتے ہوئے خنجر ساتھ لے گئے ہو۔ ہائے ان چبھتے ہوئے فقروں نے کہ بحث ابھی طے نہیں ہوئی۔ جناب والد ماجد لکھنؤ سے تشریف نہیں لائے۔ افوہ ۲۰ دن رخصت کے رہ گئے وغیرہ وغیرہ دلوں کو چھان ڈالا۔ بارے شکر ہے کہ کہیں کہیں سے اس کی بو پائی جاتی ہے کہ ۲۰ دسمبر تک ضرور پہنچو گے اگر یہ تسکین نہ ہوتی تو دل چھلنی سے بدتر ہو جاتے اور ان کے سوراخوں سے خون دل حسرتوں کو لے کر ٹپکتا! اللہ تعالیٰ تم کو خیر سے جلد پہنچائے کہ یہ ہر وقت کے دھڑکے چند روزہ زیست کو آسائش سے بسر ہونے دیں۔ بیداد گر ستم ایجاد داد سے خدا نجات دے۔ اس ملک میں یہ مادہ بیشتر جلد جلد ترقی کرتا ہے اور تم کو جو کسی سواری پر ناہموار راہ میں مقدمے کی پیروی کو جانا پڑا تو مقامات ماؤف چھل گئے اللہ جلد تکلیف رفع کرے۔ میاں ممتاز پیارے ممتو میاں آبلوں کی تپک چھالوں کی جلن جس وقت تمھارے دشمنوں کو ایذا دے اس وقت یہ خیال ضرور کرو کہ تمھارے دوستوں کے دلوں میں تمھاری جدائی سے جو آبلے ہیں وہ کیسے تپکتے اور کیسے تڑپاتے ہوں گے۔ خدا پناہ میں رکھے۔ زیادہ سوا دعاؤں کے کیا لکھوں۔ اپنے آبا سے میری طرف سے بنا چنا کر ایسی میٹھی میٹھی باتیں کرو کہ وہ کڑوے گھونٹ تمھاری دوری

ہزوری کے بینا گوارا کریں۔ بیٹا تم آخر سفر تو کر دہی گے گھر میں بیٹھنے کی چیز تو تم کو خدا نے پیدا ہی نہیں کیا ہے پھر ان کو تمھاری مہاجرت گوارا کرنے سے چارہ نہیں البتہ یہ بات ہے کہ اور کہیں زیادہ کماؤ گے یہاں اس قدر نہ سہی۔ یہی سمجھو کہ اپنے ایک بوڑھے دعا گو کی دلسوزی کی۔ وہ دعا گو جو خود چراغ سحری ہے۔ فقط سب کو دعائیں سب کو سلام۔

(۳۔ دسمبر سنہ ۹۰ء) امیر فقیر

پیارے ممتاز

بحمد اللہ یہاں خیریت ہے۔ خدا کرے تمھاری طبیعت اچھی ہو۔ داد کے چھالوں میں آرام ہو۔ تمھارے زمانۂ رخصت کی گھڑیاں ایسی کٹھن ہو گئی ہیں کہ کٹتیں ہی نہیں۔ اس وقت بھی حساب کرتا ہوں تو پندرہ دن باقی ہیں خیر خدا مالک ہے دن بیقراری میں راتیں اختر شماری میں گزر ہی جائیں گی۔ اللہ خیریت رکھے آمین۔ وہاں سب عزیزوں کو ما وجب۔

امیر احمد عفی عنہ ۶/دسمبر سنہ ۹۰ء

پیارے ممتاز دعائیں لو۔

کئی دن سے تمھاری کوئی تحریر نہیں آئی جی لگا ہے خدا کرے خیریت ہو تمھارے وعدے کے موافق آج سے پانچ دن صدمۂ مفارقت سہنے کے رہ گئے ہیں۔ اللہ ان پہاڑوں کے کاٹنے کی بھی توفیق میرے دل کو دے اور خیر سے مواصلت کی گھڑی آئے۔ میں تمھاری وفا کے آسرے پر صابر ہوں اور تمھاری صداقت اور پابندی وضع مجکو تسکین دے رہی ہے۔ زیادہ اس باب میں کیا لکھوں تمھارے ماموں وغیرہ سب اچھے ہیں۔ میلا ہو رہا ہے مجھ پر ایک قصیدے کی فرمائش ہوئی اور ہر چند اعراض کیا گیا مگر مفر نہ ہوا مجبور ہو کر کہنا پڑا جھگڑے اس میں فرمائشی جناب ڈپٹی صاحب[1] کے بہت تھے مگر بحمد اللہ کہ سب موزوں ہو گئے اور بعد نماز جمعہ کئی ہزار آدمیوں کے مجمع میں محمد احمد سے پڑھوایا گیا اور معزز ارباب کونسل خصوصاً وائس[2] پریسیڈنٹ بہادر نے بہت ستایش کی اور بندگان حضور پر نور دام ملکہم و اقبالہم نے بھی توجہ سے سماعت فرما کر بہت سمجھ کر اکثر اشعار کی داد دی اور قصیدہ لے کر جیب میں رکھ لیا اور اب روز اس کا چرچا

---

[1] سید علی حسن خاں مبر مال [2] جنرل اعظم الدین خاں۔

ہوتا ہے اور جو ملتا ہے اس سے بہ نیکوئی اس کا ذکر فرماتے ہیں۔ بتر شعر ہیں مختصر ہوتا تو بھیج دیتا خیر دیکھ لینا شاعری تو اس میں بہت کم ہے مگر مطالب خوبصورتی سے موزوں ہیں اور مقبولیت منجانب اللہ ہے۔

جلیل الف مقصورہ لکھ رہے ہیں مگر تنہا ہیں جلد کیونکر ہو اللہ تم کو جلد لائے تاکہ تلافی مافات ہو جائے۔ فقط

آمیر فقیر ۱۴؍ دسمبر ۱۹۹۰ء

۴؍ جنوری ۱۹۹۳ء

پیارے ممتاز دونوں جہاں میں ممتاز رہو۔

کئی دن سے میں نے بھی کچھ نہیں لکھا اور تمھاری بھی کوئی تحریر نہیں آئی۔ حالات یہاں کے بدستور ہیں۔ حافظ صاحب[1] باتفاق رائے عزیزان علاج کے لئے دلی جانے پر آمادہ ہوگئے تھے مگر ابر و باد اور کئی دن سے تقاطر امطار علت توقف ہے۔ واقعی ایسے مریض کا ایسی حالت میں سفر کرنا مرض کو اور بڑھانا ہے۔ چار دن سے سید عبد اللہ صاحب ڈاکٹر کا علاج ہو رہا ہے کھانسی کے تعدد میں تو ابھی کمی نہیں ہے مگر کھانسی کی حالت میں جو درد سے تکلیف ہوتی تھی وہ بعنایت الہٰی بالکل زائل ہے۔ خدا سے امید ہے کہ یہیں آرام ہو جائے اور تکلیف سفر کی نوبت نہ آئے۔

ممتاز احمد کا زخم رو بہ بہی ہے مگر ابھی کھٹولی ہی پر چوکی تک جاتے ہیں۔ میاں لطیف گاؤں سے آگئے ہیں البتہ زکام سے اُن کو بھی نجات نہیں بہت دن ہو گئے ہیں علاج و پرہیز سے بھی کچھ نفع نہیں ہوا۔ سب ماوجب گزار ہیں۔

فقیر آمیر

ممتاز میاں — جدائی کے دن پہاڑ تو ہوتے ہی ہیں مگر سردی کی شدت نے دلوں کو سرد کر کے ان کو برف کا پہاڑ بنا دیا ہے کہ کسی طرح کاٹے نہیں کٹتے اللہ تم کو لائے تو کوہکن کا رنگ جمے تمھارے حالات کا تصور اور افسردہ کر رہا ہے خدا تم کو شگفتہ کرے

---

[1] حافظ شاہ محمود علی فدا مرحوم۔

تو ہم پژمردہ دلوں کا غنچۂ خاطر بھی کھلے۔ میاں ممتاز۔ میر مومن حسین صفی نے گلچیں میں ایسے اچھوتے مضامین کی غزل کہی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی بندشیں صاف ہیں اور کوئی مضمون ٹکسال باہر نہیں یہ بیدلی شاعری کا زندہ کرنے والا نیا شاعر نکلا کیا فیضان الٰہی ہے۔ انھوں نے خود بھی گلبن نام ایک گلدستے کا اشتہار آگرے سے دیا ہے اور اس میں تمھارے اور پیارے جلیل کے پھولنے پھلنے کو کیا اچھی طرح کی ہے ۔ شوخی کا کچھ لگاؤ تمھاری حیا میں تھا۔ حیا قافیہ ہے۔ خدا تمھیں اطمینان دے تو رنگ جما دو بلکہ رنگ اڑا دو۔ جلیل نے خدا جانے گلچین و گلبن کے واسطے کیا کیا گل کھلائے ہوں گے مگر اس چمن کے پھولوں کی بو تو پھوٹتی نہیں۔ معلوم نہیں کتنے پھول کھلے۔ مسعود و عاقبت محمود بکمال شوق تسلیم رساں ہیں۔ سب عزیزوں کو ما وجب۔

فقیر امیر بقلم خود

عزیز از جان ممتاز عمر دراز تمھاری طبیعت کیسی ہے اب تپ تو نہیں آتی؟ خدا کرے جاتی رہی ہو۔ تمھارا حال ہم کس سے پوچھیں تم نے تو ہم سے بولنا ہی چھوڑ دیا اور سمجھ لیا کہ

ع ہم بات کے قابل نہ ملاقات کے قابل۔ تم جو چاہو سمجھو جو چاہو کہو۔ ہم تو تم کو وہی آنکھوں کا تارا ممتاز اور جان سے پیارا ممتاز کہتے اور سمجھتے رہیں گے اور جب تک جئیں گے تمھاری خیر منائیں گے ۔

مار ڈالا جو ہمیں تم نے بہت خوب کیا
تم کو جی جان سے اللہ سلامت رکھے

میں نے جو تم کو یہاں آنے کے لئے لکھا اسی کی تم نے سزا دی کہ اب تک جواب نہ دیا۔ اس سے اگر یہ مقصود ہو کہ میں مایوس ہو کر تمھارے ملنے سے صبر کر لوں اور اب اس باب میں کچھ کہوں سنوں نہیں تو یہ مجھ سے اور میرے دل سے دشوار بلکہ محال ہے۔ یہ جبھی ہو سکتا جب مجھے بھی تمھارا سا دل ملا ہوتا تم نے جو تیل کی طلب میں کارڈ لکھا وہ ایسا خشک اور روکھا تھا کہ کہیں سے اس کی بو نہ پائی گئی کہ تم وہی ممتاز ہو جو یہاں مدتوں رہے ہو اور میری طبیعت سے آگاہ ہو اور کوئی ہوتا تو اس جگہ کچھ کہتا مگر میں یہی کہتا ہوں کہ ہرچہ از دوست میرسد نیکو ست۔ ممتاز تم کو اپنی بے رحمی کی قسم اب تو رحم کرو اپنی طبیعت کا حال لکھو میری سب باتوں کا

جواب دو بہت نہ ستاؤ بہت نہ تڑپاؤ۔ سنو تم سے کوئی کہہ رہا ہے ؎ آگ کعبے میں لگاتا ہے یہ کیا کرتا ہے؛ توبہ کر توبہ کر او دل کے جلانے والے۔ تمھارے دیدار کے بھوکے فقیر تمھاری عافیت و صحت کے لئے رات دن دست بدعا ہیں مناسب نہیں کہ ان کو ناخوش کرو۔ اللہ تعالےٰ تم کو خوش رکھے تمھارا بھلا کرے تم اکثر خواب میں نظر آتے ہو۔ جلیل تم سے کہتے ہیں کہ یہ ملنا ٹھیک نہیں ہے ؎ کہد تصویر خیالی بھی چھپے؛ لطف کیا تم نے اگر پردا کیا۔

تم نے اگر میری سنی ہوتی تو کچھ اور کہتا اب دعائیں لو اور خدا کے لئے جواب دو۔

جلیل کا سلام شکایت انضمام عافیت انجام قبول کرو۔

امیر فقیر ۲۳ دسمبر ۹۴ء

رام پور

۳ جولائی ۹۵ء

سرمایۂ ناز پیارے ممتاز عمر دراز ہو نامۂ محبت طراز آیا اور مجھے تمھارا شکر گزار بنایا۔ منتظر آنکھوں کی حسرت نکلی دل سے دعا نکلی ؎ تم سلامت رہو ہزار برس۔ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار۔ مجھے دیر سے تمھارے حال کی جستجو تھی۔ خط کا انتظار تھا بیقرار تھا۔ شکر ہے کہ ادراک خیریت سے تسکین ہوگئی۔ میری طرف سے اگر کوتاہ قلمی ہوئی تو بہت ہی مجبوری سے ہوئی۔ دمل کا حال تم سن ہی چکے ہو اب تک اس سے نجات نہیں ہے کسی قدر خشکی پر آچلا تھا مگر ایک کنارہ اس کا پھر پک گیا جس سے پھر پلٹس کے استعمال کی حاجت ہوئی بستر معذوری پر پڑے پڑے دم گھبرا گیا خدا کرے جلد آرام ہو جائے تو میں اپنے پیارے عزیزوں کو دوستوں کو خط لکھوں اور لکھواؤں مافات کی تلافی کروں۔

لطیف احمد اچھے نہیں ہیں اور ممتاز کا بھی زخم کی خرابی سے حال خراب ہے۔

مسعود احمد کو دو تین روز تپ رہی اب اللہ کا فضل ہے بہر حال اطمینان خاطر مفقود ہے۔ کیا کیا جائے مشیت الٰہی یہی ہے۔ شکر کرنے کے سوا چارہ نہیں۔ اب جلیل آگئے ہیں۔ امید ہے کہ تم کو میرے حال سے جلد جلد آگہی ہوا کرے گی مگر شرط یہ ہے کہ تم بھی اپنی خیریت اور عافیت سے مجھے جلد جلد مسرور کرتے رہو۔ قرۃ العین محسن حسین سلمہ رات بارہ بجے

یہاں پہنچے بحمد اللہ کہ راہ بھر خیریت رہی اور یہاں بھی مع الخیر والعافیتہ ہیں۔ چار پانچ روز رہیں گے ساتویں کو انھیں اپنے کالج میں پہنچنا چاہیے۔

بہت ہی خوشی اور شکر گزاری کی بات ہے کہ تم کو اپنے امیر اللغات کا خیال باقی ہے وہ بھی تو تم کو نہیں بھولا معلوم ہوتا ہے کہ تمھاری قابلیت و لیاقت سے ابھی کچھ اور نفع اٹھانا اس کی قسمت میں لکھا ہے۔ تم اپنے لکھنے کے موافق فرصت کا اندازہ کرکے وقت نکالو اور مجھے آگاہ کرو۔ میرے خیال میں تقدیم اسی کام کو ہونا چاہیے کہ تیسرا حصہ جو مکمل ہے تم ایک نظر اس کو دیکھ جاؤ۔ مسودہ اس کا جس میں تغیر و تبدل اچھی طرح ہوا ہے تمھارے پاس بھیجد یا جاسکتا ہے۔ ہمارے تمھارے درمیان میں جو فاصلہ بعد القطبین کا ہے وہ اس بات کا ضرور مانع ہے کہ تم کو اس حصے میں جو جو شبہات پیدا ہوں ان کا انفصال جلد ہو جائے اور ضرور ہے کہ بیسیوں جگہ رائے مخالفت کرے گی جس کا جواب دینے والا تمھارے پاس کوئی نہ ہوگا مگر تاہم تمھارا دیکھ جانا فائدے سے خالی نہ ہوگا اس کے بعد خدا نے چاہا تو آئندہ کے حروف کے لکھنے کا مسالا بھیجنے کا حتی الامکان سامان کیا جائے گا۔ اس میں بھی ہزاروں جھگڑے ہیں کتابیں جو پیش نظر رہتی ہیں معہذا کل دواوین وغیرہ کا یکجائی استقرا مع اشعار و فقرات تمھارے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ خیر جب اس کا وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ بہر حال تم لغت کا حال مجھ سے کہیں زیادہ اور اچھا جانتے ہو تمھیں اس باب میں کچھ لکھنا یا بتانا عبث ہے تمھارے ہی ہاتھ کا کیا ہوا کام ہے اور تمھیں اس کے بانی مبانی ہو۔ خدا کرے تم کو فرصت کا وقت (لہ) اور یہ بھی دعا ہے کہ جتنا وقت تم کو ملے وہ شاعری کی نذر نہ ہو جائے۔

تمھارے سوالات کے جوابات لکھوا دئے ہیں۔ دیکھو اور کہیں کہیں کچھ شبہہ ہو تو پھر لکھو۔ امیر اللغات کے دونوں چھپے ہوے حصے حسب طلب روانہ کیے جاتے ہیں۔ سب تم کو دعائیں دیتے ہیں سلام کہتے ہیں اور بہت یاد کرتے ہیں۔ تمھارا کارڈ بھی پہنچکر سرور موفور کا باعث ہوا۔

داعی خیر۔ امیر فقیر عفی عنہ

لہ اس کے بعد کاغذ (بوسیدہ ہو جانے سے) کا ٹکڑا لفظوں کو لے کر اڑ گیا۔

نثر فارسی کا نمونہ بھی "نگارستان سخن" سے میں نے نقل کر دیا ہے۔ ان کی اور کوئی فارسی کی نثر مجھے نہیں ملی۔ خلد آشیاں کا عہد تھا ہم لوگ شیخ فرید الزماں مرحوم کے مکان پر بیٹھے تھے۔ منشی صاحب[7] سہ پہر کے دربار سے اسی طرف تشریف لائے ایک بند اردلی کا غذ کا ہاتھ میں تھا اس کو پڑھتے جاتے تھے۔ منشی محمد احمد صاحب نے پوچھا "ابا جان یہ کیا ہے؟" بولے "دیوان فارسی سے متعلق آغا نثار صاحب سے میرزا لسان الملک کو خط لکھوایا ہے اور اب مجھ سے اصرار ہے کہ تم اسے دیکھ کر میرے منشاء کے موافق اس کی عبارت چست و درست کر دو۔" اس سے ان کی نثر فارسی کی شان کا بھی پتا چلتا ہے۔

منشی صاحب[7] بہت خوشخط تھے اور اپنے استاد کی طرح کاغذ ہاتھ میں لے کر لکھا کرتے تھے۔ غالباً اگلا طریقہ ہی یہ تھا۔ ایک خط کا عکس نذر ناظرین ہے۔



عکس تحریر امیر مینائی

۷۸۶

۱۶ - دسمبر ۹۰ع

عمر دراز

پیاری شمسا تم دو دنیا کی سرفراز رہو

دعا ہو چکی، دعا یہ ہے کہ سعادت نامہ محبت شمامہ آیا، سرور دیا، تمہاری بہن جو دکن سے آئی ہیں ان کا مزاج بخیر ہو کہ

اب مہینا کی بحال ہیں۔ محسن زمانی کی شادی ہو گئی۔ حافظ جی معہ اہل و عیال بخیریت ہیں۔ میرا دودھ نہ برہ گیا ہم

وہاں جا کر آرام سے ہیں۔ مثنوی میں تمہارے اس خط میں نہیں کی ہے حال کا دل آ اور شعر بھی لکھنا کہ سرور ہو تا حین ۲ دسمبر کو

کام چلی ہے جو بھی ہے سر تا یہ شکر ہے خدا کا اور اتنا نہیں کہ حال ہو وہاں سے چلے گی نہ ہو۔ حسینہ سلمہ بہ کل سخت علالت سے رنجیدہ

رہیں تیری ہوئی خدا فرودہ صحت دی خواہ سنواری۔ اللطافت اور اقبال مزیان کوئی حال نہیں لکھا۔ تم اور اعلوم بسا ہیں گو

یاد ہی کی ہو۔ یہاں سب خیریت ہے۔ وہاں عزیز دلنواز تمام یہاں سب کی طرف سے دعا و سلام اور والدین باجدین کو

میرا سلام نیاز کہو۔ فقط خلیل احمد خان و عبدالرزاق خان و نبی احمد خان و اختر سب اچھے ہیں۔ دعا

عزیزہ جان خانم کو دعا اور نیم جنوں بابا کی بوسی امیر فقیر یا شکر کہو زیادہ کیا لکھوں

٨٦

قطعۂ تاریخ سال اشاعت "سیرت امیر احمد امیر مینائیؒ"

از نتیجۂ فکر

جناب حکیم محمد افتخار علی خاں صاحب جگر صدیقی وارثی بسوانی

تلمیذ رشید حضرت امیر مینائیؒ

جو ممتاز علی آہ سخنور کامل فن تھے — خدا نے دی تھی کیا طبع رسا اور طبع میں جودت
امیر بادشاہ ملک معنی سے تلمذ تھا — رہے ہمراہ برسوں کی بہت استاد کی خدمت
یہ ہمت یادگار وقت ہے جو آپ نے کی تھی — کہ لکھی دلفریب انداز سے استاد کی سیرت
معطر یہ گلستاں نکہت معنی سے کیسا ہے — مضامیں کے چمن میں خوشنما پھولوں کی ہے رنگت
جو عہد حضرت کلب علی خاں میں نظر آئے — رقم ہیں واقعات چشم دید اکثر بصد زینت
بڑی خوبی سے حالات حیات استاد کے لکھے — عیاں رنگ صداقت اُن سے ہے رنگینی فطرت
وہ جلسے بارگاہ حضرت نواب والا کے — ہجوم اہل سخن کا سب کی وہ دربار میں عزت
امیر ملک معنی کی بہت ہم طرح غزلیں ہیں — جلال و داغ کی بھی خوشنوائی رونق صحبت
وہ ہر اک قافیے کو اپنے اپنے رنگ میں کہنا — فصاحت کی وہ رنگینی بلاغت جس میں پرشوکت
کلام ان ماہران فن کا یکجا جمع کر دینا — ہے گویا گلستاں بیخزاں جاں بخش ہے نکہت
امیر و داغ بھی گزرے جلال لکھنوی گزرے — ہوئے وہ ختم جلسے منتشر بکھری ہوئی صحبت
یہ استادان فن سب سو چکے جاکر مزاروں میں — مگر ان کا کلام دلربا ہے دہر کی زینت
وہ نہاں ہیں مزاروں میں وہ خوش ہیں باغ رضواں میں — کرے گی یاد تازہ انکی شائع ہو کے یہ سیرت
یہاں جام فنا پینا ہے ہر انسان کو آکر — فنا کے بعد بھی رکھے گی زندہ شعر کی شہرت
امیر نامور جو بادشاہ دور آخر تھے — نہ چھوڑی آپ نے ملک سخن کی ایک بھی صنعت
قصاید بھی غزل بھی نعت بھی حمد الٰہی بھی — جدھر دیکھو اُدھر رنگینی مضموں کی ہے کثرت
لغت کے کام میں سکرٹیری ہونا مصنف کا — وہ استاد گرانمایہ کی سوتے جاگتے خدمت

کلام استاد کا اپنے کیا ہے انتخاب ایسا
کہ دل تڑپانے والی جسکے ہے ہر شعر میں قدرت

نظر جس صفحے پر پڑتی ہے گویا کوئی کہتا ہے
کرشمہ دامن دل میکشد انجاست جا بحضرت

گئے ارمان دل میں لیکے وہ اسکی اشاعت کا
مصنف کے نہ دور زندگی میں چھپ سکی سیرت

گران کے پسر جو شاہ عبدالباری صاحب ہیں
انھوں نے اسکو چھپوایا بصد ذوق بصد زینت

دعا ہے یہ ہماری اے خدائے پاک و بے ہمتا
یہ ہو مقبول عالم اسکی ہر اک دلمیں ہو عزت

اسے آنکھوں میں تل کیطرح سے دے جگہ عالم
مقام اسکو ملے ہر ایک دلمیں یہ بنے حسرت

زمانے میں کیا پھر اسنے زندہ مرنے والوں کو
زمانے میں ہوئی پھر رفتگاں پاک کی شہرت

نئے سرے جگر پھر دور مینائی ہوا زندہ
امیر ماہر آداب فن کی جب چھپی سیرت

۱۳۶۰ھ

مادہ ہائے تاریخ طبع از شاہ محمد عبدالباری عشق خلف مؤلف

سیرت امیر احمد امیر مینائی از آہ

۱۳۶۰ھ

ولہٗ

کھینچدی آہ نے الفاظ میں تصویر امیرؒ
چار سو پھیلے گی اب خوب ہی تنویر امیرؒ

آئنہ ان کے صفات اور کمالات کا ہے
ہے بجا اس کو کہا جائے جو تفسیر امیرؒ

کلک ممتاز نے کھینچا ہے عقیدت سے اسے
کیوں نہ پھر سب سے ہو ممتاز یہ تصویر امیرؒ

زیور طبع سے آراستہ سب عشق ہوئیں
شکل نورانی بھی اور سیرت و تحریر امیرؒ

کھل گئیں آنکھیں یہی طبع کی تاریخ ہوئی
نگہ افروز ہوئی آج جو تصویر امیرؒ

۱۳۶۰ھ

